

سال نو مبارک

ماہنامہ اور روزناموں کے لیے ایڈیٹریل سروسز فراہم کرنے والی کمپنی

# رکنا جامعہ

JANUARY  
2015



WWW.PAKSOCIETY.COM

ماڈل: نیہا

میک اپ: ہروز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی: موسیٰ رضا



## افسانے

## سلسلے وار ناول

تجھ سے مانگوں میں تجھ کو شازیہ مصطفیٰ عمران  
جو عشق میں ہی وہ عشق ہی جانے نائلہ طارق ۷۸  
تیرے پیار کی خوشبو قمرش شہک ۱۲۶

## مکمل ناول

ایک تھی ساحرہ فاطمہ خان ۲۴  
مشرق کی شہزادی روشانہ عبدالقیوم ۱۷۴

## ناولٹ

اکتھار محبت سلیمی غزل ۳۴

جنوری 2015ء

جلد نمبر 20 شمارہ نمبر 1

قیمت 60 روپے

زرد گالانہ بیدار یقین رجسٹری

720 روپے

34535726

پبلشر ڈاٹیر صالحہ محمود نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔  
مقام اشاعت: ۱۲۹/ڈی بلاک 2۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی، کراچی

انتباہ:-

ماہنامہ "زرد گالانہ" میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی۔ وی چینل یا ڈرامہ، ڈراما، ٹیلی ویژن اور سٹیج ڈراما کی بھی ادول کی اشاعت پر ادارہ چوری کی ایف۔ ٹی آر روٹ کرادے گا اس کے پبلشر سے اجازت لینا ضروری ہے جہاں "زرد گالانہ" چھپتا ہے۔

## مستقل سلسلے

۲۰۸	صالیہ محمود	۷	سندھ لے	۷	صالیہ محمود	روائے جنت
۲۲۰	ادارہ	۱۹۳	گوشہ چشم	۱۹۳	صدق سعد	ردا کی ڈائری
۲۲۱	شریہ اقبال	۲۰۲	کچن	۲۰۲	شہلا مشائق	ذرا پھر سے کہنا
۲۲۵	شہلا مشائق	۱۹۹	سنگھار	۱۹۹	نورین ملک	خوشبو
۱۹۵	نورین ملک	۱۹۶	اشعار	۱۹۶	نورین ملک	اس ماہ میں
۲۱۶	عائشہ احمد		دوستوں کے نام پیغام			

وکی لائبریری کی ایڈیٹر شریہ اقبال  
سائڈ سسٹم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے  
۲۰ اور پرانے ڈائجسٹوں کی خرید و فروخت کی جالی ہے  
دکان نمبر 13 صدر بازار ہری پور



آہستہ آہستہ کرتے تھے۔ ایک راوی کے مطابق ”نبی اکرم اتنا ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے کہ ان کے ہر لفظ کا ایک ایک حرف بہ آسانی گنا جا سکتا تھا۔ چونکہ رسول اکرم کے وہن سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون تھا لہذا وہ چاہتے تھے کہ آپ جو کچھ فرمائیں سننے والے اسے اچھی طرح سمجھ لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سادہ اور شستہ زبان استعمال کرتے تھے۔ خواہ کسی ایک فرد سے مخاطب ہوں یا مسلمانوں کے اجتماع سے خطاب فرما رہے ہوں۔ آپ کا طرز تکلم ہر طرح کے تصنع سے پاک تھا۔

رسول اکرم ننھے بچوں سے بہت پیار کرتے تھے اور جہاں کہیں بھی بچوں کو دیکھتے خوش ہو جاتے۔ بچوں کو ہنسانے کے لیے ان سے مذاق بھی فرماتے۔ فطری طور پر وہ اپنے نواسوں حضرت حسن اور حضرت حسین سے بہت محبت فرماتے تھے۔ بسا اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے دوران بھی ان میں سے ایک کو پازوؤں میں اٹھا لیتے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں جاتے تو نواسے کو پاس کھڑا کر لیتے اور سجدے سے اٹھ کر پھر گود میں لے لیتے۔ جب دونوں بچے ذرا سیانے ہوئے تو وہ مسجد نبوی میں ادھر ادھر دوڑتے پھرتے۔ نماز باجماعت کے دوران کبھی کبھی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کا رشتہ زندگی کے ہر شعبہ سے قائم ہے۔ وہ انسان کی روحانی اور دنیاوی زندگی کے بھی معلم ہیں۔ اسی لیے اسلام کے پیروکاروں کی زندگی اور ذاتی رویے پر دین اسلام کے اثرات دوسرے مذاہب کی نسبت زیادہ گہرے ہیں۔

مختلف روایات میں آپ کی عادات و خصائل کا تفصیل سے ذکر آیا ہے۔ ان روایات کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سراپا سادگی تھے۔ اپنے جوتوں کی خود مرمت کرتے۔ اپنی بکریوں کا دودھ دودھ لیتے۔ اور اس کام کے لیے اپنے خادم کو بھی تکلیف دینا گوارا نہ فرماتے۔ آپ کے خادم خاص حضرت انس روایت کرتے ہیں۔ ”میں نے دس سال رسول اکرم کی خدمت اقدس میں گزارے۔ انہوں نے مجھ سے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا یا کیوں کیا ہے۔ وہ ہمیشہ مجھ سے نہایت شفقت فرماتے تھے۔“

آپ جسم اور لباس کی طہارت و صفائی کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ حضور اکرم تیز رفتار تھے حتیٰ کہ ان کے صحابہ کو ان کے ساتھ قدم ملانے میں دقت پیش آتی تھی۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو

تمہارے خون سے روشن رہیں گی  
شب تاریک میں اس شہر کی گلیاں  
اے شہر پشاور!  
تیری گود میں ہیں ماؤں کے وہ لخت جگر  
جو کتب میں شب کی تاریکی میں نہیں  
دن کے اجالے میں مارے گئے  
جن کی آنکھوں کے رتن چور ہوئے  
جن کے جسم سرخ غازے سے رنگین ہوئے  
اپنے بیڑہن میں وہ نطفہ جو خاک ہوئے  
وہ گھر کے گلاب تھے  
اپنے ہی گھر کے صحن میں مڑ جھاگے  
مسے ہوئے پھولوں کی طرح  
مڑ جھائے ہوئے پھولوں کی طرح  
ارواح شہداء کی مہک  
تر و تازہ ہے ابھی تک  
غم و غصے میں ہے یہ قوم بہت  
تمہارے خون کا قرض ابھی باقی ہے  
برسوں نہ بدل سکے گا لہو اس سر زمین سے  
اٹھے تو ہیں مگر بہت دیر سے اٹھے  
اب سینہ پر ہیں غازی تیرے وطن کے  
لہو کا تمہارے حساب ہوگا

صالو محمود

16 دسمبر

ہم اداس ہیں شہر پشاور تیرے لیے

پھولوں کے شہر میں پھولوں کی ہے تدفین  
سے سوگ کا عالم  
ہر آنکھ اشکبار ہوئی  
پھولوں کے شہر میں پھولوں کے جنازے  
وہ جو حصول علم میں لہو رنگ ہو گئے  
شمعیں روشن ہیں  
ہزاروں خوش رنگ پھولوں پر  
خوشبو پھیلی ہے جواں خون کی  
کراچی سے خیبر تک اضمحلال طاری ہے  
اک سانحہ جو ہمیں دو لخت کر گیا  
ایک سانحہ جو ہمیں یکجا کر گیا  
اس دکھ پر قلم بے معنی سا ہوا  
کوئی وقت کوئی حیثیت نہیں لفظوں کی  
16 دسمبر میں جو سانحہ گزرا  
سردراتوں میں مہکتی ہے  
ان کے خون کی خوشبو  
غنچے تھے میرے شہر کے  
جو مڑ جھاگے گل صبح  
تیرگی ہی تیرگی ہے ہر سمت ہے اداسی  
گلاب چہرے تھے جو خوں نہا گئے

ٹانگوں میں سے گزر جاتے اور رسول اکرمؐ انہیں کچھ نہ کہتے۔

آپؐ ہر ایک سے مشفقانہ برتاؤ فرماتے۔ حتیٰ کہ معر خواتین ان سے لمبی لمبی بے سرو پابا تیں بھی کرتیں مگر آپؐ کوئی اکٹا ہٹ محسوس نہ کرتے۔ یہ خواتین انہیں بازو سے پکڑ کر ٹھہراتیں اور رسول اکرمؐ نہایت توجہ سے ان کی باتیں سنتے اور اپنا بازو بھی نہ چھڑاتے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم بنتے بولتے، بیٹھے رہتے لیکن جب کوئی دینی بات ہوتی یا نماز کا وقت آجاتا تو ایسا مظلوم ہوتا کہ آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم وہ ہیں ہی نہیں۔ کھانے پینے میں ازواج مطہرات کو کوئی روک ٹوک نہیں تھی جو چاہتیں کھاتیں جو چاہتی پہنتیں۔ ہر چند عسرت کی وجہ سے اچھا کھانا میسر نہ تھا۔ سونے، چاندی کے زیورات پسند نہ فرماتے۔ اس زمانے میں ہاتھی دانت کے زیور کارواج تھا آپؐ اس قسم کے زیور پہننے کا حکم دیتے۔ گھر میں داخل ہوتے تو نہایت خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے اندر تشریف لاتے تھے۔ بیویوں پر کبھی لسن طعن نہ فرماتے نہ درشت اور سخت لہجے میں گفتگو فرماتے اگر کوئی بات ناگوار خاطر ہوتی تو التفات میں کمی کر دیتے۔

آپؐ کی گھریلو زندگی ان تمام کیفیات سے معمور اور پر رونق تھی جس سے انسانی زندگی معمور ہوتی ہے۔ آپؐ کی گھریلو زندگی میں وہ تمام پہلو موجود تھے جو خوشی اور غم کے پہلو ہوتے ہیں۔ آپؐ اپنی ازواج پر حد درجہ شفقت فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ان کی دلداری کے خیال سے اپنی پسندیدہ چیز کھانا چھوڑ دیتے۔ آپؐ ازواج مطہرات پر حد درجہ اعتماد فرماتے تھے۔

ان کو اپنے رازوں میں شریک کرتے۔ بیوی بچوں کو سرزنش فرماتے ہوئے یہ انداز اختیار کرتے کہ مخاطب بات بھی سمجھ لے اور ان کی عزت نفس بھی مجروح نہ ہو۔ ازواج مطہرات کبھی کبھی خود حضور اکرمؐ کے مقابل میں بھی اپنی خودداری کا اظہار کرتی تھیں اور آپؐ اسے پسند فرماتے تھے۔ بشرطیکہ وہ جائز حد میں ہو۔ آپؐ کی خانگی زندگی بے رنگ و بو تھی۔ زادالعاد میں ابن قیم لکھتے ہیں۔ ”نبی اکرمؐ اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ نہایت محبت اور حسن سلوک کا معاملہ کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کے پاس انصار کی لڑکیاں جمع ہو جاتیں اور آپؐ ان کو ان لڑکیوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے چھوڑ دیتے۔ اگر وہ کسی ایسی بات کی خواہش کرتیں جس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہوتی تو آپؐ ان کی خواہش پوری کر دیتے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے اچھا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے لیے ہادی مرشد اور پیغمبر کی حیثیت سے بھیجا تھا۔ اسی طرح آپؐ کی ازواج کا درجہ بھی تمام امت کے مردوں اور عورتوں کے لیے امہات کا رکھا۔ تاکہ سب لوگ ان کو اپنے لیے نمونہ سمجھیں اور ان سے زندگی کے وہ طریقے سیکھیں جو ان کو نبی اکرمؐ سے معلوم ہوئے۔ جس طرح ان تعلیمات فرآنی پر سب سے زیادہ اہتمام سے خود نبیؐ عمل فرماتے تھے اسی طرح ازواج مطہرات اور اہل بیت نبوت پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ وہ اپنے گھر سے پھیلنے والے چشمہ نور سے پہلے خود اچھی طرح منور ہوں۔ پھر اس روشنی سے دوسروں کو منور کریں۔ اندر اور باہر دونوں جگہ

کامل یکسانیت تھی۔ جس اعلیٰ مقصد کے لیے حضور اکرمؐ نے اپنے دن اور رات ایک کر رکھے تھے اسی مقصد میں آپؐ کی ازواج بھی دل و جان سے منہمک تھیں۔

آپؐ کی ازواج مطہرات کا مرتبہ اللہ تعالیٰ نے جتنا اونچا بنایا تھا اسی اعتبار سے ان کی ذمہ داریاں بھی زیادہ تھیں۔ دوسروں کے مقابلہ میں ان کا اجر بھی دگنا تھا اور جرم پر سزا بھی دگنی تھی۔ سورہ احزاب میں آیات نمبر 30-31 میں ارشاد ربانی ہے۔ ”اے پیغمبر کی بیویو! جو تم میں سے کھلی ہوئی برائی کی مرتکب ہوگی تو اس کو دہری سزا سنا دی جائے گی اور یہ اللہ کے لیے اہل بات ہے اور جو تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتی رہیں گی اور بھلے کام کرتی رہیں گی ہم ان کا اجر بھی دہرا دیں گے اور ان کے لیے ہم نے رزق کریم تیار کر رکھا ہے۔“

آپؐ ازواج مطہرات کی ان ذمہ داریوں کے احساس سے ہمیشہ گراں بار رہتے تھے اور ان کو آخرت کی کامیابی کا احساس دلاتے رہتے تھے۔ آپؐ نے اپنی گھریلو زندگی میں عورت کو عزت و تکریم کے اعلیٰ مراتب سے ہمکنار کیا۔ آپؐ نے بیویوں کی محبت اور احترام کی بار بار تاکید فرمائی۔

آپؐ نے فرمایا۔ ”تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو اپنی بیویوں سے بہتر سلوک کرتے ہیں۔“ ایک اور جگہ آپؐ نے فرمایا۔ ”ایک مسلمان اپنی بیوی کے حق میں جتنا رحم دل اور مہذب ہوگا اتنا ہی وہ اپنے ایمان میں کامل ہوگا۔“ خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا۔ ”اپنی بیویوں سے شفقت اور محبت کا سلوک کرو۔ تم نے اللہ کی عنایت پر ان کو اپنے لیے حلال کیا ہے۔ ان کے

معاملہ میں اللہ سے ڈرو اور ان سے بہتر سلوک کرو۔“ بیٹیوں سے ترجیحی سلوک کی ہدایت فرمائی۔ ”جب تم اپنے بچوں میں تقسیم کرنے کے لیے کچھ لاؤ تو بیٹیوں سے شروع کرو کیونکہ بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیاں اپنے والدین سے زیادہ محبت کرتی ہیں۔“

آپؐ اپنی ازواج مطہرات کے حقوق کی ادائیگی میں پوری مساوات و عدل ملحوظ رکھتے تھے۔ مگر حضرت عائشہؓ سے بہت محبت فرماتے تھے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے۔ ”یا اللہ جس کا مجھے اختیار ہے اس کی تقسیم تو میں نے مساوی طور پر کر دی لیکن جو بات میرے بس میں نہیں ہے اس پر مجھے ملامت نہ کیجئے گا۔“ آپؐ کے ازدواجی تعلقات حسن معاشرت اور اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ برتاؤ اور رویے میں مساوات کا خیال رکھتے۔ جب آپؐ سفر کا ارادہ کرتے تو ازواج مطہرات کے درمیان قرعہ ڈالتے۔ جس کا نام نکل آتا وہی ہم سفر ہوتیں۔ کسی کو کوئی عذر نہ ہوتا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ باری کی اتنی پابندی فرماتے کہ کبھی ہم میں کسی کو کسی پر ترجیح نہ دیتے۔ اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا کہ آپؐ سب ازواج مطہرات کے یہاں روزانہ تشریف نہ لے گئے ہوں۔ بعض اوقات ازواج مطہرات ادھر ادھر کے قصبے یا گزرے ہوئے واقعات بیان کرتیں تو آپؐ برابر سنتے رہتے۔ اور خود بھی کبھی اپنے گزشتہ واقعات سناتے۔

رسول اکرمؐ کی خانگی اور نجی زندگی آپؐ کی سیرت کی طرح بے داغ، پاک اور صاف ہے۔

”یا اللہ! نصیر کوئی نہ ہوئے وحید مراد ہو گئے۔“  
اماں کو وحید مراد شاید بہت پسند تھے اس بات پر  
تینوں کو ہنسی آگئی تھی۔

لیکن آج معاملہ سیریس تھا۔ شیزا غصے سے  
کپڑے لے کر مڑ گئی۔

”دیکھتی ہوں کل تم چھوٹے بھیا کے کپڑے  
کیسے دھوؤ گی۔ کل میں دھوؤں گی۔“ مریم بولی۔

”یا اللہ! اس بات پر ہی جھگڑا ہے کہ پہلے کون  
کپڑے دھوئے گا۔“ اماں حیران تھیں۔

روز کی آیا تقالی میں ماہ و سال گزرے۔ دونوں  
کی کوشش ہوئی کہ کون سب سے پہلے چھوٹے بھیا

کے کپڑے دھوئے گا۔ پھر ماہ و سال گزر گئے نہ  
اماں رہیں نہ ابا، اس نے پردہ ہٹا کر باہر آسمان کو

دیکھا۔ شیزا بھی ایک دائمی سفر پر چلی گئی تھی۔ پھر  
پلیٹ کر نہ آئی۔ چھوٹے بھیا بھی امریکہ سٹل ہو

گئے۔

اس بار جب چھوٹے بھیا پلیٹ کر آئے کسی گہما  
گہمی تھی ہر روز ڈنر اور لچ آپس میں ہو رہے تھے۔

کبھی شمیمہ باجی کے گھر، کبھی انم اور کبھی مریم کے  
گھر۔ بھیا نے سب کے گھر باری باری ڈے اسپنڈ

کیا۔ مریم بے حد خوش تھی آج کا دن چھوٹے بھیا  
اس کے گھر گزارنے آئے تھے۔ وہ اپنے شوہر کا

شلوار قمیض استری کر کے بھائی کے روم میں رکھ  
کے آئی تھی۔ بھائی اپنے ساتھ شلوار قمیض نہیں

لائے تھے۔ رات دیر تک بھائی بچوں کو لے کر آئس  
کریم کھلانے لے گئے۔ ساتھ ہی میں مریم کی تند

کے بچوں کو بھی ساتھ لے گئے۔

”آؤ چنو منو آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔“ یوں  
ایک دن مریم کے ہاں گزار کر بھیا امریکا کے لیے

عازم سفر ہوئے۔  
دوسرے دن دھوبی کو کپڑے دیتے وقت مریم

سردراتوں کا جنوں کچھ دیر میں ٹوٹ جائے گا۔  
شبنمی رات کا آچل ہوا کے کسی جھونکے سے ایک

لمبے کو پلٹا تو اس نے سیاہ رات کی تاریکیوں میں  
گھبرے ہوئے آسمان پر ایک نظر ڈالی۔ جھر جھری

سی آئی تو مریم نے جلدی سے گرم شال میں خود کو  
پھیٹ لیا لیکن اس کی روح کی اداسی سیاہ رات کے

اندھیرے کم نہ کر سکے۔ نہ جانے کتنے پہر پاتی ہیں  
صبح ہونے میں۔ وہ بے قراری باہر دیکھ رہی تھی۔

”یا رب وہ صبح نہ آئے میں وہ صبح نہ دیکھوں“  
اپنے آپ بڑبڑا کر اس نے پردہ چھوڑ دیا لیکن

سیاہ رات کا سایہ در آیا یوں لگا جیسے کل کی بات ہو وہ  
اور شیزا ابھی ابھی کالج سے گھر میں داخل ہوئیں

دونوں کی نظریں ایک ساتھ چھوٹے بھیا کے کپڑے  
پر جا کئی تھی۔ پہلے شیزا جھینٹی پھر مریم نے بھی تمیض

تھام لی۔

”میں آج دھوؤں گی۔“ مریم پٹی۔  
”جی نہیں آج میں، تم کئی دن سے دھور ہی ہو

میں سب جانتی ہوں۔“ شیزا نے تمیض کھینچ لی تھی۔  
”اف خدایا۔“ اماں بول پڑیں تھیں۔

”کمال ہے گلوچ کہتا ہے کہ تم لوگ اس کے  
کپڑوں کو واش نہیں کرتیں۔ ایسا کیا ہے بلو کے

کپڑوں میں۔“ اماں بہت سنجیدگی سے دیکھ رہی  
تھیں۔

”آپ نہیں سمجھ سکتیں آپ اس کو کچھ نہیں  
کہتیں۔“ شیزا غصے سے بول کر پٹی۔

”کل بھی انم اور مریم کی جھڑپ ہوئی  
تھی۔“ شیزا پھر بولی۔

”ہاں تو کیوں کھتی ہے خط۔ میں نے ملوایا ہے  
تو اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ ان کو خط لکھے۔“

کل مریم اسی بات پر انم سے الجھ پڑی تھی۔ شیزا  
نے مداخلت کی تو اماں جل کر بولیں۔



صالحہ محمود

افسانہ

## میں بہت روز بے خبر و یاد آریا



سائے تھے۔ اماں کے گھر کا ایک چھوٹا سا لحد یاد آیا تو آنکھیں برس پڑیں۔

جنت فردوس کے سائے میں  
جب آنکھ کھلے اس کی  
خوشبو گل کی آباد رہے  
حصار میں اس کی  
جنت فردوس میں ہو گھر اس کا  
ذرا سی دیر کو سویا جو  
تو قیامت گزر گئی  
کھلی نہ آنکھ اس کی  
پھر قیامت کے شور سے

جنت فردوسی میں ہو گھر اس کا

اس کے ہاتھ سے پردہ چھوٹ گیا تھا۔ باہر بچے آتش بازی کر رہے تھے۔ وہ شمال کو پیٹ کر باہر آگئی۔ لان میں لگے رنگین پھول شبنمی رات میں بھیگ رہے تھے۔ اماں کے گھر کے اندر ایک شور تھا۔ اماں اور ابا کی آوازیں تیز ہو گئیں۔ بڑے بھیا کے کیٹس کے پاس ٹوی بھونک رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ باہر بارش بڑی تیز تھی۔ دبے قدموں چلتا ہوا کوئی اس کے قریب سے گزر گیا۔ اسے جھرجھری سی آئی اور وہ گھبرا کر اندر آگئی۔ جہاں آوازیں رخ پھیر کر گزر گئیں۔

”پھلے پھول اور کانٹے تھے

دھرتی ساری پیاسی تھی

گرے کا گھنٹہ ٹوٹ گیا تھا

پر نہ کھلی تھی آنکھ اس کی

وہ بیٹھے جوڑ رہی تھی

تکلی کے رنگین پروں کو

☆

نے بھائی کی پہنی ہوئی قمیض کو تھام لیا۔ وہی خوشبو وہی مہک تھی۔ اماں کے گھر کی آپا تھاپی اسے یاد آئی۔ شیزا اور وہ دونوں بھیا کی قمیض کو کھینچ رہے ہیں۔ مریم کھلکھلا کر نہیں پڑی۔ ماضی یاد آ گیا۔

”بھیا ہمیشہ اپنی قمیض میں پیسے بھول جاتے تھے۔ دیکھوں تو سہمی۔“ اس نے قمیض کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو بلو بھائی واقعی پیسے بھول گئے تھے۔ اسے اماں کے گھر کی آپا تھاپی یاد آگئی کہ کبھی شیزا دوڑ رہی ہے کہ مجھے دے دو بھائی کے کپڑے اور اماں پوچھ رہی ہیں۔

”کیا ہے ان کپڑوں میں، تم لوگ گلو کے کپڑے دھو، وہ ناراض رہتا ہے۔“

”ان کے کپڑے تو کبھی نہیں دھوؤں گی۔“ اسے یوں لگا۔ شیزا کہیں کونے سے نکل کر آگئی ہے۔

”دیکھو ان کم بختوں کو میرے کپڑوں کو ہاتھ نہیں لگاتیں۔“ گلو بھائی بھی کسی کونے سے نکل کر کھڑے ہو گئے۔

”میں خود دھلوا دیتی ہوں ماسی سے۔“ اماں

غصے سے کھڑی ہو گئیں۔ سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ مریم بسے جا رہی تھی۔ ہتے ہتے اس نے کھڑکی سے آسمان کی سمت دیکھا رات کی تاریکی ٹوٹ رہی تھی۔ دن کی آہٹ اس کے وجود کو لرزانے لگی تھی۔

اسے آنے والی صبح سے خوف تھا جو دبیر کی سرد راتوں کو خیر باد کہہ کرنے سال کا ابدی پیغام لے کر اماں کے گھن میں صبح اترتی تھی۔ کتنی خوف ناک سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی کو کراس کرتی ہوئی گزر گئی۔ سامنے چھوٹے بھائی کا تابوت رکھا تھا۔ صبح کی پہلی کرن اتر کر اس پر پھیل گئی تھی۔ کتنی لمبی اور تاریک رات تھی جس کا اسے انتظار تھا کہ صبح نہ آئے۔ اس نے درتے پر پڑا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ باہر سیاہ رات کا اندھیرا طاری تھا اور تک اضمحلال اور کبر کے گہرے

## قبول سے ماں کو میں نبھانے کو

پیشم نے بہت سوچنے سمجھنے کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا تھا؟ کیوں کہ بڑی مای کار وہ اور لہجہ اسے بہت دکھ رہا تھا وہ ان سب کو اپنا بھٹاتا تھا مگر بڑی مافی نے کتنی غیریت کا ثبوت دیا اور کرتی بھی کیا تھیک ہی کیا یہ تو فاران کے

ساتھ بھی ظلم تھا اس کی بیوی سے شادی۔

”لعنت ہے پیشم احمد تم پر۔“ ضمیر اسے کتنے دنوں سے لعنت ملامت کر رہا تھا اور یہ بات اس کی غیرت گوارہ نہیں کر رہی تھی۔

اس نے نانا جان کو بھی اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ وہ خوشی کو اس گھر میں نہیں رکھے گا کیوں کہ وہ اپنی بیوی کی اٹھتے بیٹھتے بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا بڑی مای اسے گری ہوئی نگاہوں سے دیکھیں یہ تو وہ بالکل گوارہ نہیں کرے گا۔

”پیشم! تم غصے میں جلد بازی کر رہے ہو۔“

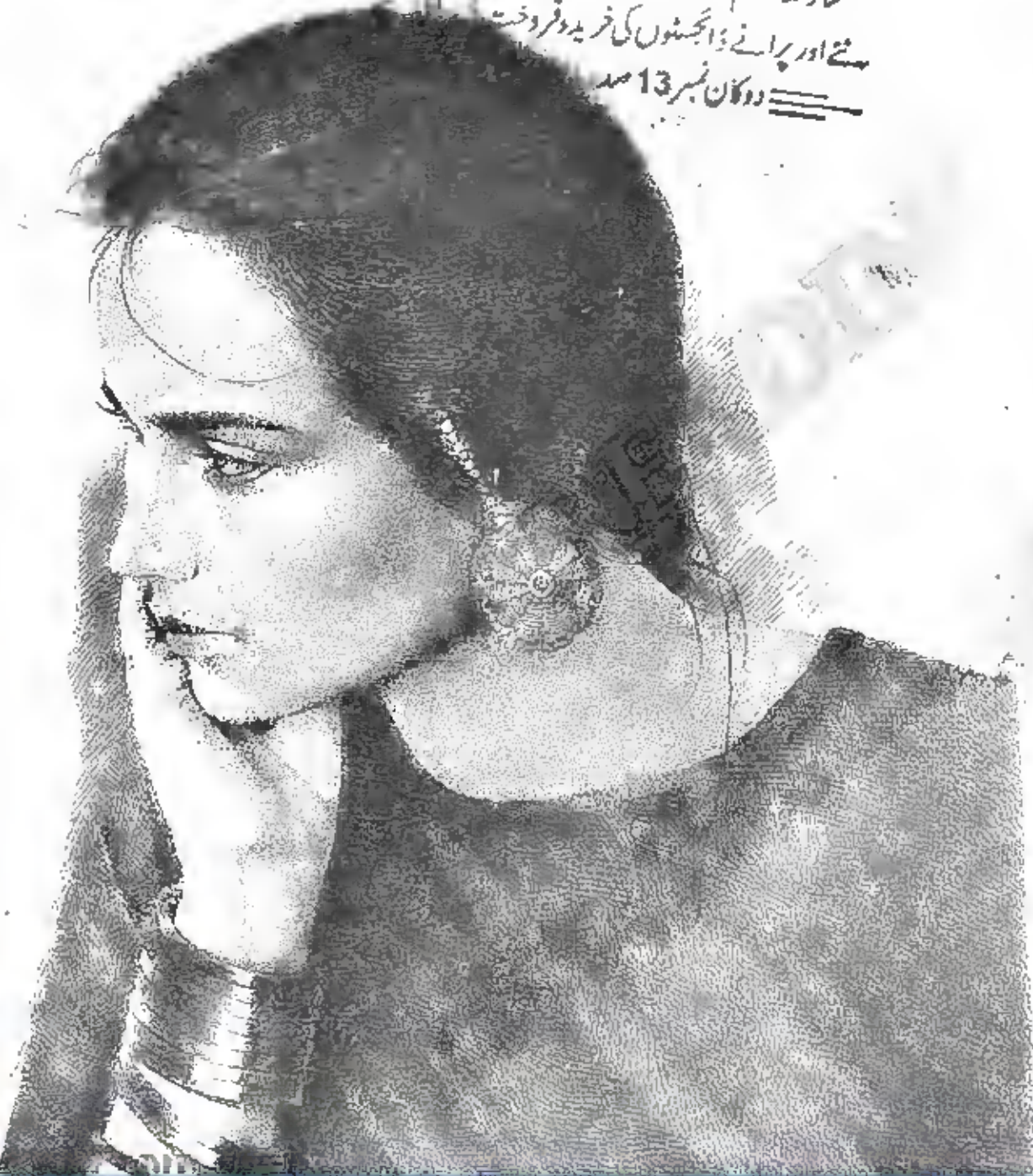
”نانا جان! میں نے جو بہتر سمجھا وہی کیا ہے۔ وہ میری بیوی ہے اور گلے پڑا ڈھول بجانا ہے۔ مگر یہاں نہیں کیوں کہ میں اپنی بیوی کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔“ وہ بہت سنجیدہ تھا۔ مرتضیٰ علی کے روم سے آواز

نیووی کی لائبریری اینڈ فریمنگ پوائنٹس

ساؤنڈ سسٹم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے

منٹے اور پرانے ڈائجسٹوں کی خرید و فروخت

دروکان نمبر 13 صد



باہر جا رہی تھی جو بڑی مای اور چھوٹی مای بھی سن رہی تھیں۔

”تم نہت کی باتوں کو اتنا سیریس کیوں لے رہے ہو؟“

”نانا جان! مجھے سیریس لینا پڑے گا۔ انہوں نے مجھے احساس دلایا ہے میں اس گھر کا ہوں ہی نہیں مگر مجھے ان سے شکایت بھی نہیں۔“ وہ نگاہ جھکائے ہوئے تھا۔

”شایدہ! ششم کیا گھر چھوڑ کے جا رہا ہے؟“ نہت کو فکر بھی ہوئی کیوں کہ ارضی علی انہیں سنانے سے چھوڑیں گے تو نہیں۔

”لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔“ وہ دکھ و تاسف سے گویا ہوئیں۔

”آپ مجھے یہ بتادیں، جانا کب ہے۔“ وہ وائٹ ٹیمپٹ شلوار میں ملبوس الجھا بکھرا ہوا لگ رہا تھا مرضی علی کو اس پر ڈھیروں پیار آیا۔

”میرے بچے مجھے غلط نہیں سمجھو، میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ میں نے سوچ سمجھ کے ہی اس لڑکی سے تمہاری شادی کی تھی۔“ انہوں نے اسے شانوں سے تمام لیا۔

”میں بہت چاہتا ہوں تمہیں۔“

”پتہ نہیں ان چاہتوں پر مجھے اعتبار کرنا چاہیے تھا یا نہیں مگر خدا گواہ ہے میں نے آپ سب کو دل سے چاہا ہے۔ اپنا سمجھا ہے میرے تو ماں باپ اس وقت دنیا سے چلے گئے جب مجھے ان کی ضرورت تھی مجھے تو یہ بھی نہیں پتہ ماں و باپ کی چاہت کیا ہوتی ہے۔“ وہ بہت دلگرفتہ اور اداس ہو رہا تھا۔

”میری چاہت پر بھی شک ہے؟“ ان کی آنکھوں میں نمی در آئی تھی۔

باہر کھڑی نہت شرمندگی سے شایدہ سے نگاہ نہیں ملارہی تھیں وہ واپس مڑ گئی تھیں۔

”کاش بھابی آپ اپنی جلن و حسد کو ایک طرف کر کے پیشم کو سمجھیں وہ تو بہت مظلوم ہے ہماری محبت و چاہت اور توجہ لے لے گا تو کیا ہو جائے گا۔“ شایدہ کا دل بھی اداس ہو گیا تھا۔ ششم اس گھر سے جانے کی جو بات کر رہا تھا۔

”نانا جان! مجھے یہ بتادیں کب مجھے اس لڑکی کو لینے جانا ہے۔“ وہ سر جھکائے ہوئے تھا۔

”ابھی میں جا کے بات کرتا ہوں۔“ وہ ادھر کی بھی حالت جانتے تھے خوشنما کی مرضی نہیں تھی کیوں کہ اس کے ساتھ بھی تو ظلم ہوا تھا۔

☆.....☆

رفتہ اس کی شاپنگ کروا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی ہدایتیں دے رہی تھیں اپنے جہیز کے سارے سوٹ کیس میں لاک لگا کے رکھنا کیا پتہ کوئی چیز ادھر ادھر ہو جائے۔ چابی اپنے پاس ہی رکھنا۔“

”اری اوحسنی! ایک دفعہ بھی اس ماں کو آکے نہیں پوچھا۔ سردرد سے پھٹا جا رہا ہے۔“ نسرین کی تیز کراری سی آواز نے اس کے مساج کرتے ہاتھوں کو روک دیا جب سے نسرین پشاور گئی تھیں۔ سردی کی وجہ سے وہ خود پر توجہ بھی نہیں دے پائی تھی جو لمبے کی تیز آنچ سے اس کی اسکن کافی متاثر ہوئی تھی۔ آج اسے موقع ملا تو وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھ گئی تھی۔

”حسنی! حسنی!“ وہ آوازیں دیے جا رہی تھیں اور حسنی ایسے بن گئی جیسے آوازیں ہی نہیں آرہی ہے۔

ردا ڈائجسٹ 16 جنوری 2015ء

”سارے کام تو کر کے آئی ہوں رات میں تو آرام لینے دیا کریں۔“ اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔

”حسنی! آبی اکب سے امی آوازیں دے رہی ہیں۔ آپ کو سنائی نہیں دے رہا۔“ فیضان ہانپتا کانپتا اوپر آیا اور سیدھا اس کے کمرے میں تھا۔

”اب کیا کام پڑ گیا تم لوگوں کے لیے روٹی وغیرہ سب پکا کے تو رکھ کے آئی ہوں۔“ اس نے اپنا پرل لینن کا پرنٹڈ دوپٹا ٹھاکے شانوں پر ڈالا۔

”امی کے ہور ہا ہے سر میں درد۔ کہہ رہی ہیں چائے بنا دو۔“ وہ اس کی مساج کریم کے جار کو دیکھنے لگا۔

”تم تو رکھو، کیا ہر چیز کتوں کی طرح سو گھتے رہتے ہو۔“ بڑی ہوئی پہلے سے تھی۔ فیضان کے ہاتھ پر ہاتھ مارا جسے ہر چیز سو گھنے کی عادت تھی۔

”تو بہ ہے آبی! کتنی زور سے مارا ہے۔“ وہ منہ بسور کے رہ گیا۔

”یہاں سے فریج ہو جاؤ۔ میں آرہی ہوں۔“ جار سارے اندر ڈریسنگ ٹیبل کی رائٹ درواز میں رکھے۔

”پتہ نہیں اتنا غصہ کیوں کھاتی ہو۔ بالکل امی پر گئی ہو۔“ وہ تپ تو گیا تھا۔

”تکو اس نہیں کرو۔“

فیضان منہ بنانا ہوا چلا گیا تھا اور وہ دانت پیس رہی تھی۔ رخصتی کے دن بھی قریب آرہے تھے۔ شہر یار نے الگ اس کا بیٹا دو بھر کیا ہوا تھا۔ اوپر سے نسرین کی ہدایتیں جب سے پشاور سے آئی تھیں بالکل ہی ہاتھ پیر چھوڑ کے بیٹھ گئی تھیں۔ ہر کام کے لیے اسے آوازیں دیتی تھیں۔

بیڈ سے اٹھا دوپٹا اٹھایا اسی وقت اس کا سیل بھی بیپ دینے لگا۔

”ادہ نو.....“ وہ بے زار رہی ہو گئی اپنا سر تمام کر شہر یار کی کال تھی اور اس کی کال تو مس کرنا اپنی شامت بلانے کے برابر تھا۔

”سنیں مجھے نیچے جانا ہے وہ امی کب سے آوازیں دے رہی ہیں۔“ کال ریسیو کرتے ہی فوراً اپنا عذر بھی پیش کر دیا۔

”تم جھوٹ بھی بولنے لگی ہو۔“ شہر یار جیسے اسے معافی دینا نہیں چاہتا تھا۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ وہ بھنا گئی۔

”آواز کو نیچے کر کے بات کرو اپنے شوہر سے مخاطب ہو، گھر کے ملازم سے نہیں۔“ وہ تو ایک لمحے میں اسے جھڑک کے ہی رکھ دیتا تھا۔

”سنو! جلدی کام سے فارغ ہو جاؤ، تو میں کال کروں گا۔“ وہ روز ہی کال کرتا تھا کبھی نیٹ تو کبھی سیل حسنی کو اپنی زندگی سنبھالنے لگتی تھی۔

”آج ویسے بھی جمعہ ہے بہت کام ہے نماز پڑھنی ہے۔“

”وائٹ! تم جمعہ کے جمعہ صرف نماز پڑھتی ہو۔“ وہ تو غصہ میں آ گیا۔

”اتنے کام ہوتے ہیں۔ نماز کا نام نہیں ملتا۔“ وہ شرمندہ بھی ہوئی۔

”شرم کرو نماز کو صرف کام کی وجہ سے نہیں پڑھتی ہو۔ زندگی میں تمہارے ڈسپلن ہے ہی کب جو تم نماز پڑھو گی۔ آئس کونسل پابندی سے جانا یاد رہتا ہے، کبھی یہ پابندی نماز کے لیے بھی کی ہے؟“ شہر یار کا تو لیکچر

ردا ڈائجسٹ 17 جنوری 2015ء



شروع ہو گیا تھا۔

حسنی سخت کوفت محسوس کر رہی تھی مگر نماز نہ پڑھنے پر اسے شرمندگی تھی۔

”میں کچھ نہیں جانتا تم نماز کی بھی پابندی کرو، کیوں کہ بعد میں، میں تمہیں پابندی سے فجر میں بھی اٹھایا کروں گا تو برا لگے گا تمہیں ہی اسی لیے ابھی سے پابندی کر لو۔“ وہ اسے سخت مست سنانے کے بعد آگئی بھی دینے لگا۔

”فجر میں تو اٹھا بھی نہیں جاتا۔“ وہ سننائی۔

”سارے کام کرنے پڑیں گے تمہیں تو ہی پتہ چلے گا زندگی کیا ہے۔“

”وہ تو مجھے پتا چل گئی ہے۔ زندگی کیا ہے۔“ وہ سوچ کے رہ گئی۔

”اری اوسنی! کدھر گئی۔“ نسرین کی پھر پات دار آواز آئی تو وہ اچھل گئی۔

”سنیے! مجھے ای بلا رہی ہیں۔“ وہ یہ کہہ کر موبائل ڈرائنگ ٹیبل پر ڈال کے تیزی سے بھاگ گئی۔

”جلدی آ جانا۔“ رفعت کی آواز پیچھے سے آئی کیوں کہ انہیں پتہ تھا نسرین اسے تہی جلدی تو نہیں بھیجیں گی۔

☆.....☆

مرقظی علی ہشتم کولے کے آنے والے تھے اور خوشنما ابھی تک آفس میں تھی۔ آفس بھی اس نے زبردستی ہی دوبارہ جوائن کیا تھا ورنہ ہشتم کی اس دن والی حرکت کی وجہ سے وہ آنے والی تو بالکل نہیں تھی۔

”کیا بات ہے آج آپ ابھی تک یہاں کیوں ہیں۔“ وہ خاننا سنجیدہ لگ رہا تھا۔

خوشنما اس کی جانب دیکھنے سے اجتناب ہی برت رہی تھی ورنہ تو وہ اس کی جانب پر لات مار کے چلی گئی تھی مگر اشعر کی کال اور ایک سال کے ایگریمنٹ کی وجہ سے دوبارہ آنا پڑا ورنہ وہ ایگریمنٹ کو بھی اہمیت نہیں دینا چاہ رہی تھی۔

”آج کام زیادہ ہے اس لیے یہاں ہوں۔“ رکھائی اور ذرا ترش روی سے گویا ہوئی۔

”مجھے آج کبھی ضروری جانا ہے اس لیے آج کا کام آپ رہنے دس کل کر لیجئے گا۔“ وہ اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا جانے کیوں اس لڑکی کو وہ سوچنے لگا تھا۔ اسے یہ اچھی لگنے لگی تھی۔

”آپ کو جانا ہے تو جائیے۔“ وہ جانتی تھی اسے آج کہاں ضروری جانا تھا۔

مرقظی علی اور اسے آنا تھا وہ ان دونوں سے بچ کے ہی تو یہاں بیٹھی تھی۔

”مس خوشنما۔“ تیز لہجے میں پکارا۔

”مس نہیں مسز۔“ اس نے جھٹ جتایا۔

”آپ اس بے بنیاد رشتے کو کیوں لے کے بیٹھی ہیں جان چھڑائیے میں آپ کو آفر دے تو رہا ہوں۔“

”شٹ اپ۔“ وہ تو مشتعل ہی ہو گئی۔

”آپ کے لیے بے بنیاد رشتہ ہوگا۔ آپ اپر کلاس لوگوں کے لیے ایسے رشتے بے بنیاد ہوتے ہیں؟ ہم ٹڈل کلاس لوگوں کی بیٹیاں ایک ہی دفعہ رشتہ قائم کرتی ہیں اور دل و جان سے قائم کرتی ہیں۔“ اس نے آج پھر ہشتم کی طبیعت صاف کر دی تھی۔

”آپ ٹڈل کلاس کی لڑکیاں اونچے اونچے خواب بھی بہت سجاتی ہیں۔ اپنی چادر کے مطابق خواب ہی

ردا ڈائجسٹ 18 جنوری 2015ء

دیکھتی ہیں۔ میں نے آپ کو اس لیے آفر دی تھی آپ کے خواب اسی طرح پورے ہو جائیں گے۔“

”شٹ اپ! میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں کیوں کہ وہی لڑکیاں خواب اونچے سجاتی ہیں جن کی تربیت میں کچھ کئی ہو یا جن کی مائیں ان کا دماغ خراب کر دیں یا سر پر چڑھ جائیں۔“ خوشنما کے دل میں تو لگتا تھا آگ بھری تھی جو شعلے باہر نکل رہے تھے۔

”ہاں! سوائے بوز کرنے کے کچھ نہیں آتا، کیوں کہ آپ ٹڈل کلاس لڑکیوں کے ہی سب سے زیادہ نخرے بھی ہوتے ہیں۔“ ہشتم کو کچھ جاننے والوں کا پتا تھا وہ کیسے لوگ تھے۔

”پتا نہیں کن کن لڑکیوں سے ملتے ہیں۔“ انداز اس کا فہما ہشی اور طنزیہ ہو گیا۔

”فضول بکواس کا میں عادی نہیں ہوں۔“ وہ سلگ گیا۔

”آپ اس وقت جائے شام زیادہ ہو جائے گی پھر کنونینس کا مسئلہ ہوگا۔“ جانے کیوں ہشتم کو اس تیکھی مزاج والی لڑکی سے اتنی کیونکر انسیت اور لگاؤ ہو گیا تھا۔ وہ خود کو جیسے اس کے بغیر ادھورا سمجھنے لگا تھا۔ گھر کی جو ٹینشن تھی وہ اس میں بھی خوشنما سے غافل نہیں تھا۔ اسے خوشنما کی سادگی صاف گوئی سچائی بہت متاثر کر گئی تھی۔ اس نے خوشنما سے وفا شکاری کا سبق بھی لے لیا تھا۔ وہ اپنے شوہر سے کتنی محبت کرتی تھی جب کہ وہ اسے کچھ سمجھتا نہیں تھا پھر بھی وہ خود کو اس کے نام پر رکھے ہوئے تھی۔ یہ بھی تو ٹڈل کلاس لڑکی تھی اس میں اس کے ماں باپ کی تربیت کا دخل تھا۔ جنہوں نے اس کی اچھی تربیت کی تھی اور لڑکیوں کی طرح اس میں نخرے اور نزاکت والے انداز نہیں تھے۔ جب کہ کتنی نرم دنازک سرخ و سپید خوب صورت نقوش والی خوشنما بالکل بھی خرد نہیں کرتی تھی۔ اسے جیسے اپنے حسن کی پرواہ ہی نہیں تھی یا پھر اسے خبر نہیں تھی یا انجان تھی وہ حسن کی دولت سے مالا مال ہے۔

”آپ کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آج پہلی دفعہ دیر تک کام نہیں کروں گی۔ اشارت میں آپ مجھ سے دیر تک ہی کام لیتے تھے۔“ ساتھ ہی اس نے جتایا ہشتم تو لگتا تھا اس کے حسن کے بیچ و خم میں الجھ گیا تھا۔

”آں ہاں۔“ وہ کچھ جریز ہو گیا۔

فان کلر کی پینٹ آف وائٹ چیک کی شرٹ میں وہ کتنا سویر لگ رہا تھا۔

”بٹ میں آج آپ کو اتنی دیر کی اجازت نہیں دیتا فوراً اٹھیے میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔ کیوں کہ مجھے بھی ادھر ہی کام سے جانا ہے۔“ مرقظی علی کی کال آگئی تھی وہ جاوید احمد کے گھر پہنچ گئے تھے۔ اسے بھی وہیں پہنچنے کو کہا تھا اس نے سوچا خوشنما کو بھی راستے میں ڈراپ کر دے گا۔

”وہ وہ نہیں مجھے کام کرنا ہے۔“ وہ گڑ بڑا گئی۔

”اونہہ مائی فٹ۔“ ہشتم کو پہلے ہی جھنجھلاہٹ تھی۔

”نور! نیچے آؤ میں گاڑی میں دیکھ کر رہا ہوں۔“ وہ اس کی سنے بغیر قدم بڑھاتا ہوا نکل گیا۔

☆.....☆

”اس دفعہ دادی جان کا لہا ہی قیام ہو گیا ہے۔“ منزل کو حیرانگی بھی تھی۔

”وہ آج کل میں بھابھی کو نوٹ کرنے آئی ہیں۔“ طلحہ انہیں جانتا تھا کیوں کہ مسلسل حباب پر ٹوکا ٹاکی

ردا ڈائجسٹ 19 جنوری 2015ء

ہی کر رہی تھیں۔

”ہاں یار! یہ تو ہے۔“ منزل تو اچھی طرح واقف تھا۔ اس کے سامنے خود کئی دفعہ فضول کی باتوں پر اعتراض کیا تھا۔

”منزل! مجھے کچن سے شوگر پاٹ لا دو۔“ حباب کرے سے نکلے ہوئے ہچکچاہتی تھی اگر پھر انہوں نے کوئی بات کہہ دی۔

”ارے بھابھی! آپ تو دادی جان سے ڈرنے ہی لگی ہیں۔ ارے جائے آپ پر اعتمادی سے ہر بات کا جواب دیں۔“ منزل نے اس کی ہمت بڑھائی۔

”وہ بزرگ ہیں۔ میں ان سے الجھنا نہیں چاہتی۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

”چلو میں خود ہی لے آتی ہوں۔“ جیسے اسے منزل کی بات سمجھ آگئی تھی۔

”رضوانہ! ضمیر ان کی دلہن دوپہر سے کمرے میں ہی گھسی ہوئی ہو۔“ پھر نکتہ اعتراض اٹھایا۔

”جی وہ میں کمرے کی ڈسٹنگ کر رہی تھی۔“ حباب نے کوفت میں جھلا ہوتے کہا۔

”کیوں صبح صاف نہیں کرتی ہو۔ ارے بستر سے اٹھ کے پہلے نہایا دھویا کرو پھر کسی کام کو ہاتھ لگایا کرو۔“

غضب خدا کا رضوانہ تم نے تو بالکل ہی آنکھیں بند کر لی ہیں۔ انہوں نے انتہائی ناگواری میں جھلا ہوئے گویا ان پر طنز ہی کیا۔

اور حباب بدو تو شرم اور غصے سے سلگ کے رہ گئی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے میں غسل کر کے ہی ہر کام کرتی ہوں اور دن میں ایک دفعہ نہیں تین دفعہ کرتی ہوں غسل، مجھے صاف رہنے کی عادت ہے اور رہی کمرے کی ڈسٹنگ وہ میں ہر وقت صاف رکھتی ہوں مگر کبھی پھیل جاتا ہے۔ اسے سینٹا بھی پڑتا ہے۔ یہ روز نہیں ہوتا کبھی کبھی کیونکر ضمیر ان ابھی آفس سے آئے ہیں۔ ان کے کاموں میں لگی تھی۔“ وہ انہیں تفصیلی آگئی دینے کے بعد شوگر پاٹ لے گئی۔

”مجھے آپ کچھ دنوں کے لیے ای کے گھر چھوڑ دیں مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ ہر بات جو کہنے کی بھی نہیں ہوتی ہیں وہ دادی جان کہہ جاتی ہیں۔“ چائے میں شوگر ملانے کے بعد ضمیر ان سے تیز لہجے میں ہی بولی تھی۔

”کیوں ڈر کے بھاگ رہی ہو۔“ اس نے مسکرا کے طنز کیا۔

”میں ڈرتی وڑتی کسی سے نہیں ہوں۔“

”آئی نو یہ تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ حباب نے اس کی آنکھوں میں دیکھا جو اسے ہی بغور دیکھ بھی رہا تھا۔

”میں ایسی فضول باتوں سے ڈرتی ہوں۔“ وہ جھٹ وضاحت دینے لگی۔

”مجھے آج ہی چھوڑ دیں جب یہ چلی جائیں مجھے لینے آجائے گا۔“ وہ کچھ خاموش سی ہو گئی۔

”ای کو یہاں ان کے زخمے میں اکیلی چھوڑ کے چلی جاؤ گی؟ ارے تمہارے چلے جانے سے وہ اور باتیں بتائیں گی۔ تم جانے کی غلطی نہیں کرو، ان کا دفاع کرو۔ ہماری ای کو بھی ایسے ہی بولتی تھیں وہ برداشت ہی کرتی آئی ہیں دیکھو خود ہی گھر سے بے دخل کیا اور اپنے بیٹے کو اپنے پاس رکھ لیا، ابو کا مستقبل ہی خراب کر دیا۔ وہ تو

اکیلے ہیں اور ہماری ماں کے پاس چار بیٹے ہیں اور خود دادی جان کون سا کھ سے ہیں۔ تائی ای سے ان کی بچی نہیں ہے۔ تائی ابو اپنی بیوی کی ہی حمایت کرتے ہیں۔“

”کہتے ہیں سسرال میں اگر شوہر کی سپورٹ حاصل نہیں ہو تو بیوی بہت کمزور اور اکیلی ہوتی ہے۔“ حباب نے بھی تائیدی کہا۔

”مگر تمہارے ساتھ یہاں بالکل ایسا نہیں ہے۔ شوہر کی سپورٹ حاصل ہے اور ساس دیوروں کی بھی تمہیں کوئی اکیلا کرے گا بھی نہیں۔“ چائے پی کے کپ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

”یہ سب کہنے کی باتیں ہیں لڑکی سسرال میں اکیلی ہی ہوتی ہے۔ کیوں کہ رخصت ہو کے لڑکی آئی ہے۔ لڑکا نہیں اس لیے سسرال والے جیسا چاہے سلوک کرتے ہیں اور شوہر اگر قسمت سے اچھا ل جائے۔ تو ٹھیک ہے ورنہ پھر زندگی عذاب ہی بنتی ہے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں گویا ہوئی۔

”تمہارے ساتھ یہاں ایسا کون سا سلوک برتا جا رہا ہے۔ کوئی روکتا ٹوکتا تک نہیں ہے۔ شوہر کو تم کچھ سمجھتی نہیں ہو۔“ ساتھ ہی اس نے بھی طنز کا تیرا اچھالا۔

”اب خود ہی دیکھ لیں میری ایسی بات پر کیسے آپ کا رویہ بدل گیا۔“

”یار! تم بات ہی عجیب کر رہی ہو اتنا تو سب خیال رکھتے ہیں تمہارا اس پر بھی تم منہ بنا کے رکھتی ہو۔“ ضمیر ان نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔

”آپ سب کی وجہ سے آپ کی دادی جان اور پھوپھو مجھ سے جلتی تپتی رہتی ہیں میں یہاں خود سے تو چل کے نہیں آئی ہوں۔“ وہ رو ہانسی ہو گئی۔

”حباب پلیز! اب رونا دھونا نہیں تم ان کی باتوں کا کیوں اثر لیتی ہو۔ تم صرف مجھ سے غرض رکھو۔“ ضمیر ان سے اس کے آنسو نہیں دیکھے جا رہے تھے۔

”میں اثر لینا نہیں چاہتی مگر وہ مجھے ذہنی مار چ کر کے ان باتوں پر اثر لینے پر مجبور کرتی ہیں۔“

”اچھا چلو چھوڑو فضول میں بحث ہی بڑھے گی۔ تم گھر جانا چاہتی ہو میں چھوڑ کے آتا ہوں۔“ لگتا تھا اسے حباب پر ترس آنے لگا تھا واقعی اس کا تو کوئی قصور نہیں تھا جو اسے باتیں سنائی جاتی ہیں طنز کیے جاتے ہیں۔

”مجھے نہیں جانا پہلے منع کر دیا پھر جانے کا کہہ رہے ہیں۔“ وہ روٹھ کے بیڈ پر ہی لیٹ گئی۔

ضمیر ان کو وہ بھی بھی بہت چھوٹی سی بچی لگتی۔ جسے سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ یہ تو اسے اندازہ ہو گیا تھا وہ بہت حساس اور نازک مزاج کی ہے۔ کچھ ماں و باپ کی عیالہ کی وجہ سے بھی حباب کی شخصیت بہت متاثر ہوئی تھی۔

”جیسے تمہاری مرضی ویسے میں نے منع کسی وجہ سے کیا تھا وہ میں نے تمہیں بتا دیا تھا۔“ ضمیر ان نے اس کا چہرہ بغور دیکھا وہ بہت بے زار لگ رہی تھی۔

”دیکھو! تم ان سب کی باتوں کو ایک کان سے سن کے دوسرے سے نکال دیا کرو دل نہیں جلاؤ۔“

”یہ سب کہنا بہت آسان ہے ضمیر ان صاحب! مگر جب لوگ بار بار جتاتے ہیں اور احساس دلاتے ہیں تو ہی دل بھی جلتا ہے۔“ وہ کپ اٹھا کے باہر نکل گئی۔

ضمیر ان کی خود سمجھ نہیں آ رہا تھا حباب کو وہ کیسے سنبھالے اگر شہریار سے کچھ بولتا ہے تو حباب پھر اس سے لڑے گی کیوں کہ شہریار حباب کو سمجھانے جو لگتا ہے۔

☆.....☆

کب سے وہ سب آئے بیٹھے تھے اور اس کا کوئی پتا نہیں تھا۔

”یہ آپنی کو آج ہی کام تھا۔“ رونا کو فکڑ بھی ہو رہی تھی۔ وہ ابھی تک جو نہیں آئی تھی۔

مرتنضی صاحب بھی بار بار اس کے موبائل پر کال کر رہے ہیں مگر وہ آف کیے بیٹھی ہے۔ ”امی کو فکڑ ستائے جا رہی تھی۔ مغرب کی اذانیں ہو گئی تھیں عموماً وہ اس وقت آ جاتی تھی ستمبر شروع ہو گیا تھا اور اذانیں سات بجے ہونے لگی تھیں۔“

”ہشتم ابھی تک نہیں آیا۔ وہ تو کہہ رہا تھا میں پہنچنے والا ہوں۔“ مرتضیٰ علی کو جاوید احمد کے سامنے شرمندگی ہو رہی تھی۔

”ہو سکتا ہے کوئی کام پڑ گیا ہو۔“ حالانکہ فکر مند جاوید احمد بھی ہو رہے تھے۔

شمینہ کی نگاہیں مسلسل دروازے پر لگی تھیں خوشنما بھی تو نہیں آئی تھی۔ وہ جانتی تھیں بہت ضدی طبیعت کی ہے۔

اسی وقت ڈور بیل ہوئی۔ وہ فوراً گیٹ پر گئی تھیں۔

سامنے ہشتم کود کھینچ کر حیران رہ گئیں۔ اس نے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔“ جلدی سے اسے راستہ دیا وہ اندر جھٹکتا ہوا آ گیا بلیک پیٹ پر لائٹ پتک شرٹ میں وہ چار منگ لگ رہی تھا۔

”شکر ہے آگئے۔“ مرتضیٰ علی نے بھی تشکر بھرا سانس لیا۔

”کیا بات ہے آج خوشی بیٹا کو اتنی دیر ہو گئی آنے میں۔“

”جی پتا نہیں کیا بات ہے ورنہ عموماً پانچ بجے تک آ جاتی ہے۔“ جاوید احمد شرمندہ ہوئے ہشتم کے چتون تھکے ہوئے وہ چونک گیا۔

”جاوید! میں خوشی بیٹا کو سمجھتا ہوں وہ جان کے ہم سے بچ رہی ہوگی۔“ وہ سمجھ گئے تھے۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔“ وہ شرمندہ ہوئے۔

”دیکھو! اس کا غصہ حق بجانب ہے۔“ انہوں نے ان کی شرمندگی کو ختم کیا۔

اتنے میں وہ بھی آگئی تھی مگر بہت غصے میں تھی۔ کیوں کہ ہشتم نے زبردستی اسے ڈراپ کیا تھا چند گلیوں پہلے اتری تھی اس لیے چل چل کے پسینے میں ہو گئی تھی۔

”شکر ہے آپنی! آپ آگئی ہیں۔ ہشتم بھائی بھی آئے ہیں۔ بڑے ہینڈ سم لگ رہے ہیں۔“ رونا تو بہت ہی ایکسا پیٹڈ ہو رہی تھی۔

”فضول بکواس نہیں کرو۔ میرے کپڑے پر لیس کرو۔ میں پہلے نہادوں کی بہت حشر خراب ہو رہا ہے۔“ وہ اس کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دینا چاہ رہی تھی۔

”آپنی! اچھی طرح تیار ہونا آج آپ کی رخصتی ہے۔“ امین نے بھی شرارت سے اسے چھیڑا۔

ردا ڈائجسٹ [22] جنوری 2015ء

”تم دونوں کا دماغ خراب ہے۔ میں اس لیے تیار نہیں ہو رہی ہوں مجھے گری لگ رہی ہے۔“ وہ کپڑے بیڈ پر ڈال کے واش روم میں چلی گئی تھی۔ رونا اور امین نے ان لوگوں کے لیے ناشتہ وغیرہ سرو کر دیا تھا وہ خوشنما کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

”بلائیے ہماری بیٹی کو۔“ مرتضیٰ علی کو جلدی تھی۔ جب کہ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا اس کا تو پہلے ہی دل عجیب ہو رہا تھا ایک طرف خوشنما کو دل میں بسا چکا تھا اور ایک طرف یہ اس کی بیوی کیا کرتا اس کی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

”ہشتم احمد! خوشنما کسی کی بیوی ہے کیوں کسی کی بیوی پر نگاہ رکھ کر گناہ کے مرتکب ہوتے ہو۔“ اندر سے ضمیر نے لعنت ملامت کی تھی۔ ”یہ لڑکی تمہاری بیوی ہے اسے عزت سے لے کے جاؤ پہلے ہی اس کی تم نے بہت بے عزتی کی ہے۔“

”کیا بات ہے ابھی تک وہ آئی کیوں نہیں؟“ جاوید احمد نے شمینہ سے پوچھا۔

”وہ آج جانے کو منع کر رہی ہے۔“

”ارے یہ کیا بات ہوئی۔“ جاوید احمد کو غصہ آنے لگا۔

”آرام سے جاوید وہ بچی بہت ٹوٹی ہوئی ہے۔ اس نامعقول کی وجہ سے میں بات کرتا ہوں۔“ وہ انہیں چپ کرانے لگے۔

”نانا جان! میں بات کروں۔“ اس نے مجبوراً لب کھولے ان تینوں نے ہی حیرانگی سے اسے دیکھا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ جاوید احمد تو بچی چاہتے تھے یہ دونوں خود ہی مل کے کوئی بات کریں گے تو بہتر ہوگا۔

اندر خوشنما نے سنا کہ وہ اس سے بات کرنے آرہا ہے۔ تو وہ گڑ بڑا گئی۔ سامنے کرنے پر حقیقت اس پر واضح ہو جائے گی اور اتنی جلدی وہ ہشتم کو معاف نہیں کرے گی۔

”ای! میں ان سے کوئی بات نہیں کروں گی۔“ اس نے صاف منہ کر دیا۔

”پھر گھر جا کے بات کرنا رونا اس کا سوٹ کیس اٹھاؤ جو پیک کیا تھا۔“ وہ تو جیسے انکار سننا ہی نہیں چاہتی تھیں۔

”امی! یہ کیا کر رہی ہیں؟“ وہ روہانسی ہونے لگی۔ مگر شمینہ نے اسے زبردستی چادر اوڑھائی اور واسطے دیے وہ منہ چھپائے روٹی ہوئی چلی گئی۔ ہشتم نے چونک کے اس کے وجود کو دیکھا کچھ گمان گزرا تھا۔

مگر چہرہ چھپا تھا۔ مبرون کلر کی بڑی سی چادر جس پر شیشوں اور دھاگوں کی کڑھائی تھی اس میں وہ لپٹی تھی۔

”نانا جان! ان سے بولنے اپنی سسکیاں بند کریں کیوں کہ ہم انہیں کڈنیپ کر کے نہیں لے جا رہے۔“ اسے رونے سے کوفت ہو رہی تھی۔

مرتنضی علی مسکرائے وہ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

”خوشی بیٹا! چپ ہو جاؤ اس نامعقول کو جو دل چاہے سزا دینا، میری طرف سے اجازت ہے۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ (جاری ہے)

ردا ڈائجسٹ [23] جنوری 2015ء

# اپنی تہی ساجھو

وہ ساجھو انتہائی بے یقینی سے سامنے والا منظر تھا۔ درد کی شدت سے اس نے اپنی آنکھیں بند دیکھ رہی تھی۔ یہ منظر اس کے لیے بہت تکلیف دہ کر لیں مگر درد اس لیے صرف اس کی آنکھوں میں

نہیں بلکہ اس کے پورے وجود کے اندر خون کی مانند دھڑ رہا تھا۔ ساجھو نے جاہا کہ ہر بار کی طرح اس با بھی اپنے کسی سحر سے وہ اس منظر کی بد صورتی کو خوب صورتی میں بدل دے مگر زندگی میں پہلی بار اس کا ہر سحر بے اثر جا رہا تھا۔ وہ کسی بیخبرے میں بند پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی مگر بے بس تھی۔ کچھ ہی دیر میں سامنے سے آگ کے شعلے اس کی طرف بڑھنے لگے مگر وہ آگ کے شعلے نہیں کسی کی نفرت سے بھری ہوئی نگاہیں تھیں۔ جو بہت تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ بھاگ کر اسٹور روم میں چلی گئی مگر وہ نگاہیں مسلسل اس کے تعاقب میں تھیں، کچھ ہی دیر میں وہ ان شعلوں کی لپیٹ میں تھی۔ اس کا پورا پورا جل رہا تھا۔ وہ رونا، چیخنا اور چلانا چاہتی تھی۔ مگر کسی نے اسے یہ موقع بھی نہیں دیا تھا۔ وہ اونٹ سے منہ گر پڑی تھی۔ سامنے کھڑے نفوس اس کی اس حالت پر تہمتے لگا رہے تھے۔ اس نے آنکھیں موندھ لیں۔ وہ ساجھو اس روز ہار گئی تھی دس سال پر محیط اس کا



سحر لٹ چکا تھا۔

چٹا گلز بیرے تے.....

کاسی دوپٹے والے.....

منڈا صدقے تیرے تے.....

لڑکیاں نہایت بلند آواز میں مہندی کے گیت گات رہی تھیں۔ آڑہ اسٹج پر بیٹھی مسکراتی ہوئی سب کو دیکھ رہی تھی۔ یہ گیت سننا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ان گیتوں نے فضا میں کچھ شوخ سے رنگ بھر دیے تھے اور آڑہ کا پورا وجود ان رنگوں میں رنگ گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں باقاعدہ طور پر مہندی لگانے کا آغاز ہو گیا۔ مہندی کی اس خوشبو کو لکھ لکھ وہ اپنے اندر اتار رہی تھی۔ جس شخص کے نام کی اسے مہندی لگ رہی تھی وہ تو اسے جانتی تک نہیں تھی مگر اس لمحے اس نے اس شخص کو اپنا مان لیا تھا۔ وہ اجنبی اسے خود سے بھی پیارا ہو گیا تھا۔ اپنی مہندی کی رات ہر لڑکی شاید ایسے ہی تجربات سے گزرتی ہوگی۔ اپنے آنے والے کل کے حوالے سے رنگوں، پھولوں اور خوشبوؤں سے سچے خواب اس کی دلہیز پر دستک دیتے ہوں گے۔ ایسے ہی کچھ خواب آڑہ سجاد کی آنکھوں میں بھی آن بے تھے جسے کچھ دیر پہلے ہی حاشر محمود کے نام کی مہندی لگ چکی تھی۔ اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے پچھڑنے کا دکھ اپنی جگہ مگر آڑہ کو ایک اجنبی کے بارے میں سوچنا بھی بہت اچھا لگ رہا تھا۔ جو اب اجنبی نہیں بلکہ اس کے دل کا مین بن چکا تھا۔ اس رات آڑہ نے اپنے دل کے سارے درد اوزے اس ایک شخص کے لیے کھول دیے تھے۔

”نیلو بھابھی! جلدی کریں ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“ حاشر جھنجھلاتا ہوا اپنی بھابھی کے کمرے میں داخل ہوا جو اس وقت تیار ہو کر آئینے کے سامنے کھڑی اپنا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔

”چلے چلتے ہیں جناب دیور صاحب! ایسی بھی

کیا بے صبری۔“ نیلم نے مسکراتے ہوئے اپنے دیور کی طرف دیکھا جو کالی شیروانی میں کسی منگلیہ شہزادے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

”بارات تیار کھڑی ہے نیلو بھابھی! مگر آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا دیور آپ کے بغیر نہیں جائے گا۔“ حاشر کا لہجہ بھی اب خوشگوار ہو گیا تھا۔

”بس میں تیار ہی ہوں۔ اطہر کہاں ہیں؟“ نیلم نے اپنے دوپٹے کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

”اطہر بھائی اپنی گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں مگر آپ میرے ساتھ میری گاڑی میں جائیں گی اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھیں گی۔“ حاشر نے حکمیہ انداز میں کہا۔

”او کے پاس!“ نیلم ہنستے ہوئے بولی اور حاشر کے ساتھ باہر کی طرف چل پڑی جہاں باقی بارات ان دونوں کا انتظار کر رہی تھی۔

سید محمود شاہ کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑا بیٹا اکبر محمود ایم بی اے کرنے کے بعد ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کر رہا تھا۔ اس نے اپنی پسند سے شادی کی تھی مگر اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ چند سال پہلے اپنی والدہ کے انتقال کے بعد چند گھر یلو اختلافات کے باعث وہ علیحدہ ہو گیا تھا مگر وقتاً فوقتاً محمود شاہ صاحب سے ملنے کے لیے آتا رہتا تھا۔

ان کا دوسرا بیٹا اطہر محمود ایک نہایت کامیاب ڈاکٹر تھا۔ ایم بی بی ایس کرنے کے بعد اس نے الٹرا سائڈ کرنے میں مہارت حاصل کی اور اب وہ ایک انتہائی مشہور الٹرا سائڈ اسپیشلسٹ تھا اور اس کی شہرت میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ اطہر کی شادی انہوں نے اپنی بیوہ بہن کی بیٹی سے کر دی تھی۔ ان کے ذہن میں یہ سوچ کارفرما تھی کہ جیم لڑکی اچھے طریقے سے ان کا گھر سنہال لے گی۔ نیلم نے بلاشبہ بہت اچھے طریقے سے گھر کا انتظام چلایا مگر وہ طبیعت کی ذرا تیز بھی نہیں وجہ تھی کہ ان کی

نیلم کی زندگی میں بھی ساس بہو کی رداہی چھٹلش اکثر دیکھنے میں آتی رہتی تھی مگر ان کی نیلم کے انتقال کے بعد نیلم نے سارے اختلافات بالائے طاق رکھ کر ان کے گھر کو بلاشبہ جنت بنا کر رکھ دیا تھا۔ محمود شاہ صاحب کا نیلم بہت خیال رکھتی تھی۔

ایک لحاظ سے ان کی بیٹی کی کمی کو اس نے پورا کر دیا تھا۔ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا حاشر محمود ان کے دونوں بیٹوں سے زیادہ ذہین اور پروفوقار شخصیت کا مالک تھا۔ بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کرنے کے بعد اب وہ اپنا بزنس کر رہا تھا۔ وہ الیکٹرانکس کی مختلف اشیاء کو دوسرے ممالک میں بھیجتا تھا اور وہیں سے اشیاء منگوا کر مقامی مارکیٹ میں سپلائی کرتا تھا۔ ابھی اس کا بزنس بہت محدود پیمانے پر تھا مگر محمود صاحب کو یقین تھا کہ وہ بہت جلد بزنس میں بڑی کامیابی حاصل کرے گا۔ اس کو کاروبار کرنے کے لیے سرمایہ بھی انہوں نے ہی فراہم کیا تھا۔ حاشر بھی اپنے باپ کے یقین کو سچ ثابت کرنے کے لیے کاروبار پر بھر پور توجہ دے رہا تھا۔

محمود شاہ نے حاشر کا رشتہ اپنے ایک دوست کی بیٹی سے طے کر دیا تھا۔ حاشر نے اس معاملے میں فرما برداری کا ثبوت دیتے ہوئے ان کی پسند پر رضا مندی ظاہر کر دی تھی۔ حاشر تمام گھر والوں میں سے اپنی بھابھی نیلم کے بہت قریب تھا۔ نیلم بھی حاشر کا چھوٹے بچوں کی طرح خیال رکھتی تھی۔ حاشر کا خیال رکھنے کے چکر میں وہ اکثر اطہر کو نظر انداز کر دیا کرتی تھی۔ محمود صاحب اکثر اس بات کو محسوس کرتے تھے مگر خاموش رہتے تھے، ویسے بھی وہ گھر یلو معاملات میں مداخلت نہ کرنے کے قائل تھے۔ انہوں نے تمام اختیارات نیلم کو سونپ رکھے تھے۔ اب جب کہ حاشر کا رشتہ طے ہو چکا تھا تو انہیں امید تھی کہ گھر میں ایک اور فرد کے آجانے سے نیلم کا رویہ بھی اطہر کے ساتھ ٹھیک

ہو جائے گا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ نیلم کے دل میں کیا ہے اور آنے والے وقت کے حوالے سے وہ کیا منصوبے بنا رہی ہے۔

☆.....☆

جملہ عروسی میں موجود آڑہ سجاد کو اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ اس کا ہمسفر آن پہنچا ہے۔ بے اختیار اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے کھڑا شخص اپنی تمام تر مردانہ وجاہت کے ساتھ اسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور نازک سا بریسلٹ اس کی نازک کھالوں میں پہنا کر اسے ہمیشہ کے لیے اپنی محبت کا قیدی بنا لیا۔ اس کا حنائی ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر حاشر کئی دیر بیٹھا رہا اور پھر اسے اپنی زندگی کی کچھ اہم حقیقتیں بتانے لگا۔ آڑہ کو اس کی آواز، اس کے الفاظ بہت اچھے لگ رہے تھے اور کچھ لمحوں کے لیے تو وہ اس کی گفتگو کے سحر میں کھوس گئی تھی۔

”آڑہ! میری امی کے جانے کے بعد نیلو بھابھی نے اس گھر کو جنت بنا دیا ہے۔ آپ اگر اس جنت میں رہنا چاہتی ہیں تو آپ کو نیلو بھابھی کو وہی اہمیت دینی ہوگی۔ جو آپ مجھے دیں گی۔ ان کا کہا ہوا ہر لفظ آپ کے لیے حکم کی حیثیت رکھے گا۔“

آڑہ سر جھکائے اپنے ہمسفر کی باتیں سنتی رہی۔ وہ رات ان دونوں کی رات تھی مگر حاشر ایک تیسرے کی باتیں کرتا رہا۔ وہ ساری رات آڑہ کو یہی سمجھاتا رہا کہ اسے نیلو بھابھی کو کتنی اہمیت دینی ہوگی۔ پہلی رات کا دیا ہوا سبق اب آڑہ ساری زندگی نہیں بھول سکتی تھی۔

سجاد احمد کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی کے لیے جب ان کے دوست کے بیٹے کا رشتہ آیا تو انہوں نے رضامند ہونے میں ایک لمحے کی بھی دیر

نہیں لگائی، کیوں کہ وہ محمود شاہ کو بہت سالوں سے جانتے تھے اور ان کی خاندانی شرافت اور وضع داری کے قائل تھے اور انہیں اس بات کا یقین تھا کہ آرزو وہاں بہت خوش رہے گی اور یہی یقین انہوں نے آرزو کے سپرد کر دیا۔ ان کے اسی بھروسے اور اعتماد کی ڈور تھام کر آرزو اپنے گھر سے رخصت ہوئی۔ سجاد احمد کے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی شادی ہو چکی تھی اور سب بچے اپنے اپنے گھروں میں خوش تھے۔ اس خوشگوار زندگی کا سارا گریڈ وہ اپنی بیگم کو دیتے تھے۔ ان کے اچھے رویے کے باعث ان کی کسی بہو کو بھی ان سے شکایت نہیں ہوتی تھی۔ ان کے آگن میں اب پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی چکاریں گونجتی تھیں اور اپنا گھر انہیں کسی جنت سے کم نہیں لگتا تھا۔ آرزو کی رخصت کے بعد وہ دونوں میاں بیوی بہت پرسکون تھے کہ ان کی آخری اولاد بھی بالآخر اپنے گھر کی ہوئی۔ آنے والے دنوں کی تلخیوں سے بے خبر ان کا خاندان زندگی کے خوشگوار لمحوں سے بھرپور طریقے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

☆.....☆

آرزو کو حاشر کی سنگت میں دن گزارتے ہوئے ایک ماہ سے زائد ہو چکا تھا۔ اپنا سسرال اسے کسی وٹڈ لیبڈ کی طرح لگتا تھا اور بعض اوقات سسرالیوں کے عجیب و غریب رویے اسے بہت حیران کر دیتے تھے۔ حاشر اسے ایک نہایت سنجیدہ انسان لگے تھے۔ وہ اکثر اپنے کاروبار میں مصروف رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں شادی کے بعد کہیں گھومنے بھی نہیں جاسکے تھے۔ اس سلسلے میں آرزو نے حاشر سے ایک دو بار بات بھی کی تھی مگر ہر بار حاشر نے اپنی کاروباری مصروفیات کا رونا دیا جس کے باعث اس نے اب اس بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ گھر کے کاموں میں دلچسپی لینا چاہتی

تھی مگر نیلو بھابھی تو اسے کچن میں داخل بھی نہیں ہونے دیتیں تھیں۔ انہوں نے اسے کہہ دیا تھا کہ کم از کم تین ماہ تک وہ گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگائے گی۔ آرزو نے بہت بار کوشش کی کہ وہ کچن میں جا کر ان کی کچھ مدد کر دے مگر نیلو بھابھی ہر بار اسے کسی نہ کسی بہانے سے واپس کمرے میں بھیج دیتیں تھیں۔ بلکہ ایک دو بار تو گھر کے نوکروں کے سامنے بھی وہ آرزو سے سختی سے پیش آتی تھیں۔ نیلو بھابھی کی دو بیٹیاں تھیں جو بالترتیب چھ اور سات سال کی تھیں اور انہما کی شرارتی اور بدتمیز تھیں۔ وہ بھی اکثر آرزو کے ساتھ بہت بدتمیزی سے بات کیا کرتی تھیں۔ آرزو کا دل نہ صرف گھر کے کاموں سے بلکہ اس گھر سے بھی اچاٹ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ نوکری کرنا چاہتی تھی مگر حاشر کے سرد رویے کے باعث ان سے کچھ پوچھتے ہوئے ڈرتی تھی۔ ایک بات اسے بہت حیران کرتی تھی کہ حاشر کی سنجیدگی صرف ان کے کمرے تک محدود تھی۔ جب وہ نیلم کے ساتھ ہوتا تھا تو اس کی شوخیاں عروج پر ہوتی تھیں اور نیلم بھی ہر کام میں حاشر کی پسند و ناپسند کا خیال رکھتی تھی۔ حاشر اپنے تمام کام آرزو کے بجائے اپنی بھابھی سے کروانا پسند کرتا تھا اور یہ سب کچھ وہ آرزو کو شادی کی پہلی رات ہی بتا چکا تھا کہ اسے اپنی بھابھی کے علاوہ کسی کے ہاتھ کا کیا ہوا کام پسند نہیں ہے۔ آرزو نے بہت بار کوشش کی کہ وہ اپنے شوہر کے تمام کام خود سے کرے مگر نہ حاشر اور نہ ہی نیلم کوئی بھی اس کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھا۔

آرزو کو لگتا تھا کہ وہ اس گھر میں صرف ایک ڈیکوریشن پیس کی طرح ہے اور کسی روز جب وہ پرانی ہو جائے گی تو اٹھا کر باہر پھینک دی جائے گی۔ اس کے سسر محمود شاہ صاحب اپنی بیگم کے انتقال کے بعد اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئے

تھے۔ انہیں گھریلو معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس گھر میں آرزو کو سب سے زیادہ مظلوم شخصیت اپنے جیٹھ ڈاکٹر اطہر محمود کی لگی تھی۔ نیلم اس کی دونوں بیٹیاں ڈاکٹر اطہر سے بہت بدتمیزی سے بات کیا کرتی تھیں۔ ان کو ان کے گھروالوں نے شاید پیسے کمانے والی مشین سمجھ رکھا تھا۔ آرزو کو کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ وہ اس گھر کے بڑے بیٹے ہیں بلکہ اسے تو ان کی حیثیت نوکروں سے بھی کمتر لگتی تھی۔ اسے اپنا اور حاشر کے بڑے بھائی اطہر محمود کا دکھ ایک جیسا لگتا تھا بہت بار اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے جیٹھ کے پاس بیٹھے اور ان سے اپنی تنہائیوں کے دکھ بانٹے مگر اس کی ان سے ملاقات ہی نہیں ہوتی تھی لیکن ایک روز اس کی یہ خواہش بھی پوری ہو گئی جب اس نے ڈاکٹر اطہر کے کمرے سے مسلسل کھانسنے کی آواز سنی اور بے اختیار اس کے قدم اندر کی طرف بڑھ گئے۔

حاشر محمود کی زندگی میں دو عورتوں کے کردار کی گہری چھاپ تھی۔ ایک ان کی ماں اور دوسری اس کی بھابھی جنہوں نے اس کی شخصیت پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔ اس کی ماں اس کی بہترین دوست تھیں۔ دوسرے بھائیوں کی نسبت وہ اپنی ماں کے زیادہ قریب تھا۔ بچپن سے لے کر جوانی تک وہ اپنے دل کی ہر ایک بات اپنی ماں سے ہی کیا کرتا تھا۔ اسے اسی بات کا دکھ تھا کہ جب وہ زندگی میں کسی مقام پر پہنچا تو اس کی ماں اسے چھوڑ کر اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئی۔ وہ بہت گم صم رہنے لگا تھا اور خود کو اس نے تنہائیوں کے خول میں بند کر لیا تھا۔ انہی دنوں وہ بیمار ہو گیا۔ اس کی بیماری کے دنوں میں اس کی بھابھی نے حاشر کا اتنا خیال رکھا کہ اسے بعض اوقات شرمندگی محسوس ہونے لگتی کہ وہ ان سے اتنی خدمتیں کر رہا ہے۔ اسے اکثر ڈراؤنے خواب آنے لگے تھے وہ خوابوں میں ڈر

چاہا کرتا تھا۔ اسے سانس کی تکلیف رہنے لگی تھی مگر نیلم حاشر کے لیے ایک مسیحا ہی تھی جس نے دن رات اس کی دیکھ بھال کی اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ دوبارہ سے زندگی کے معاملات میں دلچسپی لینا شروع کرے۔ ان کی توجہ کے باعث وہ زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا وہ اپنی نیلو بھابھی کے بہت قریب ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے دل کی مسند پر ماں کی جگہ اپنی نیلو بھابھی کو بٹھا دیا۔ وہ ان مردوں میں سے تھا جنہیں زندگی کے ہر موڑ پر کسی نہ کسی عورت کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اس کو پہلا سہارا اس کی ماں نے دیا تھا اور پھر نیلو بھابھی نے اس کی بکھری ہوئی شخصیت کو سمیٹا۔ حاشر کو لگتا تھا کہ ان جیسی خاتون دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ جب محمود صاحب نے حاشر سے اس کی شادی سے متعلق بات کی تو اس نے ان سے کہہ دیا کہ سارے اختیارات نیلو بھابھی کے پاس ہیں وہ جس لڑکی پر انگلی رکھ دے گی حاشر اسے اپنی زندگی کی ساتھی بنا لے گا۔ نیلم نے اس کی زندگی کے ہمسفر کے طور پر آرزو کا انتخاب کیا تھا جو بلاشبہ بہت خوب صورت تھی اور اس کو دیکھتے ہی حاشر نے بے اختیار اپنی بھابھی کی پسند کی داد دی تھی۔ آرزو کے زندگی میں آجانے سے اس کو کچھ خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ اب بھی اپنے سارے کام اپنی بھابھی سے ہی کرواتا تھا کیوں کہ کسی اور کے ہاتھ سے کیے ہوئے کام اسے پسند نہیں آتے تھے۔ شادی کو چار ماہ سے زائد ہو چکے تھے۔ اب آرزو کا رویہ اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ اسے اکثر نیلم کچن میں نوکروں سے کام کروانی نظر آتی اور آرزو اپنے کمرے میں آرام کرنی نظر آتی تھی۔ اس نے بہت بار نیلم سے اس سلسلے میں بات کی مگر وہ ہنس کر اس کی بات ٹال دیا کرتی تھی اور اسے منع بھی کرتی تھی کہ وہ آرزو پر گھر کے کاموں کے لیے دباؤ نہ

ڈالے۔ جب اس کا دل راضی ہو گا وہ خود سے سب کچھ کرے گی۔ وہ ان معمولی باتوں کو لے کر اس سے اپنے تعلقات مت خراب کرے۔

نیلو بھابھی کی یہ باتیں سن کر وہ صبح معنوں میں ان کی عظمت کا قائل ہو گیا تھا۔ آرزو آہستہ آہستہ اب اس کے دل سے اترتی جا رہی تھی۔ بات تو وہ پہلے بھی اس سے بہت کم کرتا تھا۔ اب اس نے آرزو کو مخاطب کرنا اور بھی کم کر دیا تھا بلکہ اب تو وہ اپنے کمرے میں بھی بہت لیٹ جاتا تھا۔ اکثر وہ اپنی بھابھی کے ساتھ گھر کے لان میں بیٹھ کر بات گئے تک باتیں کرتا رہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی نیلو بھابھی نے بھی اس کے بھائی اطہر کی عدم توجہی کا شکار ہیں۔ اسے اپنا اور بھابھی کا دکھ ایک ہی لگتا تھا وہ اکثر سوچتا تھا کہ اطہر بھائی اتنی اچھی بیوی سے کیوں بدگمان رہتے ہیں، بہت دفعہ اس کا دل چاہا کہ اطہر بھائی کے پاس بیٹھ کر بات کرے اور ان سے پوچھے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں مگر گھر میں داخل ہوتے ہی نیلو بھابھی کو دیکھ کر اسے سب کچھ بھول جاتا تھا۔ بس اتنا یاد رہتا تھا کہ بھابھی اکیلی ہیں اسے انہیں وقت دینا چاہیے اور بھابھی کے پاس بیٹھتے ہی گویا سارا جہان پس منظر میں چلا جاتا تھا۔ ایسا کیوں ہوتا تھا وہ یہ نہیں جانتا تھا مگر اب ایسا اکثر ہونے لگا تھا۔

اطہر کے کمرے میں داخل ہوتے ہی آرزو کو عجیب سے احساسات نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اسے لگا کہ وہ کسی اداس جنگل میں آگئی ہو جہاں ہر چیز بے ترتیب اور بکھری ہوئی ہو۔ اس کمرے کی ہر ایک شے سے اداسی ٹپک رہی تھی۔ اطہر پریشان حال صورت بنائے اپنے بستر پر لیٹا بہت بری طرح کھائس رہا تھا۔ آرزو نے سب سے پہلے اسے پانی پلایا تو اس کی جان میں جان آئی اور اس نے تشکر آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اپنے سر کی

زبانی وہ جان چکی تھی کہ اس کے جیٹھ ڈاکٹر اطہر بہت بیمار ہیں اور دو دن سے اسپتال بھی نہیں جا رہے۔ اسی لیے ان کی خیریت دریافت کرنے وہ پہلی دفعہ ان کے کمرے میں آئی تھی مگر نیلو بھابھی کے ڈر کے باعث وہ جلد از جلد وہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ اسی لیے دل ہی دل میں بھابھی کے روئے پر لعنت ملامت کرتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل آئی مگر اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ حاشرے سے اس سلسلے میں ضرور بات کرے گی۔ اسے تمام گھر والوں کے رویے پر بہت افسوس ہو رہا تھا۔ کمرے سے باہر نکلنے وقت گھر کے نوکر اسے بہت عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ وہ تو بس اتنا چاہتی تھی کہ اطہر جلد از جلد ٹھیک ہو کر اپنے کام پر واپس جائیں مگر اتنا نہیں جانتی تھی کہ اس ذرا سی دیکھ بھال کی ہزا اسے کتنی بڑی ملے گی۔

☆.....☆

بہت دنوں سے چھانے چھسن کے بعد ہا دل کے چند کٹڑوں نے بالآخر زمین کے چنے چنے کو سیرابی بخش دی تھی۔ گری کے ستارے لوگوں کے لیے بوندوں کے وہ چند موتی ہی اب حیات ثابت ہوتے تھے اور ہلکی ہلکی سی ہوائے موسم کا لطف دو بالا کر دیا تھا۔ حاشرے بھی اسی حسین موسم کا مزہ لینے کے لیے آفس سے ذرا جلدی نکل آیا تھا اور اس لمحے بے اختیار اس کا دل چاہا کہ وہ آرزو کے ساتھ مل کر موسم کے ان سارے رنگوں کو سمیٹ لے اور اسی بے اختیاری کے عالم میں وہ آرزو کو فون ملا بیٹھا اور اسے تیار رہنے کا حکم صادر کر کے اس نے فون بند کر دیا۔ اب وہ گھر کی طرف جا رہا تھا تاکہ آرزو کو ساتھ لے کر وہ اس موسم کا لطف اٹھائے۔ جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا اسے گھر کے لان میں نیلو بھابھی بیٹھی روتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ جلدی سے گاڑی سے اتر اور نیلو بھابھی کی کرسی کے ساتھ

والی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ بھابھی کو اداس دیکھ کر اسے اب اس حسین موسم میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے نشو پیر کا ایک کٹڑا نکال کر ان کی طرف بڑھایا جسے نیلو بھابھی نے لے لیا تھا مگر آرزو پھر بھی ان کی آنکھ کے کناروں کو بھگونے جا رہے تھے۔

”کیا میں ان آنسوؤں کا سبب جان سکتا ہوں؟“ حاشرے نے نیچے گھاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو بارش کے بعد بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

”حاشرے! آرزو کو منع کرو کہ وہ اطہر کے کمرے میں اکیلی مت جایا کرے۔“

اتنا کہہ کر نیلو بھابھی تو اٹھ کر چلی گئیں مگر حاشرے کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور وہ اپنے غصے کو ساتھ لے کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑا، جہاں آرزو بھی ستوری اس کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ سرخ شیٹوں کے ابراہیم ڈسٹ سوٹ میں ہلکی سی جیولری اور نفیس سے میک اپ کے ساتھ وہ غضب ڈھارہی تھی۔ اب اس کی تیاری مکمل تھی۔ انتظار تھا تو صرف حاشرے محدود کا۔

آرزو ابھی آئینے کے سامنے کھڑی بنا قدانہ انداز میں اپنا جائزہ لے رہی تھی کہ اچانک سے کوئی اس کی پشت پر آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ آئینے میں حاشرے کو واضح طور پر دیکھ سکتی تھی۔ وہ اس کے اتنے قریب کھڑا تھا کہ آرزو کو اس کی سانسوں کی آواز تک سنائی دے رہی تھی۔ وہ پیچھے مڑنا نہیں چاہتی تھی کہ شاید کوئی خواب ہو اور وہ پیچھے مڑے تو خواب ٹوٹ جائے۔

اچانک حاشرے نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اپنے سامنے کر لیا۔ وہ واضح طور پر اس کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھنا چاہ رہی تھی مگر حاشرے کی آنکھوں میں اس لمحے آرزو کے لیے محبت نہیں بلکہ نفرت ہی

نفرت تھی۔ آرزو حاشرے کے کندھے پر سر رکھ کر اپنے سارے آنسو بہا دینا چاہتی تھی مگر حاشرے نے بہت بے رحمی سے اسے سامنے پڑے بیڈ کی طرف اچھال دیا۔ وہ بہت زور سے بیڈ پر گری گئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں تھیں کیوں کہ محبت کا خواب ٹوٹ چکا تھا سامنے بہت بھیا تک حقیقت اس کی نظر تھی۔ حاشرے نے اپنا سارا غصہ اس کے اوپر اٹھیل دیا تھا۔ وہ نفرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نہ جانے کیا کچھ بولتا چلا گیا۔ الزامات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ اس کے نام سے منسوب کیے جا رہا تھا۔ اس کی ذات کے نیچے ادھیڑے جا رہے تھے۔ آرزو نے آنسوؤں، آہوں اور سسکیوں کی زبان میں اپنا دفاع کرنا چاہا مگر سامنے کھڑا شخص اس کی کسی بھی بات سے قائل نہیں ہو رہا تھا۔ الزامات کی طویل چارج شیٹ اس کے سامنے پیش کر کے کچھ ہی دیر میں کمرے سے باہر جا چکا تھا اور آرزو اب اس کمرے کی خالی دیواروں کے ساتھ اپنی ذات کی تذلیل پر ماتم کر رہی تھی۔ باہر بارش تیز ہو چکی تھی اور زندگی میں پہلی بار اسے بارش سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

☆.....☆

اطہر کی طبیعت اب دن بدن بہتری کی طرف مائل تھی، اسے پوری امید تھی کہ چند دنوں تک وہ باقاعدہ طور پر اسپتال جانا شروع کر دے گا۔ طبیعت کچھ سنبھلی تو وہ اپنے کمرے سے باہر آیا اور گھر کے لان میں چھل قدمی کی۔ اب وہ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اپنی بیماری کے دنوں میں اسے یاد تھا کہ ایک لڑکی اس کے کمرے میں ایک ہی بار اس کی دیکھ بھال کے لیے آئی تھی مگر اس کے خلوص کی خوشبو سے بہت دن تک اس کا کمرہ مہلکا رہا تھا۔

اچھے لوگ بھی خوشبو کی طرح ہوتے ہیں جہاں



جاتے ہیں اپنے خلوص کے باعث اس جگہ کو معطر کر دیتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد بھی لوگ ان کے اچھے کاموں کی وجہ سے انہیں ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ پر خلوص جذبات کا اظہار آرزو نے اظہر کے ساتھ کیا تھا۔ اسی لیے اظہر آرزو کا شکر یہ ادا کرنے اس کے کمرے میں چلا گیا۔

آرزو اس وقت اپنے کمرے کی ترتیب درست کر رہی تھی، جب اس نے اظہر کو اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا پایا۔ اظہر کو دیکھ کر آرزو کو حاشر کے وہ سارے الزامات یاد آگئے جنہوں نے لمحوں میں اس کو داغ دار کر دیا تھا مگر اس لمحے اس نے خود کو نارمل ظاہر کرتے ہوئے اظہر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ دل ہی دل میں جلد از جلد اس کے جانے کی دعا مانگ رہی تھی۔

”آرزو! میں دراصل تمہارا شکر یہ ادا کرنے آیا تھا۔ تم نے میری خیریت دریافت کی تو میں دل سے تمہارے خلوص کا قائل ہو گیا۔“ اظہر نے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

آرزو نے نہایت غائب دماغی کے عالم میں اظہر کی وہ ساری گفتگو سنی۔ اس کی نظریں مسلسل دروازے کی جانب تھیں اسے لگ رہا تھا کہ دو آنکھیں مسلسل اس کے تعاقب میں ہیں۔

”آرزو! میں دراصل تمہارا شکر یہ ادا کرنے آیا تھا۔ تم نے میری خیریت دریافت کی تو میں دل سے تمہارے خلوص کا قائل ہو گیا۔“ اظہر نے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

آرزو نے نہایت غائب دماغی کے عالم میں اظہر کی وہ ساری گفتگو سنی اس کی نظریں مسلسل دروازے کی جانب تھیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ دو آنکھیں مسلسل اس کے تعاقب میں ہیں۔

”آرزو! کیا تمہیں میرا آنا اچھا نہیں لگا؟“ اظہر نے اس کی نظروں کو کھوجتے ہوئے کہا۔

”نہیں... اظہر بھائی! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بلکہ میں تو حیران ہو رہی تھی کہ آپ میرا شکر ادا کرنے کیوں آئے ہیں۔ آپ میرے بڑے بھائی جیسے ہیں اور میرے لیے انتہائی قابل احترام ہیں اگر آپ کی طبیعت میں نے پوچھ لی نہ تو یہ فرض تھا اور میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے۔ آرزو نے ان کی بات کا جواب دیتے ہوئے اپنے اختیار ان کے چہرے کی طرف دیکھا، تو اسے اظہر بھائی ایک دم بہت معصوم اور نہایت مخلص انسان لگے تھے۔ وہ نیلو بھائی سے بہت مختلف شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی اور حاشر کی آنکھوں کا رنگ ایک جیسا تھا مگر ان کی آنکھوں میں آرزو کو اپنے خلوص نظر آتا تھا جب کہ حاشر کی آنکھیں نفرت سے بھری ہوئی تھیں اور اب تو نفرت صرف ان کی آنکھوں سے نہیں بلکہ اس کے پورے وجود سے چھلکتی تھی۔ اظہر کا ضروری فون آگیا وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا مگر آرزو نے سوچ لیا تھا کہ وہ ان سے بات کرے گی کہ وہ اس کے کمرے میں مت آ کر کریں کیوں کہ اسے لگ رہا تھا کہ کوئی بہت بڑا طوفان آنے والا ہے مگر اسے اپنے گھر کو گرنے سے بچانا تھا۔ وہ اب کچھ دن اپنے ماں باپ کے گھر چلا چاہتی تھی تاکہ وہ کچھ پل سکون سے گزار سکے۔

کہا جاتا ہے کہ مرد کے دل کی سرزمین پر اگر ایک بار شک کا بیج اپنی جگہ بنا لے تو پھر اسے تناور درخت بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ حاشر کے دل میں بھی اب شک کی ننھی ننھی کونپلوں نے اپنی جڑیں مضبوط کرنا شروع کر دیں تھیں اس شک کو یقین میں بدلنے میں نیلو بھائی نہایت اہم کردار ادا کر رہی تھیں۔ اظہر بھائی سے اسے کوئی خاص جذباتی لگاؤ نہیں تھا۔ بڑے بھائی ہونے کی وجہ سے وہ اس کے لیے قابل احترام ضرور تھے مگر اب آہستہ آہستہ وہ احترام بھی ختم ہوتا جا رہا تھا، پہلے ہی

”ای! اس گھر میں مجھے خود سے پانی تک پینے کی اجازت نہیں۔ نیلو بھائی نے پورے گھر پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ مجھے اپنے پاس رہنے دیں۔ ای مجھے ان لوگوں کے پاس دوبارہ نہیں جانا۔“

آرزو یہ سب کہتے ہوئے اپنی ماں کے سینے پر سر ٹکائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر مسز سجاد کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے مگر وہ بے بس تھیں، انہیں زندگی میں پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ بیٹی والے بھی کتنے بے بس ہوتے ہیں وہ چاہیں تو اپنے شوہر اور بیٹوں کو ساری حقیقت بتا کر اپنی بیٹی کو ہمیشہ کے لیے اس اذیت سے نجات دلا دیتیں مگر وہ آرزو کا گھر سنوارنا چاہتی تھیں کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ بیٹیوں کے گھر بنتے بہت مشکلوں سے اور بگڑتے بہت آسانی سے

وہ نیلو بھائی کے آنسوؤں کا سبب صرف اور صرف ان کی ذات کو سمجھتا تھا اور اب تو آرزو کے اور ان کے حوالے سے جو باتیں وہ سن رہا تھا اس کے بعد تو وہ ویسے ہی اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گئے تھے اور اب اسے کچھ کرنا تھا اسے خود کو اور نیلو بھائی کو اس اذیت سے نکالنا تھا۔ نیلو بھائی تو اس اذیت کو جاننے کتنے برس سے جھیل رہی تھیں مگر وہ تو کچھ ماہ سے اس اذیت کا شکار ہوا تھا۔ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ اسے اب سکون چاہیے تھا۔ آرزو نے جب اس سے اپنے ماں باپ کے گھر جانے کی بات کی تو اس نے بخوش اجازت دے دی وہ ویسے ہی آرزو کو اب زیادہ دیر اپنے گھر رکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ آرزو کی قربت اسے سکون نہیں بے سکونی عطا کرتی تھی۔ اسے سکون کے کچھ پل جینے تھے اس لیے بہتر تھا کہ وہ جلد از جلد اس گھر سے چلی جائے۔

☆ ☆

ہیں۔ یہ ریت کے وہ گھر دندے ہوتے ہیں جو ذرا سی آندھی چلنے سے مٹی مٹی ہو جاتے ہیں اس لیے ان کے گھروں کا خیال رکھنا تو اور بھی زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ انہوں نے آرزو کی بڑی بہن سے مشورہ کیا تو انہیں یہی صحیح لگا کہ فی الحال آرزو کو سمجھایا جائے کہ وہ خود کو اس ماحول میں سینٹ کرنے کی کوشش کرے اور حاشر کو سمجھائے کہ وہ اپنا رویہ بہتر کرے اگر اس کی ساری کوششوں کے بعد بھی اس کے سسرال میں سے کسی فرد کا رویہ بہتر نہ ہو تو وہ سجاد صاحب اور اپنے بیٹوں کو ساری حقیقت بتا دیں گی اور اس کے بعد جو کچھ ہوگا اس کی ذمہ داری محمود شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے باقی افراد پر ہوگی۔

آرزو اپنی ماں کی باتیں سن کر بہت حد تک اس بات کے لیے قائل ہو گئی تھی کہ اسے اتنی جلدی مایوس نہیں ہونا چاہیے اور حاشر کے دل میں جگہ بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

مسز سجاد نے آرزو کو بہت حوصلہ دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر آرزو اور حاشر کے بچے ہو جائیں گے تو ان دونوں کے درمیان کینوں کا دورانیہ بھی بہت کم ہو جائے گا اور حاشر کا رویہ بھی آرزو کے ساتھ بہت بہتر ہو جائے گا۔ انہوں نے جب آرزو سے ایسی بات کی تو آرزو خاموش ہو گئی۔ کیوں کہ وہ اس سلسلے میں حاشر کا جواب جانتی تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں ہی حاشر نے آرزو پر نہایت سخت الفاظ میں واضح کر دیا تھا کہ وہ ابھی بچے نہیں چاہتا اور اس معاملے میں وہ آرزو کی کوئی بات سننے کا روادار نہیں تھا۔ حاشر کے اس قدر واضح جواب کے بعد آرزو کے اندر پھر ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ دوبارہ اس موضوع پر بات کرے۔ ماں کے ساتھ چند دن گزارنے کے بعد وہ بہت پر سکون ہو گئی تھی۔ ماں کے چند ڈھارس بھرے

☆ ☆

☆ ☆

☆ ☆



جملوں نے اس کے اندر ایک نئی توانائی بھری تھی اور اب وہ نئے سرے سے اپنی زندگی کی جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

☆.....☆

اپنے حصے کی جنگ لڑنے آرزو اپنے سرال واپس آ تو گئی تھی مگر حالات اس بار پہلے سے زیادہ تکلیف دہ، اذیت ناک اور مشکل تھے۔ اس کے سر بھی اب اس سے بچھے بچھے رہنے لگے تھے اور وہ بے لفظوں میں کئی بار اس بات کا اظہار کر چکے تھے کہ انہیں آرزو کا اپنے ماں باپ کے گھر جا کر رہنا بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اب وہ بھی آرزو کے ساتھ بہت سچ رہنے لگے تھے۔ حاشر کا رویہ ہنوز ویسا ہی تھا اسے آرزو کے آنے یا نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ آرزو نے بہت بار کوشش کی کہ وہ اپنے اچھے رویے سے حاشر کے دل میں اپنے لیے کوئی نرم گوشہ تلاش کرے مگر ہر بار اسے بہت بری طرح دھکارا گیا تھا۔ بلکہ اب تو حاشر کئی دن گھر سے باہر رہتا تھا۔ وہ آرزو کے ساتھ بہت کم وقت گزارتا تھا۔ نیلو بھی کارویہ اس کے ساتھ پہلے سے کہیں زیادہ تلخ ہو گیا تھا۔ اب وہ آرزو کے خلاف کھل کر میدان میں آگئی تھیں۔ آئے روز وہ اس پر کسی نہ کسی چیز کی چوری کا الزام لگا دیتیں اور گھر کے لوگوں کے سامنے اسے ذلیل کرتیں۔ آرزو کا وہ یقین محض چند ماہ میں ہی ڈگمگا گیا تھا کہ وہ اپنے اچھے رویے سے سب کو رام کر لے گی۔ بعض اوقات اچھا بننا ہی ہمارے لیے تکلیف دہ بن جاتا ہے۔ خود کو اذیت سے نکالنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ دوسروں سے ان کی زبان میں بات کی جائے۔ سرال میں آرزو کا اچھا رویہ ہی اس کے لیے وبال جان بن گیا تھا۔ اس کی ماں نے دل چیتنے کے جتنے طریقے اسے بتائے تھے وہ سب اس نے اپنے سرال والوں پر آزما کر دیکھ لیے تھے مگر

ذات کا دکھ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ایسے ہی خود سے لڑتے لڑتے اس کی شادی کو پانچ برس بیت گئے تھے۔

☆.....☆

ان پانچ برسوں کی تلخ زندگی نے آرزو کو کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ اس کی ساری خوب صورتی اب قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ اب تو وہ اپنے انتہائی کمزور اور لاغر وجود کے ساتھ اپنی زندگی کی گاڑی کو گھسیٹ رہی تھی۔ وہ زندگی کے اس انتہائی کڑوے ڈاکٹے کی اس قدر عادی ہو چکی تھی کہ اسے لگتا تھا کہ اب جب کبھی زندگی اس پر مہربان ہوئی تو وہ اس زندگی کو قبول نہیں کر سکے گی۔ اس کی آنکھوں کے گرد پھیلے ہوئے گہرے اور سیاہ حلقے بھی اس بات کی چھٹی کھاتے تھے کہ وہ نہ جانے کتنے برسوں سے ٹھیک سے سو نہیں پاتی تھی۔ اس کے سر کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کے انتقال کے بعد نیلو بھی کو کھل کر کھینے کا موقع مل گیا تھا۔ حالانکہ ان کی زندگی میں بھی آرزو کو ستانے کا کام وہ بخوبی کرتی تھیں مگر ان کے جانے کے بعد تو گویا انہیں لمحہ لمحہ آرزو کو اذیت پہنچانے کا سرکاری اجازت نامہ مل گیا تھا۔ ان کی بیٹیاں اب بڑی ہو رہی تھیں۔ اسی حساب سے ان کی بدتمیزیاں بھی بڑھنے لگی تھیں۔

ان پانچ برسوں میں آرزو اتنا تو جان گئی تھی کہ نیلو بھابھی اور اطہر بھائی دونوں ایک ہی تھالی کے پٹے پٹے ہیں۔ دونوں کا مقصد حاشر کو اپنی منگی میں رکھنا ہے اور ابھی تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب جا رہے تھے۔ اطہر اب اپنا ذاتی کلینک کھول چکا تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی شہرت کے علاوہ اس کا بینک بیلنس بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ جب کہ ان کے مقابلے میں حاشر کا بزنس مسلسل نقصان میں جا رہا تھا۔ محمود شاہ صاحب کے انتقال کے بعد تو حاشر اپنے گرتے ہوئے بزنس کو سنبھال ہی نہیں پایا

تھا۔ اب تو لگتا تھا عنقریب اسے اپنا کاروبار بند کرنا پڑے گا۔ آرزو کے ساتھ حاشر کا رویہ کبھی تو بہت اچھا ہو جاتا اور کبھی وہ ایسے لاتعلقی اختیار کر لیتا، جیسے وہ آرزو کو جانتا ہی نہ ہو۔ آرزو اس کے اس دھوپ چھاؤں جیسے مزاج کی عادی ہو چکی تھی۔ وہ اب اپنے ماں باپ کو بھی کچھ نہیں بتاتی تھی۔ جب کبھی حالات سے گھبرا کر آرزو اپنے ماں باپ کے گھر جاتی تو سب اچھا ہے کی رپورٹ ہی سب کو دیتی۔ پہلے اسے یہ سب کہنا اور سب کے سامنے خوش مزاجی کی اداکاری کرنا خاصا مشکل کام لگتا تھا مگر اب وہ اس کام میں ماہر ہو چکی تھی۔ حاشر اپنے آفس میں اپنے بیٹے رضوان سے اپنے اکاؤنٹس کی پوری تفصیلات لے رہا تھا۔ پے در پے بزنس میں بڑھتے ہوئے نقصانات نے اسے حقیقتاً بہت پریشان کر رکھا تھا۔

”سر! مارکیٹ میں ہماری کمپنی کی ساکھ دن بدن گرتی جا رہی ہے اور کچھ لوگ جان بوجھ کر ہماری کمپنی کو بدنام کر رہے ہیں، کمپنی کے اکاؤنٹس میں رقم دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ کچھ لوگ پیسوں کی خرد برد میں بھی ملوث ہیں۔“ رضوان نے اسے رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔

”مگر..... وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟“ حاشر یہ سن کر حقیقتاً بہت پریشان ہو گیا تھا۔

”میں نہیں جانتا سر! مگر آپ کو محتاط رہنا چاہیے۔“ رضوان نے سر جھکا کر کہا۔

”مگر تم یہ سب کیوں کہہ رہے ہو؟“ حاشر کو اب شمس آ رہا تھا۔

”سر! میں پچھلے پانچ سال سے آپ کے ہاں ملازم ہوں، میں نے آپ کا نمک کھایا ہے مگر اس کمپنی میں بہت سے لوگ اندر ہی اندر آپ کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔“ یہ سب کہتے ہوئے

رضوان کا لہجہ بہت پر اسرار سا ہو گیا تھا۔

”رضوان! پہیلیاں نہ بچھو، مجھے سیدھے اور صاف لفظوں میں پوری بات بتاؤ۔“ حاشر نے ضبط کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ رضوان اب تھوڑا سا سنبھل گیا تھا۔ اس نے حاشر کو پوری تفصیلات بتانا شروع کر دیں اور جیسے جیسے حاشر سنتا جا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کے اندر کسی نے انکارے بھر دیے ہوں یا پھر جلتا ہوا کولہ اس کے سر پر رکھ دیا ہو۔

رضوان کے چلے جانے کے بعد حاشر بہت دیر تک اس کی کئی ہوتی باتوں پر غور کرتا رہا۔

☆.....☆

آرزو کچھ دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ نیلو بھابھی کا رویہ اس کے ساتھ اب کچھ بہتر ہونے لگا ہے۔ ملازمین کو اجازت مل چکی تھی کہ اب وہ آرزو کی کبھی گھریلو کاموں میں کچھ مدد کر دیا کریں۔ اس کے علاوہ وہ گھریلو معاملات میں بھی اس سے مشورے لینے لگ گئیں تھیں۔ یہ سب چیزیں آرزو کے لیے بہت حیران کن تھیں۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی حیرانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کے صبر کا پھل بالآخر اسے مل ہی گیا ہے۔ اطہر اور نیلم اب اکثر اسے اپنے ساتھ شاپنگ پر بھی لے جانے لگے تھے۔ آرزو کے ہونٹوں پر بھی اب مسکراہٹ کے پھول کھلنے لگے تھے۔ اسے اب صرف حاشر کے رویے کے بہتر ہونے کا انتظار تھا۔ وہ اکثر سوچتی تھی کہ نہ جانے وہ دن کب آئے گا جب حاشر اسے ہر جگہ اپنے ساتھ لے کر جائے گا۔ زندگی اپنے مخصوص انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک دن حاشر بہت غصے میں گھر میں داخل ہوا اور اس روز جو کچھ ہوا اس نے آرزو کی زندگی کو مکمل طور پر بدل دیا۔ حاشر ابھی رضوان کے دیے ہوئے جھکے سے

سنجھل نہیں پایا تھا کہ اس کی سیکریٹری نے انٹرکام پر اس کے بڑے بھائی اکبر محمود کے آنے کی اطلاع دی۔ حاشر ابھی کسی سے ملنا نہیں چاہتا تھا مگر اپنے بڑے بھائی کو انکار کرنا بھی مشکل تھا۔ وہ ان کی اس قدر اچانک آمد پر حیران بھی بہت ہوا تھا۔ اس نے اپنی سیکریٹری کو اطلاع دے دی کہ آنے والے ملاقاتیوں کو اندر آنے کی اجازت دے دی جائے۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے بڑے بھائی اکبر محمود اور ان کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ حاشر نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اکبر محمود نے حاشر کا تعارف اپنے ساتھ آنے والے نوجوان سے کروایا اور پھر اس نوجوان کو اشارہ کیا کہ وہ اپنے ساتھ جو لپ ٹاپ لایا ہے وہ اب حاشر کے سامنے کھولے۔ نوجوان نے لپ ٹاپ کھولا اور اس میں سے کچھ فولڈرز اوپن کیے اور پھر وہ کھول کر حاشر کے سامنے رکھ دیے۔ حاشر حیران کن نظروں سے اپنے سامنے ہونے والی یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا مگر جیسے ہی اس نے اس نوجوان کے لپ ٹاپ میں موجود تصویروں کو دیکھنا شروع کیا، اس کا خون کھولنا شروع ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ نوجوان اسے کچھ مزید تصویریں دکھاتا حاشر ایک جھٹکے سے اپنی سیٹ سے اٹھا اور اس نوجوان کو گریبان سے پکڑ کر نیچے گرا دیا۔ حاشر نے اسے مارنا شروع کر دیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے مار مار کر ادھوا کر دے مگر اکبر محمود نے حاشر کو قابو کر کے اس نوجوان کو اس کے ہاتھوں سے چھڑایا۔ حاشر اپنی نشست پر بیٹھ چکا تھا مگر اس کا سانس بہت بری طرح پھول رہا تھا۔ اکبر محمود نے پانی کا ایک گلاس اسے دیا۔ پانی پی کر اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو وہ اس قابل ہوا کہ اکبر محمود کی بات سن سکے۔ اب اکبر محمود بول رہے تھے اور وہ سن رہا تھا۔

جیسا کہ میں نے تمہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی بتایا تھا کہ یہ نوجوان میری بیوی کا بھانجا ہے۔ اس نے کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی ہوئی ہے مگر اس کے باوجود یہ ابھی تک بے روزگار ہے۔ اچھی نوکری کی تلاش میں جب یہ بیٹھ آیا تو ہم دونوں میاں بیوی کے پاس ہی ٹھہر گیا۔ میری بیوی نے اپنی بہن کو یقین دلایا کہ جب تک اس کی اچھی نوکری کا انتظام نہیں ہو جاتا۔ یہ ہمارے پاس ہی رہے گا۔ ویسے بھی ہماری کوئی اولاد تو ہے نہیں۔ اس لیے ہم دونوں نے اس کا اپنے بچوں کی طرح خیال رکھنا شروع کر دیا۔ یہ سچ نوکری پر جانا اور شام کو کمپیوٹر کے ساتھ مل کر کام چلنے کون سے جہانوں کی سفیر کرتا رہتا۔ ایک روز آدھی رات کے قریب مجھے پاس لگی۔ میں پانی پینے کے لیے اٹھا تو دیکھا کہ یہ ابھی تک کمپیوٹر کے ساتھ دل بہلا رہا ہے۔ میں اس کے پاس جا کر اسے منع کرنا چاہتا تھا کہ اب سو جائے رات بہت ہو گئی ہے مگر جیسے ہی میں اس کے قریب گیا تو میں نے اس کے کمپیوٹر اسکرین پر ایک ایسی تصویر دیکھی کہ میرا دل چاہا کہ یہ منظر دیکھنے سے پہلے کاش زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ یہ آرزو ہی تصویر تھی اور ساتھ میں نہایت بے ہودہ انداز میں اس کے ساتھ کوئی لڑکا کھڑا تھا۔ یہ لڑکا کون تھا میں نہیں جانتا تھا۔ میرا بھانجا نہایت مہارت سے ان تمام تصویروں کو جوڑنے میں مصروف تھا۔ میں کچھ دیر تو اس کی بے غیرتی کے مناظر دیکھتا رہا مگر پھر ایک دم میری غیرت کو جوش آیا اور میں نے اپنی بیوی کے اس بھانجے کو گردن سے پکڑا اور نیچے گرا دیا۔ میں بہت بری طرح اسے مار رہا تھا اور وہ زور زور سے چیخیں مار رہا تھا۔ میری بیوی کی آنکھ بھی اس شور سے کھل گئی۔ ساری صورت حال جان لینے کے بعد میری بیوی نے مجھے یہی مشورہ دیا کہ لی

الحال اس سے ان لوگوں کے بارے میں تفتیش کی جائے جنہوں نے اسے اس کام پر لگایا ہے۔ اپنی بیوی کی بات میرے دل کو لگی اور میں نے جب اس سے اس بارے میں بات کی تو مجھے اس نے بتایا کہ وہ دوپہ کے وقت اپنے ایک دوست کے استودیو میں اس کے ساتھ کچھ وقت گزارتا تھا۔ وہیں پر ایک خاتون ان سے ملنے کے لیے آئیں، جن کا نام نیلم تھا۔ ان کے پاس کچھ تصویریں تھیں جو ان کے بقول ان کی ایک دوست اور اس کے ایک کزن کی تھیں۔ وہ خاتون ان تصویروں کو نہایت بے ہودہ انداز میں ایک ساتھ جڑوانا چاہتی تھیں اور پھر ان کی بہت سی کاپیاں بنا کر ایک مخصوص پتے پر بھجوانا بھی چاہتی تھیں۔ ان سب کاموں کے لیے وہ خاتون میرے دوست کو ایک نہایت معقول رقم دینے کے لیے تیار تھیں۔ میرا دوست ان خاتون کی ڈیمانڈ سمجھ گیا تھا۔ ان خاتون نے جانے کے بعد میرے دوست نے میرے ذمے یہ کام لگایا۔ بے روزگاری کے ہاتھوں میں بہت پریشان تھا اس لیے یہ کام کرنے پر تیار ہو گیا اور پھر آگے کی کہانی آپ جانتے ہیں۔

یہ تمام باتیں سننے کے بعد میں نے بہتر یہی سمجھا کہ اسے تمہارے پاس لے آؤں اور اب تمہاری مرضی ہے کہ اس کے ساتھ جو مرضی سلوک کرو۔ اکبر محمود نے یہ سب کہنے کے بعد حاشر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جہاں اضطراب کی کیفیت نمایاں تھی۔ حاشر نے بہتر یہی سمجھا کہ اس نوجوان کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ پولیس کو فون کرنے ہی لگا تھا کہ وہ نوجوان اس کے ہمدردی میں گر گیا۔ وہ رو کر حاشر سے معافیاں مانگ رہا تھا۔ حاشر نے اس کے شرمندہ وجود کو دیکھا اور اسے معاف کر دیا۔ اکبر محمود نے اسے یقین دلایا تھا کہ اب وہ نوجوان اس قسم کی کوئی حرکت نہیں

کرے گا۔ اس نے اپنے فولڈر میں موجود تمام تصویروں کو ڈیلیٹ کر دیا۔ حاشر نے اپنے بڑے بھائی کی یقین دہانی کے بعد اسے جانے تو دیا تھا مگر ان دونوں کے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک سوچتا رہا کہ نیلم بھانجی نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ حاشر کے فیچر رضوان نے تمام آفس ورکرز کے ساتھ میٹنگ کی ان سے بہت سے راز اگلو لیے تھے۔ آفس کے ورکرز نے حاشر کے سامنے ایسے انکشافات کیے جنہیں سن کر اس کی عقل دنگ رہ گئی۔ اب اسے گھر جانا تھا اور وہ ثبوت تلاش کرنا تھا جس کی بنیاد پر وہ نیلو بھانجی اور اطہر بھانجی کی بدعتی سب کے سامنے بے نقاب کر دیتا۔

☆.....☆

حاشر دندنا ہوا گھر میں داخل ہوا اور سب سے پہلے نیلو بھانجی کے کمرے میں ان کی اجازت کے بغیر گھس گیا اور ان کی الماری کھول کر چیزیں ادھر سے ادھر پھینکنے لگا۔ آرزو بھی اس کمرے کے داخلی دروازے پر کھڑی حیران کن نظروں سے حاشر کی اس حرکت کو دیکھ رہی تھی۔ اسے بہت حیرت ہو رہی تھی کہ حاشر ایسا کیا تلاش کر رہا ہے جو اسے نہیں مل رہا۔ وہ اس کا ہاتھ روکنا چاہتی تھی اور اسے کہنا چاہ رہی تھی کہ کسی کے کمرے کی یوں تلاشی لینا بہت بری حرکت ہے مگر حاشر کے غصے کو دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ اطہر اپنے کلیننگ میں تھا جب کہ نیلم نے حاشر کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر حاشر اس وقت کسی کی نہیں سن رہا تھا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد بالآخر حاشر کو اس کی مطلوبہ چند فائلز مل ہی گئیں۔ وہ ان فائلز کو لے کر تیزی سے اس کمرے سے باہر نکلا اور اپنے کمرے میں گھس گیا۔ اس نے ان فائلز کو کھولا اور اس میں سے مختلف کاغذات کو دیکھنے لگا۔ ان کاغذات میں چھپی بہت سی حقیقتیں اس پر آشکار ہو گئی تھیں۔ وہ فائل ایک طرف رکھ کر بیڈ پر بیٹھ گیا

اور اپنا سر پکڑ لیا۔ آرزو نے کھڑکی سے دیکھا۔ وہ رو رہا تھا یا شاید بہت زیادہ رو رہا تھا۔ آرزو نے حاشر کی شخصیت کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا۔ اچانک حاشر اٹھا اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ اسے نیلو بھابھی سے ملنا تھا اور وہ جانتا تھا کہ نیلو بھابھی اس وقت اسے کہاں ملیں گی۔ وہ بہت تیزی سے لان کی جانب جا رہا تھا مگر نیلو بھابھی اسے ڈرائنگ روم کے پاس ہی کھڑی مل گئیں۔ وہ ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ ان فائلز میں جو کاغذات ہیں کیا وہ سب جھوٹ کا پلندہ ہیں۔

”کیا اس کے بزنس میں سے لاکھوں کی خورد برد انہوں نے نہیں کروائی۔“

”یہ گھر جعل سازی سے اپنے نام بھی نیلو بھابھی نے نہیں کروایا؟“ ایسے ہی گتے سوالات اس کی آنکھوں میں تھے۔ وہ نم آنکھوں سے اپنی بھابھی کی جھکی گردن کی جانب دیکھتا رہا۔

”نیلو بھابھی!“ حاشر نے ہمیشہ کی طرح نیلم کو پکارا مگر اس بار اس کی پکار میں اپنائیت نہیں اجنبیت تھی۔ نیلم کو اپنا دل کٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ حاشر کو اس بار پھر کوئی جھوٹی کہانی سنا کر مطمئن کرنا چاہتے تھے مگر الفاظ ان کے حلق سے باہر نہیں نکل رہے تھے۔ یوم حساب آچکا تھا اور فائل کی شکل میں اعمال نامہ بھی ان کے ہاتھ میں پکڑ لیا جا چکا تھا جس میں ان کے اور اطہر کے کالے کرتوتوں کے سبب ثبوت تھے، کچھ کہنے سننے کے لیے شاید کچھ بجا بھی نہیں تھا مگر انہیں اپنے بچاؤ کی کوشش بھی تو کرنی تھی۔ انہوں نے ہمت کر کے حاشر سے کہہ ہی دیا کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ کہتے ہوئے ان کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو انہیں لگا کہ سامنے کھڑے ان کے دیور کی سرخ آنکھیں انہیں جلا کر بھسم کر دیں گی۔ انہیں اپنے دل کی

حالت کا بہت اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ ساحر تھیں۔ بازی پلٹنا جانتی تھیں اس بار بھی انہوں نے بازی پلٹنی تھی مگر ان کا ہر وارنا کام جا رہا تھا۔ حاشران کی کوئی بات بھی سننے کا روادار نہیں تھا۔

”نیلو بھابھی!“ اس نے ایک بار پھر انہیں پکارا۔

”آپ کو پتا ہے آج میری ماں مر گئی ہے۔“

کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ نیلم اس کے پیچھے بھاگتی جا رہی تھی۔ اسے آوازیں دے رہی تھی مگر حاشر اس کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔ حاشر نے اپنے کمرے کے باہر کھڑی آرزو کا ہاتھ پکڑا اور اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ مضبوطی سے بند کر دیا۔ اس لمحے وہ آرزو کے علاوہ کسی سے ہمکلام ہونا نہیں چاہتا تھا۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی حاشر نے آرزو کو پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا۔ وہ اس کے ہاتھ تمام کراہیک جذب کے عالم میں بیٹھا رہا۔ وہ اس کے ہاتھوں کو اپنے چہرے پر رکھ کر رونے لگا۔ آرزو کی میض کے دامن میں اس کے آنسو گر رہے تھے۔ وہ اس کے آنسو صاف کرنا چاہ رہی تھی مگر حاشر اسے یہ موقع دے ہی کہ رہا تھا۔ وہ تو ایک لمحے کو بھی آرزو کو خود سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آرزو نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ جہاں محبت اور چاہت کے رنگ سب سے نمایاں تھے۔ اس نے اپنا سر حاشر کے کندھے سے لگا لیا۔ وہ بھی رونا چاہتی تھی اپنے سارے دکھ ساری تکلیفوں کی داستان اسے سنانا چاہتی تھی مگر صرف ایک لفظ محبت نے حاشر کے سب رویوں کی تلانی کر دی تھی۔ وہ حاشر کے بازوؤں کے گھیرے میں تھی اور آرزو اور حاشر کا یہ کمرہ بھی ان دونوں کے ملاپ پر پہلی بار دل کھول کر مسکرایا تھا۔ وہ دونوں بہت مطمئن اور خوش ہو کر اپنے کمرے سے باہر نکل

آئے تھے۔

نیلم کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح سامنے والا منظر دیکھ رہی تھی۔ جہاں حاشر اور آرزو ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی اور ہی جہان کے مسافر لگ رہے تھے۔ ابھی وہ اس منظر کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی کہ اس کی آنکھوں نے ایک اور منظر دیکھا جب حاشر اور آرزو ایک دوسرے کے سگ بننے مسکراتے اسی کی جانب آ رہے تھے۔ نیلم کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ بھاگ کر اپنے کمرے کی طرف گئی مگر وہ دونوں وہاں پہلے سے موجود تھے، اسے گھر کے ہر کونے میں ان دونوں کا عکس نظر آ رہا تھا۔ وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی مگر سنبھال نہیں پاتی تھی۔ وہ زمین پر گرنا نہیں چاہتی تھی کیوں کہ اس نے تو ہمیشہ دوسروں کو گرتے ہوئے دیکھا تھا مگر اس بار وہ خود کو گرنے سے نہیں بچا سکی اور محض چند لمحوں میں وہ ہوش و جاں کی دنیا سے بیگانگی کے سفر پر گامزن ہو چکی تھی۔ پھر وہی کچھ ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں پولیس وین حاشر کے گھر پر آچکی تھی۔ اس وین میں اطہر ہتھکڑیاں پہنے پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے پولیس اسپتال سے دھوکا اور فراڈ کے کیس میں گرفتار کر چکی تھی۔ اس گھر میں پولیس نیلم کو گرفتار کرنے آئی تھی مگر نیلم کی حالت کے پیش نظر اسے پہلے اسپتال لے جایا گیا، جہاں ابتدائی طبی امداد کے بعد اسے ہوش تو آچکا تھا مگر وہ اپنا ذہنی توازن ہمیشہ کے لیے کھو چکی تھی۔ اس لیے اسے ذہنی امراض کے اسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔

☆.....☆

میرا نام نیلم احسان ہے۔ میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ میرا باپ ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ میرا بچپن دیباہی گزرا جیسے غریبوں کے بچوں کا گزرتا ہے مگر میری ایک عادت تھی میں بچپن سے ہی خواب بہت دیکھتی تھی، جیسے جیسے میں اپنے قلبی مدارج طے کرتی گئی۔ میرے خواب بھی میرے ساتھ جمان ہوتے چلے گئے۔ ان خوابوں میں میرا کردار ایک شہزادی کا ہوتا تھا جو اپنی سلطنت میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتی تھی۔ ان خوابوں کے زیر اثر میرا مزاج بھی بہت شاہانہ ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی کالج کی تعلیم کا ابھی آغاز ہی کیا تھا کہ ایک روز ایک معمولی روڈ ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں میرا باپ اسپتال جانے سے پہلے ہی دم توڑ گیا اور میں اور میری ماں اس ظالم دنیا میں اکیلے رہ گئے۔ باپ کی اس قدر اچانک موت کا صدمہ بہت شدید تھا۔ ابھی میرے باپ کو مرے ہوئے تین دن ہی ہوئے تھے کہ صبح کے وقت ہمارے گھر میں ایک بہت لمبی سی گاڑی میں ایک بہت امیر آدمی

داخل ہوا۔ میری ماں جیسے میرے باپ کی موت کے بعد چپ سی لگ گئی تھی۔ اس شخص کو دیکھتے ہی جیسے میری ماں کے اندر جان آگئی تھی اور وہ اس شخص کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ شخص میرا ماما ہے اور میری ماں نے میرے باپ کے ساتھ بھاگ کر شادی کی تھی۔ وہی امیر لڑکی اور غریب لڑکے کی محبت کا قصہ جو اب شاذ و نادر ہی سننے کو ملتا ہے۔ میرے باپ کی زندگی میں میری ماں کا کوئی رشتہ دار ہم سے ملنے کے لیے کبھی بھی نہیں آیا مگر اب باپ کے مرنے کے بعد اتنے امیر رشتے داروں کا سن کر میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اگلے چند دن ہمارے گھر ماموں نہ صرف خود آتے رہے بلکہ ان کے ساتھ ان کے بیٹے بھی چکر لگاتے رہے۔ ہاں البتہ ممانی نہیں آئیں شاید وہ ہم سے ملنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ماموں مجھے اور میری ماں کو اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتے تھے مگر میری ماں اس کے لیے راضی نہیں تھی۔ اسی طرح چند مہینے گزر گئے۔ ایک روز میری ماں کے سر میں شدید درد اٹھا اتنا شدید کہ وہ بے ہوش ہو گئی میں نے ماموں کو فون کر دیا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں میری ماں شہر کے بہترین اسپتال میں موجود تھی مگر یہ بہترین اسپتال، بہترین ڈاکٹر زبھی میری ماں کو نہیں پچا سکے اور وماغ کی شریان پھٹنے کے نتیجے میں میری ماں بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئی اور باپ کے بعد ماں کا سایہ بھی میرے سر سے اٹھ گیا۔ ان دنوں میں ہر وقت روتی رہتی تھی۔ ماموں مجھے میری ماں کی تدفین کے بعد اپنے گھر لے آئے تھے اور اس وقت مجھے بھی یہی صحیح لگا تھا کہ میں ماموں کے ساتھ چلی جاؤں۔ میری ماں کا رویہ میرے ساتھ بس لیے دیئے والا ہی تھا۔ ان دنوں آدھی آدھی رات تک ماموں اور مانی کی بحث ہوتی رہتی تھی۔ پھر ایک دن اچانک مجھے پتا چلا کہ چند دن

بعد میرا نکاح ماموں کے درمیان والے بیٹے اطہر سے ہونا طے پایا ہے جو کہ ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر ہے۔ مجھے اپنی قسمت پر تو یقین تھا مگر اتنی جلدی میری قسمت مجھ پر مہربان ہو جائے گی یہ تو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ پھر قسمت مجھ پر مہربان ہوئی گئی۔ میرا نکاح ڈاکٹر اطہر کے ساتھ ہو گیا۔ چند دن بعد ایک مختصر سی ویسے کی تقریب میں باقاعدہ طور پر خاندان والوں کے سامنے بھی ہمارے رشتے کی رونمائی ہو گئی۔ زندگی بہت خوب صورت ہو گئی تھی مگر ابھی میرے خواب کہاں پورے ہوئے تھے، ابھی تو مجھے اس راجدھانی میں اکیلے راج کرنا تھا۔ میرے جیٹھ اور جھٹانی مجھے کسی بوجھ کی طرح لگتے تھے اور میرا دل چاہتا تھا کہ اپنے جیٹھ جھٹانی اور ساس کو سب سے پہلے اس گھر سے نکالوں۔ اطہر بہت اچھے تھے اور وہ ہر بات میں میری ماں میں ہی ملایا کرتے تھے۔ میرا ایک دیور بھی تھا مگر وہ اپنی تعلیم کے سلسلے میں ملک سے باہر تھا۔ صرف شادی پر چند دن کے لیے آیا تھا۔ اپنی شادی کے کچھ عرصے تک تو میرے اپنی ساس اور جھٹانی کے ساتھ تعلقات ٹھیک رہے مگر پھر ہمارے جھٹھے ہونے لگے۔ معمولی معمولی باتوں پر اکثر ہماری تلخ کلائی ہو جاتی تھی۔ میری ساس دل کی مریض تھیں اور ایک روز اسی طرح میزے ساتھ ان کا بہت شدید جھٹکا ہوا۔ ان کے سینے میں درد اٹھا۔ انہیں اسپتال لے کر گئے مگر وہ جانبر نہ ہو سکیں۔ مجھے اپنی ساس کے مرنے کا بہت افسوس تھا مگر میں یہ سمجھتی تھی کہ اگر وہ میرے ساتھ تعاون کرتیں تو شاید یہ سب نہ ہوتا۔ ساس کے مرنے کے چند دن بعد ہی میرے جیٹھ اور جھٹانی نے بھی اپنا سامان باندھا اور اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔ حالانکہ میں نے تو انہیں نہیں کہا تھا تا کہ اس گھر کو چھوڑ دیں۔ ساس کے مرنے کے بعد میرا

دیور بھی بیرون ملک سے ہمیشہ کے لیے پاکستان آ گیا تھا۔ اس کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی اور اب میرے سر کا ارادہ اسے پاکستان میں ہی کاروبار کرانے کا تھا اور اس سلسلے میں وہ ایک آفس بھی لے چکے تھے۔ میرا دیور حاشرا اپنی ماں کے مرنے کے بعد بہت افسردہ رہتا تھا۔ میں نے اس کی دلجوئی کی اور اسے سہارا دیا۔ ان دنوں وہ بہت بیمار رہنے لگا تھا۔ ایسے موقع پر میں نے اس کی بہت خدمت کی۔ میں یہ احسان کر کے اس کے دل میں یہ احساس اجاگر کرنا چاہتی تھی کہ میں اس کی بہت ہمدرد ہوں۔ اس پورے گھر میں اطہر کی ترقی کا خوب چرچا تھا اور اسی وجہ سے گھر کے ملازمین بھی مجھ سے دبتے تھے۔ میرے سر میری ساس کے مرنے کے بعد اب زیادہ گھر کے کاموں میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔ میری ہمدردی اور دلجوئی کا نتیجہ یہ نکلا کہ حاشرا میرے قریب ہوتا چلا گیا اور میں تو یہی چاہتی تھی کہ وہ مجھ پر اعتماد کرے اور ہر معاملے میں میرا محتاج ہو جائے۔ میں اس سلسلے میں اطہر کو پہلے ہی اعتماد میں لے چکی تھی۔ انہی دنوں میرے ہاں اوپر تلے دو بیٹیوں کی ولادت ہوئی۔ میرے جیٹھ کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی اور ماں بننے کے بعد اس گھر میں میری اہمیت میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ میں اپنی بچیوں کو اپنی طرح پر اعتماد بنانا چاہتی تھی۔ اس لیے ان پر بے جا قسم کی روک ٹوک پر میں نے پابندی لگائی ہوئی تھی۔ اس لیے میری بیٹیاں بہت بڈر اور بے باک ہو گئی تھیں۔ پورے گھر پر عملاً میرا راج قائم ہو چکا تھا۔ حاشرا میرے آگے پیچھے پھرتا تھا۔ اطہر کی جرات نہیں تھی کہ وہ میرے آگے بات کر سکیں۔ اس لیے راوی جین ہی چین لکھ رہا تھا کہ اچانک میرے سر کو میرے دیور کی شادی کا شوق جڑھ گیا۔ حاشرا کا کاروبار بہت اچھی طرح سیٹ ہو چکا

تھا۔ میرے سر نے حاشرا کی شادی کے لیے اپنے دوست کی بیٹی آرزو کا انتخاب کیا تھا۔ میری آرزو سے ایک ملاقات ہو چکی تھی اور وہ مجھے بہت ڈری سمجھی اور گھبرائی ہوئی لڑکی لگی تھی۔ مجھے حاشرا کے لیے ایسی ہی لڑکی کی تلاش تھی۔ حاشرا نے ویسے بھی سارے اختیارات مجھے سونپ رکھے تھے۔ میرا تو خیال تھا کہ حاشرا کی شادی نہ کی جائے مگر اپنے سر کے آگے اس قسم کی بات کر کے میں خود کو ان کی نظروں سے گرانما نہیں چاہتی تھی اسی لیے حاشرا کے لیے اس رشتے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ کچھ ہی ہفتوں بعد آرزو سجاد اس گھر میں دلہن بن کر آ گئی۔ حاشرا کا آرزو کے ساتھ رویہ شروع دن سے ہی بہت اجنبی تھا اور یہی بات میرے اطمینان کے لیے کافی تھی۔ وہ وقت جو اسے اپنی بیوی کو دینا چاہے تھا۔ وہ وقت حاشرا میرے ساتھ گزارتا تھا اور میں کسی نہ کسی انداز میں اس پر یہ باور ضرور کروا دیتی تھی کہ آرزو انتہائی لا پرواہ ہے اور گھر کے کسی کام میں دلچسپی نہیں لیتی۔ کوئی بیوی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کا شوہر اس کے ساتھ وقت گزارنے کی بجائے کسی اور کے ساتھ وقت گزارے میرا خیال تھا آرزو چند دن بعد ہی یہ گھر چھوڑ کر چلی جائے گی مگر وہ تو بہت ہی سخت جان واقع ہوئی تھی۔ انہی دنوں اطہر بیمار ہو گئے اور میرے شاطر ذہن نے ایک ایسی ترکیب سوچی جس کے بعد مجھے پورا یقین تھا کہ آرزو یہ گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔ اطہر کی خیریت پوچھنے کے لیے آرزو ان کے کمرے میں گئی اور وہیں سے میں نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ گھر کے نوکروں کے سامنے میں نے یہی ظاہر کیا کہ آرزو میرے شوہر کی خیریت پوچھنے نہیں بلکہ اس سے ملنے لگی ہے۔ اگلے روز حاشرا کے سامنے یہ بات کر کے میں نے مزید آگ لگا دی اور پھر وہی ہوا جیسے میں چاہتی

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## پہلے پاکستان سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### عام غائب کیوں ٹھیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای ٹیک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہیر ای ٹیک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای ٹیک کا پرنٹ پر یو ایچ
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور معنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں، ہری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں [www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook [fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)

سے نکالیں اور ایک کمپیوٹر گرافکس کے ماہر سے ان تصویروں کو کچھ اس انداز سے جڑوایا جس سے مجھے یقین تھا کہ وہ دیکھتے ہی حاشر آرزو کو طلاق دے دے گا۔ آرزو نے اپنے اس کزن کے بارے میں ایک بار سرسری انداز میں بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ کا ارادہ پہلے اس کی شادی اس کے اسی کزن سے کرنے کا تھا مگر پھر حاشر کا رشتہ آگیا اور وہ بات ختم ہو گئی مگر میرا ارادہ تھا کہ اس بات کو ختم نہ کیا جائے اور آرزو کو اس گھر سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا جائے۔ سب کچھ میری مرضی کے مطابق ہی ہو رہا تھا کہ اچانک حاشر کے فیجر رضوان نے میرے ایک منصوبے کو خاک میں ملادیا اور سونے پہ سہاگہ آنکھ کے ورکرز نے بھی حاشر کے سامنے سارا سچ اگل دیا اور پھر حاشر کے بڑے بھائی اکبر محمود نے بھی تصویروں والا سارا منصوبہ اس کے گوش گزار کر کے مجھ سے انتقام لے لیا۔ میرے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہ کمپیوٹر گرافکس کا ماہر اکبر محمود کا بھانجا نکل آئے گا۔ حاشر اپنے تمام تر ثبوتوں کے ساتھ میرے سامنے کھڑا تھا۔ وہ حاشر جو میرے سامنے اپنی زبان تک نہیں کھولتا تھا۔ اس روز اپنا تمام تر بوجھ مجھ پر انڈیل رہا تھا۔ وہ اپنی آرزو کے سنگ مسکرا رہا تھا۔ اس کے دل میں آرزو کے لیے جتنی بھی عداوت تھی وہ سب ختم ہو چکی تھی۔ میرے لیے یہ سب ناقابل برداشت تھا۔ اطہر کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ غصے اور صدمے کی وجہ سے میرے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ اب میں بہت دنوں سے ذہنی امراض کے اس اسپتال میں ہوں۔ کبھی کبھی آرزو میری بیٹیوں کو مجھ سے ملانے کے لیے لے آتی ہے۔ میں ان کو دیکھ کر روتی رہتی ہوں مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ نفرت، غصے اور انتقام کے مارے لوگ اسی جگہ پر آتے ہیں جہاں میں موجود ہوں۔

تھی۔ آرزو پہ گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ میں سبکدوش تھی اور اب میرا نہیں خیال تھا کہ وہ واپس آئے گی۔ میں نے اپنے سر اور حاشر کے سامنے آرزو کا ذکر بہت منفی انداز میں کیا جس سے ان کے دل مزید بددل ہو گئے تھے۔ آرزو کے بارے میں میرا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ ایک جھٹے بعد ہی واپس آگئی تھی اور واپس آکر وہ اور زیادہ پر اعتماد لگ رہی تھی۔

آرزو کو اسی طرح دوبارہ دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ میں نے اب اسے ہر طرح سے زچ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا وہ اعتماد تو چند دن میں ہی ختم ہو گیا تھا اور وہ پھر سے دہی ڈری اور سبھی ہوئی آرزو بن گئی تھی۔ اب کی بار میرے سر کی ہمدردیاں بھی اس کے ساتھ نہیں تھیں۔ کیوں کہ میں پہلے ہی ان کے کان آرزو کے خلاف بہت بھرپور تھی۔ آرزو اس محاذ پر اکیلی تھی۔ کچھ ہی عرصے بعد میرے سر کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد اب میرے اور اطہر کے ایک اور منصوبے کا آغاز ہو گیا۔ ہم معاشی طور پر بھی حاشر کو بہت نیچے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے اس کے دفتر کے کچھ لوگوں کو ساتھ ملا کر ہم نے اس کی کمپنی کی ساکھ کو خراب کرنا شروع کر دیا۔ اکثر دوسرے ممالک میں وہ جو اشیاء بھیجتا تھا وہاں سے اصلی چیزیں غائب کر دیا اور دو نمبر مال رکھنا شروع کر دیا۔ کمپنی کے اکاؤنٹ میں سے بہت سی رقم ہم نے غائب کر دیا اور شروع کر دی۔ ایسے بہت سے کام ہم دونوں نے کیے جس سے حاشر کو کاروبار میں بے انتہا نقصان اٹھانا پڑا اور وہ اکثر میرے پاس بیٹھ کر اپنے کاروباری نقصان کا رونا رہتا تھا۔ حاشر آرزو سے بددل ضرور تھا مگر وہ ابھی تک اس کے ساتھ تھی اور یہ چیز میری برداشت سے باہر تھی۔ اسی لیے میں نے اس کی اور اس کے ایک کزن کی تصویریں اس کے شادی کی الہمز میں



## اظہارِ حیرت

مغرب کی سمت سے اٹھنے والی کالی گھٹاؤں نے  
ون کے اچالے کو اندھیروں میں بدل دیا تھا اور  
آفتاب کا چمکتا دمکتا آگ برساتا چہرہ بادلوں کی  
نقاب میں الہر دوشیزہ کی طرح روپوش ہو گیا تھا۔ قینا



کہیں بارش ہوئی تھی کیونکہ ہواؤں میں کچی مٹی کی  
سوندھی سوندھی خوشبو اور بارش کی مہک رچی ہوئی  
تھی۔

بڑی بیگم نے آج سب کو اپنے کمرے میں بلایا  
تھا۔

”تم لوگ خاموش کیوں ہو؟ کیا تمہیں اپنے  
بچے کی آمد اچھی نہیں لگی؟“

”نہیں اماں جان ایسی کوئی بات نہیں۔“  
آصف اور داحف ایک ساتھ بولے۔

”دیکھو بیٹا! وہ شفقت سے گویا ہوئیں۔  
”تمہارا بھتیجا حزرہ اپنوں میں پہلی مرتبہ پاکستان  
آ رہا ہے اس نے روڈ ایکسپریٹ میں اپنے والدین  
اور میں نے اپنا ہونٹا کھودیا اگر وہ زندہ ہوتے تو میں  
تم سے کچھ نہیں کہتی کہ مرحوم بھائی کی نشانی کا خاص  
خیال رکھنا۔ اس کو یہ احساس نہ ہونے دینا کہ وہ بے  
یار و مددگار ہے۔“ ان کی آواز بھرا گئی۔

”اماں جان! آپ اطمینان رکھیے۔ آپ کو کچھ  
بھی کہنے کی ضرورت نہیں لیکن اتنا بتا دوں کہ وہ لاکھ



ہمارا اپنا کسی لیکن اپنی کی ماں کی وجہ سے وہ ہماری اولادوں کی برابری نہیں کر سکے گا۔  
 بڑی بیگم کی پیشانی پر سلوٹس پڑ گئیں۔

”آج تو یہ کہہ دیا ہے آئندہ ست کہتا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ تمہارے باپ کی وجہ سے میں مجبور تھی لیکن آج میں صاف صاف کہتی ہوں کہ مجھے تمہارے باپ کے خو و ساختہ اصولوں سے اختلاف تھا ہے اور رہے گا۔ ذات پات حسب نسب یہ سب زمانہ جہالت کی باتیں ہیں ہمارے نئی نے تو خود اپنے خاندان میں حضرت بلالؓ کی شادی کی تھی۔ کہاں وہ اعلیٰ نسب اور کہاں ایک ادنیٰ غلام اور پھر دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ یہ بھی اسلام کی آفاقت اور عصیت سے پاک معاشرے کی بنیاد ہم خود کو بڑے فخر سے مسلمان کہتے ہیں مگر کوئی ایک خوبی ہے ہم میں مسلمانوں والی؟ شرابی، جواری، آسٹگر اور دل کھول کے عیاش۔ لیکن جہاں شادی بیاہ کی بات آنے لگے حسب نسب کی کسوٹی پر پرکھنے لگے یہ جانے بغیر کہ کردار کیسا ہے؟ چال چلن کی کیا حالت ہے۔“

دونوں بیٹے منہ بناتے ہوئے باہر نکل گئے جبکہ بڑی بیگم کی اکلوتی بیٹی زویا اور ان کے میاں عبید نے انہیں گلے لگا کر تسلی دی۔ عبید خان کہنے کو تو ان کے داماد تھے لیکن بیٹوں سے بڑھ کر۔ ان کے دست راست رفاقت علی خان نے ایسے ہی تو اپنی اکلوتی بیٹی کے لئے انہیں پسند نہیں کیا تھا۔ وہ ان کی فیکٹری میں فیجر کے عہدے پر فائز تھے۔ بے حد نیک، ایماندار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ چترے چھانٹ ماں باپ کا انتقال ہو چکا تھا اور حسب و نسب میں وہ رفاقت علی خان سے کم نہ تھے خود رفاقت علی خان نے جب انہیں اپنی فرزندگی میں لینے کی پیشکش کی تو وہ ہچکچاہٹ کا شکار ہو گئے۔ انہیں گھر داماد بننا پسند نہیں تھا لیکن رفاقت علی خان کے یقین دلانے پر کہ ان کی بیٹی زویا کا پورشن تینوں بھائیوں سے الگ ہے وہ راضی ہو گئے۔ وہ زویا

کو دیکھ چکے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ رفاقت علی خان لاکھ ہا اصول اور سخت گیر کسی لیکن بیٹی میں ان کی جان ہے۔ پھر عبید خان نے ثابت کر دیا کہ رفاقت علی خان کا انتخاب فلفظ نہیں تھا۔ انہوں نے عبید خان کی شکل میں ہیرا چننا تھا۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی وفا۔ کچھ اندرونی پیچیدگیوں کے باعث زویا دوبارہ ماں نہ بن سکیں جس کا انہیں بے حد دکھ تھا لیکن عبید خان اس پر صابر و شاکر تھے کہ اللہ اگر بیٹی بھی بند دیتا تو ہم کیا کر لیتے یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے اولاد دے دی۔ زویا اپنی کا پر تو تھی بے حد منکسر المزاج اور شہدے و ماغ کی جبکہ وفا اس کے بالکل الٹ تھی۔

خدا جب حسن دیتا ہے نراکت آ ہی جانی ہے  
 ماں باپ کے لاڈ پیار اور نانا نانی کے چوچلوں نے اسے خود پسند اور مغرور بنا دیا تھا۔ وہ اپنے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتی تھی۔ اس کی خود سری اور اڑکڑ کے سامنے کسی کو چوں کرنے کی مجال نہیں تھی۔ پھر اس پر طرہ امتیاز کہ وہ بے حد خوبصورت تھی۔ زویا نے اسے حزرہ کے بارے میں بتایا۔

”بیٹا! حزرہ کے ابو کاشف تمہارے ناموں میرے سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ بے حد خوبصورت ذہین اور عاجز، سوائے عادتوں کے تمہاری شکل کا کافی اپنے ماموں پر ہے۔“

”میری عادتوں کو کیا ہوا؟“ وفا ٹک کر بولی۔  
 ”خود ہی دیکھ لو ایک جملہ کہنے سے کیسے بھڑک اٹھیں، جبکہ تمہارے ماموں حد سے زیادہ دھیمنے اور نرم مزاج تھے۔ گھر کے نوکر اس طرح ان سے کھلے ملے رہتے تھے جیسے وہ ان کے برابر ہوں یوں تو ابا انہیں بہت چاہتے تھے لیکن ای ایک نکتے پر ان کے درمیان اختلافات بھی بہت تھے تمہارے ماموں کو غریبوں کے ساتھ ان کی بدکلامی، گالم گلوچ اور سختی پسند نہ تھی۔ ابا کو شوق تھا کہ ان کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں مگر

تمہارے دونوں ماموں کتابوں سے ایسے بھاگتے تھے جیسے کو اسبرے۔ نتیجتاً دونوں ماموں میٹرک سے آگے نہ پڑھ سکے جبکہ تمہارے کاشف ماموں نے LUMS یونیورسٹی سے پڑھا تھا ابا کو ان پر فخر تھا مگر یہ غرور و فخر اس وقت خاک میں مل گیا جب تمہارے ماموں ایک غریب کسان کی لڑکی کو اپنی بیوی بنا کر گھر لے آئے۔ انہوں نے بتایا کہ ”کلوٹم ان کی کلاس فیلو تھی۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی بے حد ذہین و فطین ہر سال LUMS یونیورسٹی گاؤں گاؤں جا کر غریب بچوں کے انڈر یوکتی ہے کہ شاید کہیں گذری میں گل چمپا ہو۔ کلوٹم انٹر کر چکی تھی اس کی ذہانت سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ نہ صرف اس کو داخلہ مل گیا بلکہ اس کا لرشپ بھی مگر گاؤں کے ڈیرے کو جس کی اس پر بری نظر تھی یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی۔ پہلے تو اس کا رشتہ دیا پھر اغوا کی دھمکی۔ تمہارے ماموں اس کی من موہنی صورت اور ذہانت سے پہلے ہی متاثر تھے مگر اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ کلوٹم سے نکاح کر لیں۔ ان کو تمہارے نانا نانی سے اجازت لینے کی مہلت بھی نہیں ملی اور جنب انہوں نے یہ سب بتایا تو اماں نے تو فوراً کلوٹم کو گلے لگا لیا لیکن ابا آپے سے باہر ہو گئے ان کے ذات پات حسب نسب اور خاندانی رکھ رکھاؤ کے اصول اتنے شدید تھے کہ بات بات پر گولیاں سینے کے پار ہو جاتیں، بے گناہوں کے خون سے زمین سرخ ردا اوڑھ لیتی اور کوئی دم نہ مارتا، دونوں بھائی تو پہلے ہی اس کی ذہانت اور مقبولیت سے خار کھاتے تھے۔ انہیں بھی کبھی میں چنگاری ڈالنے کا موقع ملا۔ انہوں نے ابا کو خوب بجز کایا اور وہ مارنے مرنے پر تل گئے میں نے اور تمہارے ابا نے بڑی مشکل سے تمہارے نانا کو قابو کیا۔ پھر کاشف بیوی کو لے کر کہاں چلا گیا پتہ ہی نہیں چلا کیونکہ ابا کے پالتو کتے مہ تمہارے ماموں کے اس کی بوسہ لگتے پھر رہے تھے۔ تمہارے نانا ایک

سخت مزاج انسان تھے مگر اولاد تو اچھے اچھوں کا دم خم نکال دیتی ہے تمہارے نانا کو یہ صدمہ لے ڈوبا ان کی زندگی نوحہ بن کر رہ گئی لیکن ابا جان کی وفات کے بعد اماں جان نے بھی کبھی کاشف کا گھر میں ذکر نہیں کیا پھر اڑنی اڑنی خبر ملی کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ لندن شفٹ ہو گیا۔ عرصہ دراز تک ہمیں کاشف کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلا پھر گزشتہ سال ایک دوست نے اطلاع دی کہ دونوں میاں بیوی ایک روڈ ایکسٹنٹ میں اکلوتا بیٹا حزرہ چھوڑ کر جاں بحق ہو گئے۔ عرصہ سے اماں نے بیٹے کا منہ نہیں دیکھا تھا مگر خوش تھیں کہ جہاں رہے خوش آباد رہے۔“ اس خبر نے تو انہیں جیسے زندہ درگور کر دیا وہ اب صرف اپنے بھرم میں جی رہی ہیں ورنہ اندر سے بالکل ختم ہو چکی ہیں لیکن حزرہ کی آمد نے انہیں پھر سے زندہ کر دیا ہے۔ بیٹی تم حزرہ کا بہت خیال رکھنا کیونکہ تمہارے ماموں سے تو مجھے کوئی امید نہیں شاید خون سفید ہونا سے ہی کہتے ہیں۔“

نانی اماں کی آواز سے گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

”زویا بیٹی! خانساں سے کہو دو چار خاضی ڈشز بنالے آخر میرا پوتا آرہا ہے۔“

”نانی اماں! آپ حزرہ کو پہچانیں گی کیسے؟“ وفا نے شرارت سے کہا۔  
 ”پہچانیں گی۔“ وہ ہنسنے لگیں۔  
 ”میرا خون ہے میرے کاشف کی اولاد کیسے نہیں پہچانوں گی؟“  
 اور بھردہ آ گیا جس کا سب کو شدت سے انتظار تھا۔  
 عبید خان خود سے سائز پورٹ سے لے کر آئے تھے۔  
 ”میرا بچہ!“ دادی بانہیں پھیلا کر آگے بڑھیں اور وہ ان کی کھلی بانہوں میں سما گیا۔ دونوں بری طرح رور رہے تھے۔  
 ”اماں! یہ تو بالکل کاشف ماموں کی ڈیو کاپی



ہے۔“ وقاف نے سرگوشی کی کیونکہ اس نے ماموں کی تصویریں ماں کے پاس دیکھی تھیں۔ بڑے ماموں کے بیٹے فہد نے انہیں ایک دوسرے سے جدا کیا۔

”یہ فاول ہے دادی اماں! خوشی کے موقع پر آسو!“ فہد نے ہنس کر کہا اور اپنی گیلی آنکھیں ہتھیلی سے صاف کرنے لگا۔

فطر کا فہد اپنے باپ سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی کافی عادتیں اپنے ماموں جیسی تھیں اور وفا کے بعد بڑی بیگم سب سے زیادہ اسی کو چاہتی تھیں۔

”فہد بیٹا! تمہارے ابا اور چچا نہیں آئے؟“

بڑی بیگم کو دکھ کے ساتھ ساتھ ندامت بھی تھی پھر دونوں ماموں بھی آگئے۔ حمزہ بڑی گرجوشی سے ملا مگر دوسری طرف یہ گرجوشی منقو وہی۔ ان کا انداز بیگانہ اور سرد مہر تھا۔ جسے حمزہ نے محسوس ہی نہیں کیا۔ فہد حیرت سے سوچ رہا تھا۔

”آخر ابا اور چچا کو حمزہ کے آنے کی خوشی کیوں نہیں ہو رہی خون ہے وہ ان کا!“

مگر اس پاگل کو یہ پتہ نہیں تھا کہ دولت خون کے رشتوں میں دراڑ ڈال دیتی ہے۔

بڑی بیگم نوکروں کے ساتھ کاشف کے پورشن میں رہتی تھیں، جس پر دونوں بھائیوں کی نظر تھی اور اب یہ پورشن یقیناً حمزہ کو ملنے والا تھا۔

”دادی جان!“ حمزہ احترام کے ساتھ دادی سے مخاطب ہوا۔

”مجھے اجازت دیجئے۔“

”کس بات کی اجازت؟“

”میں نے ہوٹل میں کمرہ بک کر لیا ہے آپ سب سے ملنا مقصود تھا کیونکہ ابونے مرنے سے پہلے وعدہ لیا تھا کہ میں ایک مرتبہ آپ سب لوگوں سے ملنے ضرور آؤں گا اور مجھے اس وعدے کی تکمیل کرنی تھی۔“ وہ نرمی سے بولا اور اپنی بھرائی ہوئی آواز پر کنٹرول کرنے لگا۔

بڑی بیگم بری طرح رو پڑیں۔ ”نہیں بیٹا! اب جانے کا نام نہ لینا ورنہ تیری دادی مر جائے گی۔ مجھے تیری شکل میں اپنا کاشف نظر آ رہا ہے وہی قد بت وہی انداز گفتگو۔ جب تک میں زندہ ہوں مجھے چھوڑ کر مت جانا میرے لعل.....!“ وہ اس کو دیوانہ وار چومنے لگیں۔

”یار نہیں بھی تھوڑی دیر خوش ہو لینے دو کیونکہ تمہارے آنے سے ہماری ویلیو تو ویسے ہی ڈاؤن ہو گئی ہے لیکن تمہاری شکل میں ایک اچھا دوست ضرور مل گیا ہے۔“ فہد نے خلوص سے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا پھر وفا کی طرف دیکھتے ہوئے شرارت سے بولا۔

”یہ ہیں ہمارے گھر کی اکلوتی بیٹی پھوپھی اماں کی صاحبزادی وفا۔ نام پر نہ جانا بے وفائی ان کی فطرت میں ہے۔ ناک پر بھی نہیں بیٹھنے دیتیں۔ بہت نیک چڑی ہیں۔“ فہد کے انداز پر سب ہنسنے لگے اور وہ غصے میں بھنا کر واک آؤٹ کر گئی۔

☆.....☆

اپنوں میں آ کر وہ خوشی سے پاگل ہو رہا تھا گو دونوں چچاؤں کے خشک رویے سے وہ بدل ضرور ہوا تھا لیکن مایوس نہیں کیونکہ سب ہی لوگ پیار کرنے والے تھے پھوپھی، پھوپھا، دادی اور فہد جس کی محبت اور خلوص کا وہ دل سے محترف تھا۔

بڑی بیگم نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کاشف کا پورشن اب حمزہ کا ہے اور وہ اب وہیں رہے گا۔ دونوں بھائی جربز تو بڑے ہوئے کیونکہ دونوں ہی کی سرشت میں خود غرضی اور لالچ کوٹ کوٹ کر بھری تھی یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ آصف کا ایک ہی بیٹا فہد اور آصف کا جنید تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی الٹ فہد ماموں کی طرح بے حد پڑھا کو مخلص اور ہمدرد انسان تھا۔ جبکہ جنید چچا اور باپ کا پرتو بے حد اس وقت مکار خود غرض اور مطلبی۔ وفا اس کے بچپن کی سنگیتر تھی جو اسے

قطعی پسند نہ تھی مگر جائیداد کی لالچ کی وجہ سے وہ اسے پسند کرنے پر مجبور تھا۔ اس کو یقین تھا کہ ماں باپ کے علاوہ دادی بھی اپنے اور کاشف کے حصے کی جائیداد نو اسی کو دے دیں گی اور اب اس حمزہ نے آ کر سارا پلان چوہٹ کر دیا تھا اور سب اس کے آگے پیچھے تھے۔ خاص طور پر فہد جو اس کی شخصیت کے متعدد پہلوؤں سے متاثر تھا جو غیر ملکی ڈگریاں رکھتے ہوئے بھی سادگی کا پیکر اور غرور و تکبر سے کوسوں دور تھا اور جب وہ انگلش لب و لہجہ میں اردو بولتا تو سب کو اور بھی خوبصورت لگتا۔

☆.....☆

حمزہ کو اپنی یہ سنجیدہ بروقاز سادہ اور کچھ اکڑی کزن وفا بے حد پسند آتی تھی۔ غرور اس پر بجاتا تھا اس کا رویہ گو کے حمزہ کے ساتھ بے حد لیا دیا سا تھا لیکن پھر بھی حمزہ اس سے دن بدن متاثر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ خاندان کی واحد لڑکی تھی جو پڑھنے پوینورشی جا رہی تھی۔ حالانکہ وفانے اس کو بھی قابل درخور اعتنا نہ جانا تھا۔ پھر بھی اس کا رکھ رکھاؤ بولنے کا انداز نوکروں تک سے احترام سے پیش آنا اور خاص طور پر خواتین کی عزت کرنا اس کے لئے اچھے کا باعث تھا کیونکہ اس نے گھر کے مردوں کو ہمیشہ حکمانہ انداز میں بات کرتے اور نوکروں کو جھڑکتے ہوئے ہی دیکھا تھا اور وہ خود بھی نوکروں کو منہ لگانا پسند نہیں کرتی تھی لیکن فہد کے بعد یہ واحد فرد تھا جو نوکروں سے اس طرح گھلامار ہتا جیسے وہ اس کے ہم پلہ ہوں۔ نوکروں کے بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنا اور کسی مذاق کرنا اس کے لئے حیرت کا باعث تھا کیونکہ بعد اس کے ابا یہاں کی خواتین اسے ہمیشہ شوہروں اور بھائیوں کے سامنے گڑگڑاتی اور میاقتی نظر آئیں۔ اس کے ابا اس کو بے حد چاہتے تھے لیکن دوسروں کے لئے ان کا رویہ بھی گھر کے عام مردوں جیسا تھا۔ اس کا دل چاہتا حمزہ اس کے حسن کی تعریف کرے اس کی شان میں

قصیدے پڑھے، اس کی قابلیت کے گن گائے کہ وہ انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کر رہی تھی۔ اس کو سزا ہے لیکن جانے وہ کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا اور یہی حسن کی توہین و فاکو چراغ پا کرنے کے لئے کافی تھی۔ اس کو اپنے قدموں میں چھکانے کی تمنا اب اس کی خواہش ہی نہیں ضد بن گئی تھی اور اب صرف اس کو چلانے کے لئے وہ چند پرزیاہ سے زیادہ توجہ دینے لگی تھی۔ جس سے بھی اس نے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی اب اس کے ساتھ مل کر حمزہ کا مذاق اڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ قدم قدم پر اس کی تذلیل کرتی، اس کا مذاق بناتی مگر وہ ایسا بن جاتا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اس کو گھر والوں کی طرف سے حمزہ کی اس قدر پذیرائی پر بھی غصہ تھا جہاں وفا کے نام کی صدائیں گونجتی تھیں اب سارا دن حمزہ کے نام کی پکار پڑتی رہتی تھی۔ حد تو یہ کہ نوکری بھی اس کی شان میں رطب اللسان تھے۔

اس دن تو فہد نے سب کے سامنے ہی اس کا پیچھا پکڑ لیا۔

”سچ بتاؤ تم نے کہیں یورپ میں کسی گوری سے شادی دادی تو نہیں کر لی؟“

”ارے نہیں یار!“ وہ ہنس پڑا۔

”مشرق کو جو حسن ملا ہے اس کا عشر عشر بھی مغرب میں نہیں وہاں عزت و عصمت اور شرم و حیا کی داستا میں قصہ پارینہ ہیں صرف گوری چھڑی پھیکا شلجم حسن تو نہیں۔ مجھے تو مشرقی لڑکیاں پسند ہیں۔ لمبے سیاہ بال، آہو چشم اور شاخ گل کی طرح لجاتی شرمالی شرم و حیا والی!“

”تمہارا اشارہ ہماری وفا کی طرف تو نہیں؟ مگر شرم و حیا تو بے توبہ!“ اس نے شرارت سے گال پیئے۔

”لا حول ولا قوۃ!“ حمزہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”حمزہ بھائی! آپ ہوش میں تو ہیں۔“ وہ غصے



سے بگڑ کر بولی۔

”یہ لاجول کس پر پڑھی ہے آپ نے میں تو آپ جیسوں کو منہ بھی لگانا پسند نہیں کرتی۔“

”سوری یہ لاجول آپ کے لئے نہیں فہد کے لئے تھی جس نے اتنی بے تکلی بات کہی ہے۔“ وہ محذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

”مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں میں آپ جیسوں کے منہ لگانا پسند نہیں کرتی!“

”آپ جیسوں سے کیا مراد ہے آپ کی؟“ حمزہ نے متانت سے سوال کیا اور فہد جواب بنے بغیر اسے باہر لے گیا۔

☆.....☆

موسم سمور کن تھا خشک ہوا میں سرسرا رہی تھیں چمیلی رات کی رانی اور موگرے اور موتیا کی خوشبو سے پورا لان مہک رہا تھا حمزہ سنگ مرمر کی بیچ پر بیٹھ کر کچھ سوچ رہا تھا کبھی ماں باپ یاد آتے کبھی دادی کی بے بسی پر ترس آنے لگتا ساتھ ہی بچاؤں کا خشک ردیہ اور وفا اور جنید کی طنز یہ باتیں دل دکھانے لگتیں۔ اگر فہد کا خلوص و ادوی کی محبت اور پھپھو چھپی کی چاہت پیروں کی زنجیر نہ بنتی تو وہ کب کا یورپ لوٹ جاتا جہاں کا وہ شہری تھا اس کو دولت جائیداد سے کوئی دلچسپی نہ تھی کیونکہ وہ علم کی دولت سے مالا مال تھا پھر والدین بھی ایک کثیر سرمایہ اس کے لئے چھوڑ کر مرے تھے فطرتاً وہ قناعت پسند اور صابر تھا اور صرف سچی محبت اور خلوص کی تلاش میں پاکستان آیا تھا ورنہ یورپ میں ایک سے ایک لڑکیاں اس کے گرومنڈ لاتی رہتی تھیں۔

واصف کی جوانی بہت رنگین گزری تھی۔ ریس اور سے نوشی نے انہیں مالی اعتبار سے بالکل دیوالیہ کر دیا تھا اور جنید بھی انہی کے نقش قدم پر تھا اس ایک نکتے پر دونوں ہی متفق تھے کہ جلد از جلد وفا سے شادی کر کے اس کے حصے اور تانی کے حصے پر قبضہ جمایا جائے جو

یقیناً اکلوتی نواسی کو ملنے کی توقع تھی وفا سے محبت تو ایک خوش رنگ ڈرامہ تھا۔

دوسری طرف وفادان بدن حمزہ کی مردانہ وجاہت اور اس کے اخلاق سے متاثر ہونے لگی تھی۔ اس کی مسکور کن شخصیت اور پروقار طرز زندگی نے اسے جنید سے مقابلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا جس کی ادھی اور گری ہوئی حرکتوں سے وہ پہلے ہی تالاں لگی وہ اب اسے اجڈ اور گتوار لگنے لگا تھا جس کو نہ بات کرنے کی تمیز تھی نہ کھانے پینے کا ڈھنگ اور اوڑھنے پہننے کا سلیقہ۔ مگر اسے اپنی سوانیت اور انا بے حد عزیز تھی۔

حمزہ کے آگے جھلنا حسن کی توہین تھی وہ حمزہ کو اپنے آگے جھکا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ واصف کی خواہش تھی کہ جلد از جلد جنید اور وفا کی منگنی کا اعلان کر دیا جائے اور دو ماہ بعد شادی لیکن عبید خان تذبذب کا شکار تھے۔

”بیگم! میں نے بڑی غلطی کی ہیرا چھوڑ کر پتھر کو جن لیا، کونسا شرعی عیب ہے جو تمہارے نتیجے میں نہیں دوسری طرف حمزہ ہے بے حد شریف اعلیٰ ظرف اور خوبصورت و خوب سیرت۔ میں دورا ہے پر کھڑا ہوں۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ جانتے نہیں حمزہ کی ماں.....؟“ زویا بگڑ کر بولیں۔

”زویا اگر کوئی غریب کسی درخت کی آبیاری کرے تو کیا تم اس کے پھل نہیں کھاؤ گی غریب ہونا جرم تو نہیں بلکہ ہم جیسے عیاش خود غرض اور موبغ پرست لوگوں سے تو اس غریب کی بیٹی اچھی جس نے اپنے بیٹے کی اتنی اچھی تربیت کی بے شک تمہارے ماں باپ جدی پیشی امیر ٹھہرے اور خاندانی بھی تھے لیکن تم جانتی ہو تقسیم ہند کے وقت بے شمار کی کار انگریزوں کے کتے ٹھہلانے اور گھوڑوں کو ٹھہلانے کے صلے میں بے شمار زمینوں کے مالک بن گئے جبکہ حمزہ کے نانا تانی نہ صرف خود دار تھے جبکہ خاندانی

بھی۔ تمہارے ابو بھی میرے لئے بہت اچھے انسان تھے لیکن اماں جان کی طرح مجھے بھی ان کے ذات پات اور حسب و نسب کے اصولوں سے اختلاف تھا وہ تو اماں جان اگر اپنے معتد خاص سے ان کو یورپ نہ بھیجتیں اور ان کی مالی مدد نہ کرتیں تو شاید تمہارے دونوں بھائی تو انہیں زندہ بھی نہیں چھوڑتے۔“

”آپ جانتے تھے۔“ زویا کی آنکھوں میں حیرت در آئی۔

”بے وقوف خاتون! اماں جان کا دست راست یہ آپ کا ناچیز خاوند ہی تو تھا جس نے بھاگ دوڑ کر کے کاشف اور اس کی بیوی کو لندن پہنچایا اور وہاں سسٹل ہونے میں مدد بھی دی مگر اماں جان نے کسی کو بھی بتانے سے منع کیا تھا۔“

حمزہ ایک طویل سانس لے کر دروازے کے پاس سے ہٹ گیا اتفاقاً ہی یہ راز اس کے کانوں میں پڑ گیا تھا جس کی وجہ سے اس کے ماں باپ کو در بدر ہونا پڑا مگر مٹی ڈیڈی نے اسے اس بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا وہ اپنے پھوپھا کی اعلیٰ ظرفی پر دل سے مسترف تھا۔

☆.....☆

واصف کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا اور عبید خان کھٹکاش کا شکار تھے۔ انہوں نے بہتر سمجھا کہ وفا سے ڈائریکٹ پوچھ لیا جائے۔

”ابا! اگر جنید بھائی دنیا کے آخری انسان بھی ہوں تب بھی مجھے ان سے شادی منظور نہیں، بے شک پھر آپ کسی سے بھی کر دیں میں انکار نہیں کروں گی مگر جنید بھائی تو مر کر بھی نہیں!“

اندر آتے ہوئے جنید کے کان میں جب یہ الفاظ پڑے تو وہ دبے پاؤں واپس پلٹ گیا۔

☆.....☆

آج فہد کے سلسلے میں سب لڑکی والوں کے گھر جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے یہ رشتہ فہد کی پسند سے

خالد کے گھر کیا جا رہا تھا لیکن وفانے بخار کی وجہ سے جانے سے انکار کر دیا اور زویا کو بھی اصرار کر کے ساتھ بھیج دیا۔ وہ لیٹے لیٹے بیزار ہونے لگی تو چائے پینے کے ارادے سے اٹھ کر بیٹھ گئی ابھی وہ دوپٹہ اوڑھ ہی رہی تھی کہ طوفان کی طرح جنید اندر داخل ہوا۔

”جنید بھائی آپ اور اس وقت؟“

جنید نے بغیر جواب دیئے کمرے کی کنڈی لگالی اس کی آنکھوں میں وحشت اور دیوانگی تھی۔

”یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“ وہ بگڑ کر بولی۔

”میں اپنی چیز سے اتنی آسانی سے دستبردار نہیں ہوتا تمہیں آج یہی سمجھانا چاہتا ہوں!“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

وہ سر سے پاؤں تک لرزائی اس کو اندازہ تھا گھر میں کوئی نہیں ہے اور اتنے بڑے گھر میں بند کمرے سے اس کی آواز بھی باہر نہیں جاسکے گی۔

”مطلب بالکل صاف ہے تم مجھ سے شادی کے لئے تیار نہیں اور میں آج تمہیں اس قابل ہی نہیں چھوڑوں گا کہ کوئی اور تمہیں منہ لگائے۔“

وہ اس کی طرف وحشیانہ انداز میں دانت پیتے ہوئے بڑھا۔

”آپ شاید اپنے ہوش میں نہیں ایک آواز لگاؤں گی تو آپ کا تماشہ بن جائے گا بہتر یہی ہے کہ آپ شرافت سے باہر چلے جائیں۔“

وہ غصے سے چیخی اور جنید نے اس کو سختی سے دبوچ لیا اور پھر وفا کی چیخوں سے پورا کمرہ گونج اٹھا۔ جنید کو معلوم نہ تھا کہ فہد اور حمزہ اپنے کمرے میں شطرنج کی بساط جمائے بیٹھے ہیں حمزہ کے کانوں میں وفا کی ٹھٹی ٹھٹی آواز آئی تو وہ بے ساختہ اوپر وفا کے کمرے کی طرف بھاگا۔ جبکہ فہد بدستور شطرنج کی چالوں میں غرق تھا۔ اسی دوران گھر والے بھی آچکے تھے حمزہ نے زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا تو جنید نے دروازہ کھول دیا وفا ایک سہمی ہوئی چڑیا کی طرح

کونے میں کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی، جنید ابھی بچویشن کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ عبید خان اور واصف بھی ہانپتے ہوئے پہنچ گئے، غالباً وہ بھی اسی وقت گھر میں داخل ہوئے تھے سب کو دیکھ کر جنید نے ایک گھونسا حزرہ کے منہ پر جڑ دیا۔

”پھوپھو جان! یہ ذلیل شخص وفا کے ساتھ دست درازی کی کوشش کر رہا تھا اگر میں بروقت نہ آ جاتا تو جانے کیا ہو جاتا۔“

یہ سنتے ہی واصف نے بھی اپنا خضہ ڈالنا ضروری سمجھا اور بری طرح حزرہ کو پینٹا شروع کر دیا۔ وفا باپ سے لپٹ کر بری طرح رو رہی تھی، عبید خان کے کچھ سمجھنے سے پہلے دونوں باپ بیٹوں نے حزرہ کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

”نکل جاؤ کم ذات بیخ عورت کی اولاد.....!“

”بس چچا جان آپ نے بہت کہہ لیا اور میں نے سن لیا، میں اب اپنی صفائی میں ایک لفظ نہیں کہوں گا، کیونکہ سچائی خود اپنے منہ سے بولتی ہے مگر آپ نے ایک لفظ بھی میری ماں کے بارے میں کہا تو میں نہ رشتے کا لحاظ کروں گا، نہ عمر کا مجھے فخر ہے اپنی ماں اور اپنے نانائانی پر جو نہ عیاش تھے نہ شرابی نہ مکار۔“

یہ کہتے ہوئے حزرہ تیزی سے نکلنا ہوا چلا گیا اتنی دیر میں دادی اور فہد بھی چیخ پکار سن کر اوپر آ گئے۔

”کیا ہو رہا ہے یہ سب کیسا ہنگامہ ہے اور یہ حزرہ غصے میں کہاں جا رہا تھا؟“ دادی چیخ کر بولیں۔

”بہت فخر کرنی تھیں نا آپ اپنے پوتے پر رگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ حزرہ گھر کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ تو میرا بیٹا جنید نہ آ جاتا تو آپ اس وقت منہ دکھانے کے قابل نہ رہتیں!“

اس دوران عبید خان وفا کے ساتھ کمرے سے باہر جا چکے تھے۔

”خبردار!“ بڑی بیگم ڈپٹ کر بولیں۔

”اپنی زبان کو لگام دو کوئی چولہے پر چڑھ کر بھی

کہے تو میں نہیں مانوں گی کیونکہ وہ کاشف کا بیٹا ہے کسی شرابی کبابی کا نہیں۔“

بڑی بیگم کے لہجے میں اتنا یقین اور مان تھا کہ دونوں باپ بیٹوں کو آگے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔

فہد دندنا ہوا وفا کے کمرے میں پہنچا اور چیخ کر بولا۔

”تم نے ایسا کیوں کیا وفا؟ تمہاری خاموشی نے ایک بے قصور انسان کو مجرم بنا دیا میں جانتا ہوں حزرہ بے قصور ہے کیونکہ وہ تو میرے ساتھ تھا۔“

”فہد بھائی!“ وفا بلک بلک کر رونے لگی۔

”میرے اعصاب جواب دے گئے تھے، خواص منغل ہو گئے تھے، میں اتنی حواس باختہ ہو گئی تھی کہ حزرہ بھائی کی صفائی میں ایک لفظ نہیں کہہ سکی حالانکہ میں بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔“

”ایک بات پوچھوں وفا، جنید سے شادی سے انکار کی وجہ حزرہ تو نہیں؟“

فہد نے اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور اس نے کچھ نہ کہتے ہوئے سر جھکا کر رونا شروع کر دیا۔

”میں کیا کروں فہد بھائی! وہ پتھر ہے میں اس سے سر نکلانا اگر مر بھی جاؤں گی تو بھی وہاں اثر نہیں ہونے والا۔ میں ٹوٹ گئی ہوں بکھر رہی ہوں مگر میں بھی ایسا کچھ نہیں بولوں گی اور اس بے غیرت بے حیثیت جنید کے ساتھ چپ چاپ رخصت ہو جاؤں گی، کیونکہ یہ تو طے ہے کہ میں نہ جھکوں گی نہ حزرہ سے محبت کی بھک مانگوں گی وہ خود کو سمجھتا کیا ہے میں اب اتنی بھی گئی گزری نہیں، مر سکتی ہوں جھک نہیں سکتی۔“

”پاگل لڑکی.....!“ فہد نے اس کا شفقت سے سر تھپتھپایا۔

”میں تمہارے دشمن۔ دیکھو ذرا حزرہ سے دور ہی رہنا پتہ نہیں غصے میں وہ تمہارا کیا حال کرے اور تم

دیکھتی جاؤ جنید کو تو میں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ اپنے زخم چاٹتا ہی رہے گا۔“

”مگر اس پتھر کے دیوتا سے دل لگانے کا مشورہ کس احق نے دیا تھا۔“

آخر میں فہد کا لہجہ شرارتی ہو گیا اور وفا کھسیانی نہی بننے لگی۔

☆.....☆

پورے گھر میں حزرہ کی ڈھونڈ مچی تھی اور وہ غائب تھا۔

”ارے کمنٹو! ڈھونڈو میرے حزرہ کو جانے کہاں کہاں بھٹک رہا ہوگا، کس قدر گھٹیا الزامات لگائے میرے بیٹے پر کیسا کچڑا اچھالا اور اپنے گریبان میں جھپٹ کر نہیں دیکھا۔“

”دادی کیوں پریشان ہو رہی ہیں عیش کر رہا ہوگا کہیں بیٹھ کر۔“

جنید نے ڈھٹائی سے ایک آنکھ دبائی تو بڑی بیگم نے ایک دو تھوڑا سا کمر پر رسید کر دیے۔

”کجکج یہ سب تیرا ہی کیا دھرا ہے تجھے شرم نہ آتی اپنے بھائی پر جھوٹا الزام لگاتے اور میری نواسی بھی اس وقت منہ میں گھونٹکیاں ڈال کر بیٹھ گئی۔“

”اور تم باپ بیٹے کو موقع مل گیا تم دشمن ہو اس کے آخر کس باپ کے بیٹے ہو اسے ڈھونڈ کر لاؤ ورنہ میں بھی ختم ہو جاؤں گی۔“

بڑی بیگم دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں اور ان پر غشی ظاری ہو گئی سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

فہد نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور گھر سے نکل گیا وہ جانتا تھا حزرہ کہاں ملے گا۔ وہ ہوٹل پہنچا تو حزرہ یورپ جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

”گھر چلو دادی کی طبیعت بہت خراب ہے؟“

”کس کے گھر کون سے گھر، میں ٹھہرا آوازہ بدعاش شرفاء کے گھر کیسے جاسکتا ہوں؟“ وہ دکھ سے بولا۔

”پاگل ہو گئے ہو کیا؟ وہاں ایک لفظ اپنی صفائی میں بولے بغیر یہاں آگے اور اب جانے کو تیار نہیں تمہیں بولنا چاہیے تھا۔“

”کیا بولتا اور کیوں بولتا جب وفا چپ رہی جو میری زندگی کی اولین اور سب سے بڑی خواہش تھی، وہ جنید کی منگیت تھی اور میں ایک لاوارث پھر وہ میرے حق میں اور جنید کے خلاف کیسے بولتی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ جنید جو وفا کی محبت ہے سب کی نظروں میں گر جائے۔“

”واہ بھی تم تو سچ سچ کے مجنوں نکلے احق انسان اس وقت وفا اپنے حواسوں میں نہیں تھی بعد میں اس نے سب کو سچ سچ بتا دیا تھا بلکہ اس نے تو وہ کچھ بھی مجھے بتا دیا تھا جو تم سن کر شاید شادی مرگ کا شکار ہو جاؤ، فی الحال تو تم گھر چلو۔“

فہد مسکرا کر بولا۔

”ہرگز نہیں اس بے عزتی کے بعد تو میں اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گا۔“

حزرہ غصے سے بولا۔

”جائیں گے تو تمہارے اچھے بھی یار کیوں ماش کے آٹے کی طرح اینٹھ رہے ہو، وہاں دادی کی طبیعت بہت خراب ہے، رو رو کے انہوں نے زمین آسمان ایک کر دیا ہے اور صرف تمہیں پکار رہی ہیں پلیز میرے ساتھ چلو۔“

وہ دادی سے لپٹ کر رو پڑا قریب ہی وفا بھی سسک رہی تھی۔

”بیٹا تو کیوں شرمندہ ہوتا ہے ڈوب تو میں وہ جنہوں نے یہ ڈراما رچایا۔ ارے کیا میں اپنے خون کو پہچانتی نہیں ہوں مگر ہر کام میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے شاید جو ہماری دلی خواہش تھی اسے اسی طرح پورا ہونے کے لئے اسی طرح کے ڈرامے کی ضرورت تھی کہ میں آج اپنے پوتے کی شادی اپنے ہاتھوں سے کروں گی جو میاؤں نے تمہارے لئے جال بچھایا تھا

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویب سائٹ

## یہ تمام پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### مہنامہ کیوں نہیں؟

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریمڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹج
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو ایسیے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہر ای بک سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں [www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)

آنکھیں کھول دیں۔ حزمہ مسکرا رہا تھا اس کی محبت پائش نظر میں اس کے صبح چہرے کا طواف کر رہی تھی۔

”خوف زدہ ہو ہونا بھی چاہیے مگر محبت کی ہے تو ذر کیسا؟ وہ تو پھوپھا بہت سمجھدار ہیں۔ ایک نظر میں انہوں نے حقیقت جان لی تھی، خراشیں جنید کے چہرے پر تھیں، تمہیں نہیں کے بن اس کے ٹوٹے ہوئے تھے انہیں تمہاری خواہش کا بھی پتہ تھا پھر انہوں نے ان کی چال انہی پر الٹ دی اس کو کہتے ہیں شہ مات وہ تو اگر فہد حقیقت نہ بتاتا تو ہرگز تم سے شادی نہ کرتا باوجود اس کے کہ تم میرے روم روم میں بسی ہو۔“

”فہد بھائی نے کیا حقیقت بتائی؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”بھی کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔“ وہ شوخی سے بولا۔

”آپ مجھ سے ناراض تو نہیں؟“

”ہوتا ضرور اگر مجھے یہ پتہ نہ چلتا کہ تم گوڈے گوڈے میری محبت میں ڈوبی ہوئی ہو اور میں تو پہلے ہی دن تمہاری زلفوں کا اسیر ہو گیا تھا۔“

”پھر آپ نے اظہار کیوں نہیں کیا۔“

وفا کی زبان سے شکوہ پھسل گیا۔

”کیونکہ اظہار و عاشق میں تو ہیں وفا ہے۔“

تمہارا رعب حسن، احساس برتری اور خور و زکبر.... میں خود کو تمہارے قابل نہیں سمجھتا تھا اور پھر قدم قدم پر میری مرحومہ ماں کے طعنے....

”بس بھی کیجیے میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا آخر بھانجی کس کی ہوں۔“ وفانے فخر سے کہا۔

”اور اب بیوی کس کی ہو ذرا قریب آؤ تو بتاؤں وہ ساری ہجر کی داستانیں، محبت کی کہانیاں جسے سننے کو تم پیٹا ہو اور میں کہنے کو بے تمن۔“

اس نے مسکرا کر وفا کو خود سے قریب کر لیا اور پوری کائنات ان کے من پر مسکرانے لگی۔

.....☆.....

اس میں خود پھنس گیا، اسے کہتے ہیں خدا کا انصاف اور اللہ کی قدرت کہ حق سمجھدار رسید۔

حزمہ کی سمجھ میں بالکل بھی نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے کبھی پھوپھا گلے لگا کر معافی مانگ رہے ہیں تو پھوپھا بھی صدقے واری ہو رہی ہیں اور فہد تو باقاعدہ جھگڑا ڈال رہا تھا۔

”دادی! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

”تمہارا نکاح ہو رہا ہے وفا ہے۔“ بڑی بیگم اطمینان سے بولیں۔

”دادی! جنید نے احتجاج کیا۔“

”وفا میری منگیتر ہے ایسا نہیں ہو سکتا میں ہونے نہیں دوں گا۔“ جنید غصے سے دہاٹا۔

”تم ہوتے کون ہو چچ میں بولنے والے۔“

”نہ کھلو اور زبان میری بس اس کو یوں ہی رہنے دو۔ بقول تمہارے حزمہ نے وفا کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی تو اب شادی بھی اسی سے ہوگی۔“

عبید خان نے اطمینان سے جواب دیا اور پھر حویلی کے مینوں نے دیکھا وفا رخصت ہو کر کاشف کے پورٹن میں آگئی اس نے اپنی محبت پالی تھی جس پر اسے فخر تھا مگر دل اندر سے سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ اپنی بے عزتی کا بدلہ جانے حزمہ کس طرح لے گا مگر وہ خود کو ہر طرح کے سلوک کے لئے چینی طور پر تیار تھی۔ در اس کو یقین تھا کہ ایک تا ایک دن حزمہ کو اس کی محبت چاہت اور وفا پر یقین آ ہی جائے گا۔

حزمہ دروازہ بند کر کے قریب آیا تو وہ لرزائی اس کے چہرے پر خشونت اور چٹانوں جیسی سختی تھی اور لب بچنے ہوئے وفا کی سانسیں رکے لگیں جوں ہی حزمہ نے مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا خوف سے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں تھپڑ کی گونج کانوں میں آنے لگی مگر جب گالوں پر انگلیاں سرسرا نے لگیں تو اس نے گھبرا کر

# فیصلہ سنی جہانگ

اوبے خبر  
اوبے قدر

بے چبیاں بے تائیاں ہیں جواں  
ملائکہ فل والیوم میں گانا گارہی تھی اور اپنے بیڈروم  
کی ڈسٹنگ کر رہی تھی۔  
آریان دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا ملائکہ کو نیک  
نک دیکھ رہا تھا۔ پھر دھیرے سے گنگٹایا۔  
تاکتے رہتے تھے کہ  
سانجھ سویرے نینوں  
میں بسیاں جیسے نین یہ تیرے  
تیرے مست مست دو تین

میرے دل کالے گئے چین  
”مسٹر... تم...؟“

ملائکہ ڈسٹنگ چھوڑ کر آریان کے پاس آئی تھی۔  
ملائکہ نے آریان کو اپنی پرسل چیزیں لینے کے لیے  
مارکیٹ بھیجا تھا اور آریان مارکیٹ جانے کا کہہ کر گیا  
تھا لیکن واپس آ گیا تھا۔

”جان! ہم کیا کریں۔ تم بن کر کچھ اچھا نہیں  
لگتا۔ تم بن سب بے مزہ، بے رونق لگتا ہے۔ دل نہیں  
لگدا تیرے بنا ہو سکو دل نہیں لگدا تیرے بنا۔“  
آریان نے حال دل بیان کرتے کرتے ملائکہ کو  
بانہوں میں بھر لیا تھا اور گانا گنگٹاتے ہوئے ایک شوخ



سی شرارت کر ڈالی تھی۔ شادی کو ابھی دو ماہ ہی ہوئے  
تھے۔ ملائکہ اس کی شوخیوں پر جھینپ سی گئی پھر  
دھیرے سے مسکرائی تھی۔

☆.....☆

”آریان!“  
ملائکہ اپنے کپڑے سیٹ کر رہی تھی۔ کچھ یاد آنے  
پر آریان کو پکارا تھا۔ آریان تو سب طرف سے بے  
خبر ہو کر نئی دی دیکھ رہے تھے۔

”مسٹر آریان!“

ملائکہ نے سمجھنچلا کر لگانا چار پانچ آوازیں  
لگائیں۔

”جان! پلیز ڈونٹ ڈسٹرب ی۔ فلم بڑی  
زبردست چل رہی ہے۔ آجاؤ تم بھی دیکھ لو ایکشن  
ری پلے، اچھی مووی ہے۔“ آریان نے پیار سے منع  
کرنے کے ساتھ ہی ملائکہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس  
کھینچ لیا تھا۔

ملائکہ کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ ملائکہ کو خود تو ٹی وی  
دیکھنے میں انٹرسٹ نہیں تھا۔ اسی لیے آریان کالی وی  
میں گم ہونا اسے برا لگتا تھا۔

”ہم کہیں چلیں؟“ ملائکہ نے کچھ دیر بعد کہا تھا۔  
آہستگی سے آریان کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔  
”کہاں جانا ہے میری جانو کو؟“ آریان اس کے  
ہاتھ چومتے ہوئے بولا تھا۔

”کہیں بھی اچھی سی جگہ.....“

”میڈم! آپ دو ماہ میں پورا کراچی شہر گھوم چکی  
ہیں، اب آپ ہی سلیکٹ کریں کہ کون سی جگہ اچھی  
ہے۔“ آریان نے فیصلہ ملائکہ پر چھوڑ دیا تھا۔

”آج سال کا آخری دن ہے۔ کل نیا دن نئے  
سال کا آغاز ہوگا۔ ہم سال کا اچھا دن اچھی جگہ اچھے  
طریقے سے گزارنا چاہتے ہیں۔ تاکہ شادی کے بعد  
والا نیا سال ہمیں ہمیشہ یاد رہے اور اس سال کو ہماری  
یادوں میں منفرد حیثیت ملے۔“

”داؤ! ڈارلنگ آئیڈیا تو اچھا ہے۔“

آریان نے ملائکہ کو سراہا تھا۔ ملائکہ عام سے لوگوں  
کی طرح نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اس کی سوچ دوسرے  
لوگوں سے منفرد تھی۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی کے ہر لمحے  
ہر پل ہر دن ہر رات سے ڈھیر ساری خوشیاں اور یادیں  
کشیڈ کرنا چاہتی تھی اور ہر پل اور لمحے کو نئے نئے  
طریقے سے کے بھر پور گزارنے کا سوچتی تھی جس میں  
اس کا شریک حیات بھر پور ساتھ دیتا۔ دنوں اپنی نئی نئی  
ازدواجی زندگی کے حسین ترین دن پلان کر کے حسین  
ترین طرح سے گزار رہے تھے۔

☆.....☆

سورج غروب ہونے سے قبل آریان ملائکہ کو سی  
ویو لے کر آ گیا تھا۔

”آریان! کل ہم سال کا نیا دن نیا سورج دیکھیں  
گے پھر اگلے برس یہاں آکر ہم اس دن کو شدت سے  
محسوس کریں گے۔ ایک سال میں ہماری زندگی ٹکسر  
بدل جائے گی۔ سہانے دن سہانی راتیں مصروف  
دن مصروف راتوں میں بدل جائیں گے۔“  
ملائکہ آریان کے سینے کے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔  
دھیمے دھیمے کہہ رہی تھی۔

”ملائکہ آئی پراؤ ڈ آف یو، تم زندگی کو محسوس کرتی  
ہو جیتی ہو، تمہیں زندگی جینے کا ڈھنگ آتا ہے، میں  
زندگی کو گزارتا تھا لیکن تم نے مجھے جینا سیکھا دیا پہلے  
میرے نزدیک کسی دن کسی پل کی کوئی اہمیت نہیں  
تھی۔ میں سب دن سب پلوں کو ایک سا سمجھتا اور  
گزارتا تھا لیکن تم نے مجھے بتایا کہ زندگی میں شامل  
ہونے والا ایک ایک پل ایک ایک لمحہ نیا اچھوتا پریم  
بھرا ہے۔ زندگی سچ بہت مختصر ہے ہمیں سچ میں اس  
سے اتنی خوشیاں کشیڈ کرنی چاہئیں کہ ہمیں زندگی سے  
پیار ہو۔ زندگی میں پیار محبت ایک دوسرے کا احساس  
و خیال ہے تو یہی ہے اصل زندگی اور محبت۔“

☆.....☆

# ماں کی گھڑی شاہ



”دادا جی!“ گھر کی تمام خواتین کو مصروف دیکھ کر عاشر دادا کے گھٹنے سے آگے۔  
 ”کی تکلیف اے؟“ دادا کو اس کی آواز سے ہی شائد اس کا مدعا سمجھا گیا تھا۔  
 ”دادا جی! پھر کب جائیں گے آپ صبح کے گھر؟“  
 اس کی نحیف سی آواز مرچیں کوہتی اس کی ماں کے کانوں تک پہنچ گئی، وہ جھٹ مرچیں چھوڑ کر قریب آگئی۔  
 ”کی ہو یا اباجی!“ وہ دادا کے کان میں ہی گھس گئیں۔  
 ”پرے ہو کے گل (بات) کرنی۔“ دادا ایک دم بد مزہ ہوئے۔ عاشر انہیں دیکھ کر رہ گیا۔  
 ”میں نے تجھے کہا تھا کہ اپنے چھو کرے کو سمجھا، میں نہیں جاؤں گا اس لٹکی کے گھر رشتے لے کر۔“  
 عاشر تڑپ گیا۔ ”دادا جی وہ لٹکی نہیں ہے۔“  
 دادا اس سے بھی اونچا چلائے۔ ”تو پھر کیا ہے وہ جس نے تجھے اپنے پیچھے لگایا ہوا ہے اس نے۔“  
 دادا کی آواز سن کر دھیرے دھیرے تمام خواتین جمع ہو گئیں۔ احمد نے آگے بڑھ کے عاشر کو حوصلہ دلایا۔  
 ”اپنے گھر میں کڑیاں مر گئیں کیا؟“ دادا پھر بولے۔  
 ”کوئی نہیں میں نے نہیں کرنی اس جن سے شادی، آئے آئے۔“ میں اوزر مار رہا اس پر چڑ دوڑیں، عاشر ہمیں تشکر سے دیکھ کر رہ گیا۔  
 ہمیشہ ایسے ہی ہوتا تھا عاشر جب یہ بات کرنی شروع کرتا، دادا جی پہلی دیوار کھڑی کر دیتے۔  
 ”غیر برادری میں دیاہ کرانے کا سوچنا بھی مت، ہم لوگ چوہدری اور وہ لوگ .....!“ عاشر دلیلیں دے دے کر اس دیوار میں سوراخ کرتا تو

اگلی دیوار کھڑی ہو جاتی۔  
 ”توبہ توبہ، اب تو غیر مسلک کی کڑی لائے گا، شرم کر بے غیرتا، ہم لوگ الہحدیث اور وہ لوگ بریلوی۔“ عاشر یہ دیوار توڑ ہی نہ پاتا۔ دادا جی کی حمایت کو ماریہ کی ای بھی آ جاتیں۔  
 ”ہور کی اباجی (اور کیا اباجی) اس گھر میں بس اک بریلون کی کمی رہ گئی ہے جو چچے پر (بھر بھر) کے ختم والے حلوے کھائے، توبہ توبہ۔“  
 دادی کے الگ بین شروع ہو جاتے۔ ”میں کہا دی تھا کہ منڈے نون سنکل پاد یو پر میری سندا (منٹا) کون ہے۔“  
 عاشر جھلا اٹھا۔ ”او دادی جی! میں کیا تیل ہوں جیسے سنکل ڈالنا ہے، حد ہوتی ہے۔“  
 شمیمہ چچی کو اپنا میکہ یاد آ جاتا۔ ”میرے ماموں کی سانی کا بھائی بھی ایسے ہی بریلون لے آیا تھا، پورے خاندان کو ختم۔“  
 ”ہاں۔“  
 ان کی آواز سن کر عاشر دادی کو قہر چڑھ جاتا۔ ”اے تو دفع ہو یہاں سے، پتی خاندان کی اولاد۔“  
 جتنے منہ اتنی باتیں۔ ”عاشر تنگ کر اٹھ جاتا اور دادا جی جیت کا جشن مناتے۔  
 ”ویسے عاشر! اگر تیری صہنہ سے شادی ہو گئی تو ایک کام تو ہو جائے گا۔“ ہم سب بڑے تایا کے کمرے میں محفل لگائے بیٹھے تھے۔  
 ”تجھے گالیاں نکالنے میں کمال ہو جائے گا۔“  
 احمد ہنسا تھا۔ ”بکواس نہ کرو۔“ عاشر کو غصہ آیا۔  
 ”جی، ان لوگوں کی یہ ہی تو خاصیت ہے جب تک ماں، بہن کا نام نہ لے لیں ان کی بات پوری نہیں ہوتی۔“ عاشر کو تاؤ آ گیا۔  
 ”اچھا، تو تم لوگ بڑے اچھے ہو، بزدل کہیں کے۔“ زین اوزر احمد نے عاشر کو دبوچ لیا۔  
 ”بائیکل، بزدل ہی تو ہے تو ورنہ اب تک کچھ نہ

کچھ بن چکا ہوتا۔" عاشق کی بہن (شرہ) نے اسے لٹاؤ۔

"کیا کروں میں، سر پھاڑ دوں دادا جی کا؟" وہ بولا۔

"دھمکی لگا کے دیکھ۔" زین نے مشورہ دیا۔

"ہاں، اوئے عاشق تو کہہ دے کہ زہر کھالے گا۔" احمد سے زیادہ جذباتی ہو گیا۔

"نہیں بھی کچھ ایسا ہو جو سچ بھی لگے۔"

"تیسری منزل سے چھلانگ لگا دے عاشق۔" میں تو دیسے بھی بہت غلط تھی۔

"شہنشاہ ہو گیا تا تو قربانی تجھے ہی دینا پڑے گی کم عقل عورت۔" وہ بولا۔

"عورت ہوگی تیری ماں، مردود۔" میں نے اس کے دولگائے۔

"دعوتی ٹھیک کہہ رہی ہے عاشق تو ایسے ظاہر کر کہ جیسے کود جائے گا پر کودے گا نہیں۔" ہم سب نے مل کر عاشق کی ایسی برین واشنگ کر دی کہ وہ اگلی صبح چھت پر جا کے کھڑا بھی ہو گیا۔

"دادا جی! میں کود جاؤں گا۔" ڈر خوف سے آواز خود کانپ رہی تھی۔

"کود جا شامش۔" دادا بولے۔

"ہائے میرا بچہ، میرا لعل۔" پھوپھو تو دادا پر راشن پانی لے کر چل دوڑیں۔

"میں جاؤں گی اپنے پتر کا رشتہ لے کر، نہیں کوئی جاتا نہ جائے۔" بس پھر، عاشق کو تو صرف ایک گھنٹہ چھت سے لٹکانا پڑا بس۔ کیس تو سارا پھوپھو نے لڑا اور پھوپھو کی جب زبان چلتی ہے ناں تو آ رہے کو بھی مات دے جاتی ہے۔

☆.....☆

آج ہمیں صبغہ کے گھر رشتہ لے کر جانا تھا۔ متوقع طوفان کے پیش نظر عاشق و دادا ابا کی ہزار گھوڑیوں کے باوجود خود ساتھ جا رہا تھا۔

"مجھے پتہ ہے آپ لوگوں نے وہاں جا کے کیا تماشا لگاتا ہے۔" داعی اسے سب پتہ تھا، اسی تھالی کا بڑھتا ہوا بھی، کوئی اور موقع ہوتا تو شاید دادا کسی کو بھی نہ لے کر جاتے مگر اب جو عاشق نے پوچھا کہ "کون کون جائے گا" تو جیسے اس کی عقل پہ ماتم کرتے ہوئے کہہ دیا۔

"کون کون کیا مطلب.....؟ سب جائیں گے۔" عاشق باقاعدہ چکرا گیا۔

"دادا جی! کوئی بات ہے کرنے کی۔" وہ منہ نہ لیا۔

"اوئے زیادہ بکواس کی ناں تو ہیں بیٹھے جاؤں گا، سمجھا۔" عاشق نے ایک ایک کی منتیں کریں مگر بے سود۔

"بے غیر تو جب تمہارے اد پر یہ دقت آئے گا تو پھر دیکھنا۔"

دادا نے باقاعدہ اسے ایک لسٹ تھائی جس میں وہ تمام کام درج تھے جو صبغہ کے گھر میں نہ ہو رہے ہوں۔ ماہانہ رقم سے 25cm لمبی لسٹ تھی جو دادی اور ماریہ کی ای کے تعاون سے تیار ہوئی تھی۔

"مجھ سے کوئی بحث نہ کرے ان کے گھروں میں تصویریں نہ ہوں، دیے نہ ہوں۔" عاشق رو دے والا ہو گیا۔

"دادا جی وہ ان کا گھر ہے فٹ پاتھ نہیں۔"

دادا کا ایک ہی جواب۔ (بکواس نہ کروئے) زرق برق لباس دیکھ کر وہ ادھر کھول گیا۔ احمد اور علی سوٹ پہن رہے تھے، زین سوتیوں سے آراستہ جوڑا اور ماریہ تو باقاعدہ شرارہ نکال لائی، عاشق کا اور کسی پر تو زور چلانہ، اس کی گردن دیوچ لی۔

"چھٹیل کچھ اور بہن لے، ورنہ ماردوں گا۔"

اد ماریہ کی ایک ہی جائے پناہ تھی "دادا جی۔"

"ایک بار صبغہ کو فون کر کے یہ ساری لسٹ سنا دے بہتر رہے گا۔" عمیرہ واحد بندہ تھا جو عاشق کے

ساتھ تھا۔ شاید اسے اپنا وقت یاد تھا 22 لوگ۔ دادا جی رشتہ لے کر جا رہے ہیں، بارات نہیں۔" دادا نے ہوا میں اڑادی۔

دین میں بھر کے ہم لوگ صبغہ کے گھر پہنچے۔ سارا راستہ عاشق نے ایک ایک کی منتیں کیں، سب سے پہلا اعتراض ان کے گھر پر ہوا۔

"اتنا چھوٹا گھر۔" شمینہ چچی کی بات پر عاشق کھول گیا۔

"صرف چار افراد ہیں وہ، ہماری طرح پورا قبیلہ نہیں ہے۔" اس موقع پر دادی عاشق کی ہمنوا تھیں۔

"میں نے تو کہا دی تھا کہ اس بڑھک ماری فون نہ لے کے آؤ۔" دوست تو ان کے دروازے پر کھڑے لڑنے ہی میں گزر گئے۔

"او خدا کا واسطہ بس کر۔" عمیر نے کہتے ہوئے نیل بجائی۔ دروازہ صبغہ کے والد نے کھولا، ان کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے دادا نے ان کا ایک ہتھیلی جاتزہ لیا اور نظریں نٹخوں سے نیچے آتے پانچوں پہ ٹھہر گئیں۔

"دیکھ سنت دی خلاف ورزی۔" انہوں نے باقاعدہ مڑ کر عاشق کو جتایا۔ صبغہ کے والد بھی شامند سوا سیر ہیں۔

"اد جی آپ ذرا ایک نظر اپنی فوج پر تو ڈالیں۔ آدھے سے زیادہ فرنگی کھاتے، پیئیں گے، کہاں جا رہی ہیں۔"

تو، اتنی جرات، دادا تو وہیں سے داہیں مڑنے لگے۔ عاشق اور عمیر ہاتھ جوڑ جوڑ کر اندر لے کر گئے۔ سارے گھر کا ایسے ہوا، چائے آئی تو دادا ایک بار پھر زبان نہ روک سکے۔

"اد جی اس کے اوپر کچھ بڑھا تو نہیں ہے، کوئی ختم دم۔" عاشق نے کپ کوئی سود فدا اٹھایا اور عمیر سے نیچے رکھ دیا۔

"ہاں جی بڑھا تو ہے، بسم اللہ بڑھی تھی۔ وہ تو بڑھتے ہیں ناں آپ بھی۔" تاک تاک کے سنانے لگے۔ صبغہ آئی تو سو قصص اس میں نکلے۔

"ادے ہوئے، اس پہ مر گیا تو، یہ "عاشق شرمندہ ہو ہو کر آدھا بھی نہ رہا (لڑکی اچھی چھلی تھی) کھانے تک عاشق نے کوئی بحث نہ چھیڑنے دی۔ مگر کھانے والے کمرے میں سائیڈ ٹیبل پر دادا نے ایک تصویر ڈھونڈ لی۔

"فرشتے نہیں آتے اس گھر میں جہاں تصویریں ہوں، وہ بھی انسانوں کی۔"

صبغہ کے والد کی بھی شامند بس ہوئی تھی۔ "بیمہ مرشد ہیں یہ ہمارے۔"

وہ بولے۔ "دیکھ لے عاشق! یہ بیروں فقیروں کے خاندان میں رشتہ جوڑے گا اب تو۔"

عاشق گھبرا گیا۔ "دادا جی میری بات سنیں۔" مگر دادا نے اب اس کی کہاں سنی تھی۔

"کوئی تم جیسے بے فقیروں سے تو ہم فقیر بھلے۔ سنت پہ چلتے ہیں ہم، سنی سنیں۔"

دادا بھڑک گئے۔ "شر رو کتارہ گیا۔"

صبغہ ایک ہاتھ رکھ رکھ کر اپنے باپ کو چپ کر داتی رہ گئی مگر..... وہاں سنی، وہاں کی ایسی بحث چھڑی کہ برادری تو کہیں اندر ہی بہہ گئی۔ الامان الحفیظ۔ ادھر سے ہم دادا کو گھسیٹتے اور ادھر سے صبغہ اور اس کا بھائی اپنے باپ کو۔ توبہ توبہ اچھا خاصا لڑ بھگڑ کر دادا باہر آ گئے۔ عاشق تقریباً روتے دالا ہو گیا۔

"انگل جی بات تو سنیں، کیا ہو گیا۔" صبغہ کی آواز سن کر دادا ایک دم رکے۔ "بھیری گل سن کڑیے! تو پڑھی لکھی ہے، اچھے برے کی تمیز ہے تجھے، پھر یہاں آ کر میری عقل کہاں چلی گئی، کبھی سوچا ہے تو نے کہ یہ ویہا کر کے تجھے کیا ملے گا۔ ایک خاندان ساری عمر ایک لڑکی کو عزت نہیں دے

زلزلہ، زکام، کھانسی سے پریشان؟

سعالین اور ضد وری موثر حل، فوری آرام



<http://www.paksociety.com>

گی۔ میری قبر میں، میں ہی سوؤں گی آپ نہیں۔ تو پھر نگر بھی مجھے ہی ہونی چاہیے ناں۔ شادی کے بعد میری پہلی اطاعت اپنے شوہر کی ہوگی اور بس۔ خدا نہ کرے شرک تو نہیں ہوں میں، کلمہ پڑھتی ہوں نماز پڑھتی ہوں۔ یہ سب مجھ سے میرے دل نے کہا ہے انکل جی وہ دل جس میں خدا رہتا ہے اور خدا کو تو آپ بھی مانتے ہیں ناں خدا تو آپ کے دل میں بھی رہتا ہے ناں، میرا زور اپنے ماں باپ پر چل سکتا ہے جو میں نے چلا لیا۔ اب اگر آپ مجھے ٹھیک سمجھیں تو کل ہم آجائیں گے ورنہ..... "وہ ذرا دیر کورکی۔" ورنہ یاد رکھیے گا اگر برادری اور مسلک کا یہ فرق آپ مجھے کسی کتاب میں نہیں دکھایا سکیں گے۔" آج صفیہ، دادا کو خاموش چھوڑ گئی تھی۔

☆.....☆

"ہوں..... کیا لگتا ہے آپ کو کہ کیا ہوا ہوگا۔ ہاں جی بالکل ایسی تقریر سن کر تو سنی و وہابی مولوی خاموش رہ جائیں تو یہ تو پھر ہمارے دادا جی تھے۔ اس کے جانے کے بعد بولے۔" اس کے آنے کے بعد عمیر کی قیمت کم ہو جائے گی اس سے زیادہ اچھی تقریر کرتی ہے یہ۔"

رات ہی صبح کے گھر فون کر دیا نئے سال کا پہلا دن عاشر کے لیے خوشیاں ہی لے کر آیا۔ کاش یہ بات تمام لوگ سمجھ لیں کہ ہر ایک نے اپنی قبر میں سونا ہے اور اس قبر میں جانے کے لیے نامہ اعمال تیار کرنا بھی ہر فرد کا اپنا ذاتی کام ہے۔ کوئی دوسرا اس کے لیے یہ سب نہیں کرے گا۔ دوسروں کا بس ایک کام ہے راستہ دکھانا اور بس!!

☆.....☆

پائے گا۔ پوری زندگی بھی تو خدمت کرے تو ماریہ اور شمینہ جیسی شفقت نہیں کما پائے گی، مزاروں پر جانا بند، پیروں کی بیعت بند، قبروں پر جانا بند دو عقیدوں کے درمیان پھنس جائے گی تو۔ ہمارے جیسا بننا چاہیے گی تو گھر والے ناراض۔ کیسے بیٹھ کر کھایا کرے گی ختم کے چاول؟ کیسے سنایا کرے گی اپنے پرداداؤں کی بری، کہتا بہت آسان ہوتا ہے پتری کہ محبت کے سہارے سب خود ہو جائے گا پر نہیں ہوتا۔ سمجھ لے اس بات کو، یہ کم عقل تو سمجھتا نہیں ہے۔"

دادا جی شاکر حرف بہ حرف صحیح کہہ رہے تھے۔

☆.....☆

وایسی پر ہم میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ سب خاموش۔ عاشر سیدھا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ اگلا پورا دن گزر گیا مگر عاشر کمرے سے نہ نکلا۔ کل نئے سال کا سورج طلوع ہونا تھا۔ عصر کا وقت دعا جب ماریہ اور زین چلاتے ہوئے پھوپھو کے پورشن میں آئے۔

"عاشر! صبح آئی ہے۔ عاشر....." عاشر تیر کی طرح اپنے حجرے سے باہر آیا۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔

وہ سیدھی دادا جی کی طرف گئی۔ "انکل جی! بہت سوچا ہے میں نے، آپ کی ساری باتیں درست ہیں مگر پتا ہے ان ساری باتوں کا میرے دل نے کیا جواب دیا۔ دل نے کہا کہ پھر کیا ہوا۔ بخاری شریف میں تو نہیں دیکھا کہ برادری سے باہر رشتے جوڑنا گناہ ہے۔ دل نے کہا کہ عزت کا معیار برادری نہیں، انسان کا کردار ہوتا ہے۔ آپ بے شک نہ مانتیں مگر میں مانتی ہوں انکل جی کہ میری خدمت مجھے اس گھر میں عزت ضرور دلائے گی کیا ہوگا جو ختم والے چاول میں اکیلے کھاؤں

# فراغت

سرما کی دھسی دھوپ نے ہر شے کو نکھارا ہوا تھا، جن میں لگا پیڑ، چھپاتی چڑیاں، مالٹوں کی ٹوکری اور دبیر کی اداسی..... سارا منظر واضح تھا۔ ہر کوئی مصروف تھا۔ رومہ کو آج کھلی فراغت نصیب ہوئی۔ وہ اپنی جلد کے معاملے میں کافی حساس تھی۔ اب بھی چہرے پر ماسک لگائے، آنکھوں پر کھیرے کے قتلے رکھے،

بالوں کو سفید تو لیے میں لپینے، جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑے کرسی پر بیٹھی دبیر کی دھوپ سینک رہی تھی۔ ”زین! سمسٹر کیسا رہا؟“ صحن میں آتی رابی کی آواز ابھری۔ زین بھی ابھی گھر میں نمودار ہو رہا تھا۔ ”جینے لگا ہوں پہلے سے زیادہ، پہلے سے زیادہ کھانا کھانے لگا ہوں۔“ لہک کر گاتے ہوئے وہ رکھا اور رومہ کو مخاطب کیا۔

”او..... او کیا تھا اس کامیوز کدومہ تم بجاؤ وہ.....“ سدا کا گانوں کو بگاڑنے والا زین عادتاً کہہ رہا تھا۔ رومہ کے ماتھے پر شگن ابھری، آنکھوں کے

سامنے پردہ تھا مگر کان تو کھلے تھے۔ ”زین! تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرے فوٹو سگر کے گانے کو بگاڑنے کی۔“ اعصاب تن نچکے تھے اور سانس تیزی سے آرہی تھی زین تیری خیر نہیں۔ ”دیکھو ہوگئی۔“ وہ اسے چڑانے لگا۔ ”میں تمہیں کہہ رہی ہوں مجھے غصہ نہ دلاؤ، ماسک لگا کر خود کو ریمیکس رکھتے ہیں ورنہ چہرے پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ سبھی میں تمہارے ساتھ سکون سے بات کر رہی ہوں ورنہ.....“ داہرے مصومیت۔





”ورنہ تم مجھے قتل کر دیتیں ہاؤ فنی۔“ زین دل کھول کر ہنسا۔  
 ”دیکھا میں کہتی تھی نا کہ تم میرے دشمن ہو، تبھی غصہ دلا رہے ہو کہ میرے چہرے کو جھریاں ڈھانپ لیں۔“  
 آواز میں کمی سائی تھی۔ زین کو اپنی بہن سے وقتی ہمدردی ہوئی، رابی میگزین میں مصروف ہو چکی تھی۔  
 ”جھریاں تو نہیں مگر مارک ضرور تمہارا چہرہ ڈھانپتا ہے۔“ رابی کی زبان میں گدگدی ہوئی۔  
 ”خبر دار! میری بہن کو کچھ کہا۔“ زین اچانک رومہ کا حمایتی بن گیا۔ اور پھر رابی اور زین کے درمیان جنگ عظیم سوئم شروع ہو گئی۔ کچھ دیر برداشت کر لینے کے بعد، رومہ نے ناگواری سے گھبرا کر آنکھوں پر سے کھیرے کے قتلے اتارے۔ اس کے ہوش گم ہو گئے۔ زین کی آنکھیں بند تھیں اور کچھ فاصلے پر بیٹھی رابی کی آنکھیں بھی بند تھیں، مگر ان کا باقی جسم ساکت ہرگز نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے کو مسلسل پڑا رہے تھے، مگر زین نے آنکھیں بند کیوں کیں وہ رابی کو دیکھ نہ لے اور رابی کا بھی یہی حال تھا۔  
 ”بد تمیز، جاہل۔“ رومہ بڑبڑائی۔  
 ”تم لوگوں نے شرم کو بھی محسوس کیا ہے، اتنے بڑے ہو گئے ہو مگر عقل نام کو نہیں۔“ رومہ نے ناگواری سے کہا۔ وہ ایسی حرکتوں سے سدا کی ال جک تھی۔  
 ”تم ادھار دے دو۔“ رابی کہہ کر ٹھہری نہیں۔  
 زین بھی چلتا بنا۔ وہ کھڑی کھولتی رہی۔  
 ”بے شرم، ڈھیٹ، سبھی بد تمیز۔۔۔۔۔۔ صرف رومہ تمیز دار۔“

☆.....☆

سردیوں کی وہ لمبی چھٹیاں شروع ہونا چاہتی تھیں جن کا سال بھر بے تابی سے انتظار کیا جاتا ہے، بچے، ہالے سبھی خوش تھے۔ امی نے آج ہی کھانے کی میز پر خوش خبری سنائی تھی۔  
 ”تمہارے ابو کی بوا کا فون آیا تھا آج، انھوں نے

تمہارے ابو کو رضامند کر لیا ہے کے تم لوگ دبیر کی چھٹیاں ان کے ہمراہ گزارو گے۔ تمہارے ابو کہہ رہے تھے کے وہ بھائی جان سے بات کریں کے کے رابی اور سعد وغیرہ کو بھی تیار کر دیں۔“ امی کی بات پر ان کی باپچیں کھلیں تو آنکھوں نے بھی پھٹ پڑنے کو جھنڈا باندھ لی۔  
 ”امی! صدقہ جاؤں آپ کے۔“ زین نے تو ان کے گلے میں بانہیں ڈال لیں، تاہم رومہ کو حیرت دور کرنے میں وقت لگا۔  
 ”اور کون جائے گا امی؟“ سوال رومہ کی طرف سے تھا۔  
 ”تم سب بچے ہی جاؤ گے یا میں اور تمہاری مائی امی میں سے تم لوگوں کے ساتھ کوئی چلا جائے گا۔“ ہوں۔۔۔۔۔۔ بہت خوب۔“ زین پر جوش ہوا۔  
 ”مگر امی، یہ زین، سعد اور رابی بہت بد تمیزی کرتے ہیں، ہر کسی کے سامنے اپنی اوٹ پٹانگ حرکتوں سے انسلٹ کراتے رہتے ہیں، ان لوگوں کے زرا کان سمجھ کر بھیجے گا۔“ رومہ نے دل کی بات کب بھی دل میں رکھی تھی۔  
 ”تو تم بھی اوٹ پٹانگ حرکتوں کو انجام دیا کرو، پھر کہاں کی انسلٹ۔“ سعد نے حاضری دی۔ اپنے مخصوص انداز کے ساتھ رومہ بھی ان تینوں کی ہی ہم عمر تھی تاہم خود کو زرا تمیز دار اور ان سب کو بہت بد تمیز سمجھتی تھی، بات سچ بھی تھی مگر۔  
 ”تم تو اپنی زبان بند ہی رکھو بجائے۔“  
 ”بجائے شرم سے پانی پانی ہونے کے، بے شرمی اور ڈھٹائی سے برف ہو گئے ہیں۔“ سعد نے اس کی بات اچکی۔  
 ”یہی کہنے لگی تھی نا غالباً مس رومہ۔“ زین نے اشارے سے سعد کو داد دی۔ رومہ ”اوں“ کہہ کر منہ پھیر گئی۔  
 ”چچی جان! بڑی جاندار خبر سنائی ہے ذرا جاندار

سا کھانا بھی کھلا دیں۔“ سعد، زین کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔  
 رابی سر تک چادر تانے دھوپ میں چار پائی پر لیٹی ہوئی تھی اور رومہ سعد اور زین قریب بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔  
 ”تمہاری امی تو کافی فیلتنگو لیس واقع ہوئی ہیں۔ بے چاری رابی کب سے ”دھوپ ہڑتال“ کیے ہوئے ہے مگر نور سپونس۔“ زین گویا ہوا۔  
 ”یہ آئیڈیا تمہارا ہی تھا اور کتنا بوڑھا ہے۔ بھلا اس قدر سردیوں میں دھوپ ہڑتال کرنے سے امی کو کیا فرق پڑنے والا ہے، تمہیں کوئی ایسا آئیڈیا دینا چاہیے تھا کہ مثلاً دھوپ میں پڑے رہنے کے بجائے اے کن روم میں لیٹی تو امی کو اس کی ٹکڑی ہوتی۔“ زین کافی سمجھداری سے بولا۔ رابی تڑپ کر اٹھی۔  
 ”تم سب دماغ کے بغیر ہی ہو، کیسے بے مروت ہے مجھے AC میں لٹا رہے ہو، کوئی ڈھنگ کا آئیڈیا تو ہے نہیں۔“  
 ”سوچتے ہیں۔“ رومہ بولی۔  
 ”امی جان مجھے تم لوگوں کے ساتھ بوا کے ہاں بھیجا نہیں چاہتیں، بقول ان کے مجھ میں تمیز نہیں اور ان میں نے تم لوگوں امی کو اموشنل کرنے کا آئیڈیا مانا ہے ہی لیا، تو کیسے بوسگے آئیڈیا ز دے رہے ہو، دھوپ میں لیٹ جاؤ، AC میں لیٹ جاؤ۔ اب تو دھوپ میں لیٹ کر میں پر لیس ہی ہو چکی ہو۔“ رابی دانت پیس کر بولی۔  
 ”چھوڑو ہم خود تابی امی کو منا لیتے ہیں۔ ان پر ایسی ترکیبوں کا اثر نہیں ہونے والا۔“ رومہ نے بات جس شرم کر دی۔  
 ”میں نے دیکھا انھیں سنا کے ہراک ترکیب لگا کے ہر نئے کو آزما کے پردہ نہیں مانتیں۔۔۔۔۔۔ ہینگ اور۔۔۔۔۔۔“  
 ”شٹ اپ۔“ رومہ نے ناگواری سے زین کی

ہانک کو توڑا۔ اور پھر اگلی ہی صبح سب بوا کے گھر کی چھت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بوا خاندان بھر میں کافی کنجوس واقع تھیں، مگر وہ بھی شرم سے پانی ہونے کے بجائے ڈھٹائی سے برف ہونے والے تھے، بوا کیا چیز تھیں۔  
 گھر سے بڑا کوئی ان کے ساتھ نہیں تھا۔ تاہم نصیحتوں کی ٹوکریاں اور مس نصیحت (رومہ) ان کے ہمراہ ہی تھی۔ بوا کا گھر یہی تھا۔  
 ”اب منہ کیوں لٹکائے کھڑے ہو، دروازہ بجاؤ۔“ رومہ کو اچانک سے اخلاقیات کا دورہ پڑا تھا۔  
 ”تمہارے ہاتھ ٹوٹے ہیں۔“ سعد اس سے متاثر ہونے والا نہیں تھا۔ رومہ نے ایک خطرناک گھوری سے اسے نوازہ اور دستک دی۔ تقریباً ان ہی کی ہم عمر لڑکی نے دروازہ کھولا تھا۔ اور فردا فردا آپ سے ملنے کے بعد ابھی تک دروازے ہی میں کھڑی تھی۔  
 ”آپ کے ہاں ملنے ملانے کے علاوہ بھی کوئی رسم ہوتی ہے؟“ زین نے رازداری سے پوچھا۔ نا سمجھ لگا ہیں اس کی جانب اٹھیں، رابی اور سعد کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ابھمن بڑھنے لگی اور رومہ کی گھوریاں بھی۔  
 ”ہم یہاں سے ہی لوٹ جائیں؟“ رابی نے پوچھا۔ لڑکی شاید حد سے زیادہ اتحق تھی یا ہوتی بن رہی تھی۔  
 ”آپ کے ہاں مہمان کو دروازے سے ہی ٹر خا دیا جاتا ہے۔“ سعد ہنسی دباتے ہوئے بولا۔ ابھمن سنبھلی، چہرے پر بوکھلاہٹ کے آثار نمودار ہوئے اور پھر ہنسی چھوٹی۔  
 ”اوہ۔۔۔۔۔۔ اچھا اچھا آئیے۔“ راستہ دے دیا گیا۔  
 ”مہربانی جی“ زین نے لقمہ دیا۔ بوا محن ہی میں پلنگ پر لیٹیں، دھوپ سینک رہی تھیں۔  
 ”میرا نام نازی ہے اور یہ رہی بوا۔“ نازی کو گویا یاد آئی گیا۔  
 ملنے ملانے کا سلسلہ تمام ہوا تو بوا کو خاطر، مدارت

کا خیال آگیا۔

”جانا زاری! مہمانوں کے لیے کچھ چائے پانی لا۔“  
حکم کی تعمیل ہوئی۔ رومہ ان تینوں کی کھسر پھسر پر جربز  
ہور ہی تھی۔

”بد تمیزوں! یہاں ہی سدھر جاؤ، شرم نہیں آتی  
پہلی دفعہ آئے ہو کیا سمجھیں گی بوا بھی۔“ رومہ آہستگی  
سے بولی۔

”مہربانی ہوگی اگر اپنا کچھ خود تک ہی محدود رکھو۔  
اگر یہاں بھی استانی بننے کی کوشش کی تو قرہاں نہر میں  
دھکا دے جاؤں گا جاتے ہوئے۔“ زین کوفت سے  
بولی۔ احساس تحقیر سے رومہ غصے سے بے قابو ہونے  
لگی مگر ضبط رکھا۔

”تم لوگوں کو تو بچو! خوب سبق دلاؤں گی۔ یاد رکھو  
کے رومہ کو بھی۔“ وہ دانت پیتے ہوئے سوچنے لگی۔

چائے پیش کی جا رہی تھی۔ ان سب کو زوروں کی  
بھوک لگی تھی۔ مگر یہ کیا پتلی سی چائے اور ایک پلیٹ  
میں اسٹک۔ سب کو حیرت ہوئی۔ کسی نے بھی ابھی  
چائے پینا شروع نہیں کی۔ وہ گلاب جاسن، رسلانی،  
سلاٹس، نمکو، کھوئے والی برنی، چکن پکوڑے، سو سے  
اور کبابوں کے بھی منظر تھے۔ چائے ٹھنڈی ہوتی رہی  
مگر کچھ اور نہ آیا۔ آخر بوا کو کہنا پڑا۔

”اے ہے بچو! اپنی کیوں نہیں رہے چائے، ٹھنڈی  
ہور ہی ہے۔“ حکم تھا اور کچھ مروت، گھونٹ گھونٹ،  
کڑوا شربت حلق سے اتارا گیا۔  
ابھی حیران ہونے کو اور بھی بہت کچھ تھا۔

☆.....☆

نازی ان سب کی حیرانگی بجانب کر خوب ہنسی تھی،  
وہ جانتے تو تھے کہ بوا کبجوس ہیں مگر اس قدر، پہلی  
دفعہ آئے مہمان کی تو ہیں۔

”بوا سے اگر خاطر مدارت کی توقع لگائے بیٹھے ہو  
تو غلط سوچ رہے ہو۔“ نازی کافی منہ پھٹ تھی۔ سب  
نے بیک وقت اسے گھورا۔

”جی نہیں ہم یہاں صرف بوا سے ملنے آئے ہیں،  
ہم نے کبھی کچھ کھایا نہیں جو تم ایسے کہہ رہی ہو۔“ زور  
رسانیت سے گویا ہوئی، اس سے پہلے باقیوں میں  
سے کوئی حساب برابر کرتا۔

بوا تھیں تو بوڑھی مگر بوڑھی تھیں نہیں۔ جانے ان  
میں ایسی پھرتی کہاں سے عود آئی تھی کے بھانگ بھانگ  
سب کام بنتا تھیں۔

”یار! یہ بوا تو ہمیں بھوکا مار دیں گی، صبح کا  
ناشتہ..... وہ بھی برائے نام اور پھر مروتا بھی کچھ  
کھانے کا نہیں کہتیں اور پھر شام کا کھانا۔“

زین باقاعدہ رونے والا ہور ہاتھا۔  
”ہمیں بھی ساری مروت ایک طرف رکھ کر اسے  
اصلی رنگ میں آجانا چاہیے۔“ رابی نے اس کی تائید  
کی۔ انداز مسخر اڑانے والا تھا۔

”خبردار! کچھ اوٹ پٹانگ حرکتیں کیں، ورنہ ابو کو  
شکایت لگاؤں گی۔“ رومہ انھیں لتاڑنے کے نیلے  
جانے کہاں سے آن بیٹگی۔  
”یار! تم تو اپنی رائے محفوظ ہی رکھا کرو۔“ سعد چڑ  
گیا، رومہ دانت پیس کر رہ گئی، اسی دوپہر ہی پھر  
بھوک سے بے جان ہوتے ہوئے انھوں نے  
ڈھٹائی کا ثبوت دے دیا۔

”بوا! آپ کے ہاں دوپہر کو کھانا نہیں بنتا؟“ رابی  
چکن میں جھانک کر بولی۔  
”نہیں بچے! ہمیں تو عادت نہیں، کہو تو تمہیں کچھ  
بنادوں؟“ بظاہر اوہ جوش سے بولیں مگر رابی جانتی تھی  
کہ وہ تو بس مروتا صلح مار رہی ہیں۔

”ہاں، ہاں کیوں نہیں، بریانی بنا لیتے ہیں۔“ وہ  
امید کی ڈوری کو تھام کر بولی جو بوا جانے انجانے میں  
اس کی جانب بڑھا چکی تھیں۔ ”آپ کے ہاتھ کی  
بریانی کی تو ابو ابھی تک گھر میں مثال دیتے رہتے  
ہیں۔“ زین نے لقمہ دیا۔

”مجھے تو نہیں یاد پڑتا کہ کبھی میں نے بریانی بنائی

ہو اور وہ بھی تمہارے ابو نے کھائی ہو۔“ بوا ان کے  
دام میں آنے والی نہیں تھیں۔

”چلیں ہم دیا کریں گے اپنے بچوں کو آپ کی  
مثالیں۔“ سعد لا پرواہی سے کہتا ہوا چھت کی طرف  
جانے والی میڑھیاں چڑھنے لگا۔

☆.....☆

سعد سوائل پر کوئی سووی دیکھ رہا تھا، بریانی دم پر  
تھی۔ رابی چکن میں کھانے کی تیاری کروا رہی تھی۔  
رومہ بھی چھت پر چلی آئی۔

”اتنی بوٹگی سووی دیکھ رہے ہو، بندہ کوئی ڈینٹ  
سی اسٹوری والی سووی دیکھے۔“ رومہ نے اسکرین پر  
لگا دوڑاتے ہی ناک چڑھائی۔

”دسمبر کے بعد ہماری منگنی ہونے والی ہے، اور  
ہمارا کی آمد کے ساتھ ہی خزاؤں مطلب شادی کی نوید  
بھی سنائی جائے گی، تب مس رومہ، تمہیں اتنی بوٹگی  
سووی دکھاؤں گا کہ تم ڈینٹ، ٹانس، اسٹوڈ اور  
بوٹگی جیسے ورڈز کو اپنی ڈکشنری سے ریوڈ کر دو گی۔“

سعد طنز سے بولا۔ رومہ بھڑک اٹھی۔  
”شکل دیکھی ہے اپنی میں تم جیسے کسی غیر مہذب  
سے شادی ہرگز نہیں کروں گی، مان سلیس، تم سے تو  
میری جوتی بھی شادی نہ کرے۔“

”اب ذرا اپنے لفظوں پر غور کرو، تم کتنی مہذب  
ہو؟“ سعد کا وہی سپاٹ لہجہ۔  
”اسٹوڈ کہیں کے تم تو میرے منہ ہی نہ لگو۔“ وہ  
چلا اٹھی۔

”سیم ٹو بو۔“ آرام و اطمینان سے جواب آیا۔  
رومہ جل جھن گئی، وہ جو بریانی کا بلاوا دینے آئی تھی،  
پھر پختی ہوئی نیچے چلی گئی۔

”اے، بے لڑکے! میری طرف سے آئس کریم  
کیوں؟ میرا کوئی پرائز بانڈ نکلا ہے۔“ حیرت سی  
حیرت۔ بے مروی حد سے سوا۔

”بوا! ہم آخری بار آپ کے ساتھ آئس کریم کھانا  
”غالباً ہم نے بریانی کا کھانا۔“ زین نے آلو  
والے چاول دیکھ کر منہ بنایا۔

”بوا کو لڈر تک بھی لیتے آئیے۔“ سعد نے ہانک

لگائی۔ بوا بڑبڑانے لگیں۔ ابھی وہ انکار کرنے والی  
تھیں کہ نازی بولی۔

”بوا! فرنج میں پڑی ہے، آج سنگوئی تھی میں نے۔“  
وہ ہنسی دبا کر بولی۔ بوا دانت پیتے ہوئے چلی گئیں۔

”بوا! میری پلیٹ میں ہڈی والے آلو (بونیٹاں)  
ڈالے۔“ رابی مسکرائی۔ رومہ نے اسے گھور کر دیکھا،  
وہ کب سے ان کی بد تمیزی برداشت کر رہی تھی، مگر  
سعد سے تازہ لڑائی ہوئی تھی سو بول نہیں رہی تھی۔ کولڈ  
ڈرنکس آگئیں۔ بوا نے ایک لیٹر کوک کوسات گلاسوں  
میں ڈالا تھا۔ اتنی سردی میں اتنی برف.....

کوک اپنا اصلی رنگ کھو کر شیشے کے گلاسوں میں  
سے سنہری نظر آ رہی تھی۔

زین نے ”چہ چہ“ کہہ کر انیسوس سے گلاس کو  
دیکھا اور پھر بوا کو دیکھا۔ مگر ان کی ڈھٹائی عروج پر  
تھی۔

”بوا! رات کو کھانے میں کیا بنانا ہے؟“ نازی  
بولی۔

”رات تو دور کی بات پہلے شام کی چائے کے  
بارے میں سوچا جائے۔ کیوں نا بوا لکا پھلکا اہتمام کر  
لیں۔“ رابی مسکرائی۔ بوا کی پھنسی پھنسی آواز ”ہاں“  
میں نکلی۔

”شام میں چائے کے ساتھ ساتھ گاجر کا حلوہ،  
دہی بھلے اور کباب بنا لیتے ہیں۔ فردٹ کسٹرز رات  
کے کھانے میں ہو جائے گا، اور پھر سب مل کر بوا کی  
طرف سے آئس کریم کھانے جائیں گے۔“ زین  
جوش سے بولا۔ تاہم بوا کو چڑانے والی مسکراہٹ  
ہونٹوں پر کھیل رہی تھی بوا جو اتنی لمبی لسٹ پر ہونق سی  
دیکھ رہی تھیں آخری فرمان پر تو اچھل گئیں۔

”اے، بے لڑکے! میری طرف سے آئس کریم  
کیوں؟ میرا کوئی پرائز بانڈ نکلا ہے۔“ حیرت سی  
حیرت۔ بے مروی حد سے سوا۔

”بوا! ہم آخری بار آپ کے ساتھ آئس کریم کھانا

چاہتے ہیں تو مضائقہ کیا ہے۔“ سعد زری سے بولا۔ بوا منہ لٹکائے بیٹھی رہیں رومہ بھناتی رہی۔

☆.....☆

”بد تمیز لڑکی میرے بھائی پر لائن مارتی ہے۔“ صحن میں زین، رابی اور نازی کو دیکھ کر برآمدے میں کھڑی رومہ بڑبڑائی۔

”ہینسل سے یا پین سے؟“ قریب سے سعد کی آواز ابھری۔ رومہ کی تیوری چڑھ گئی، جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ رابی مرغی کے اٹھنے کو کڑی میں لیے برآمدے کی طرف آ رہی تھی۔ زین کو شرازت سوچھی، اس نے ایک مرغی کو رابی کی طرف اچھالا۔ مرغی، رابی کے سر پر لگی اور عمل کار عمل ہوا۔ بالکل اگر مخالف سمت میں، نیوٹن کا قانون امر ہوا۔ جواباً اٹھوں کی ٹوکری زین کی طرف اڑی، چیخیں بلند ہوئیں دونوں کا برا حال تھا، اٹھنے ٹوٹ چکے تھے۔ زین کے جسم پر جا بجا اٹھنے لگے ہوئے تھے اور رابی کے بال ایسے جیسے بم بلاسٹ ہوا ہو، دونوں بوکھلا گئے اور جواباً ایسی دھواں وار لڑائی ہوئی (صرف زبانی کلائی) کے بس۔ سعد نازی نہیں رہے تھے، ہنسی تو رومہ کو بھی آ رہی تھی، مگر چھپائے رکھی اور پھر زین اور رابی بھی ہنسنے لگے اور دل کھول کر ہنسنے بوانے سر پیٹ لیا ان کا اتنا نقصان ہو گیا تھا، دسمبر کی آخری شاہیں تھیں، وقت آگے بڑھ رہا تھا رومہ کا غصہ بھی بڑھ رہا تھا۔

”سدا کے بد تمیز ہوتم دونوں، شرم نہیں آتی، بوا کے سارے اٹھنے توڑ کر رکھ دیے۔“ وہ روانی میں بولتی چلی گئی۔

”ہائڈ یور لیٹگو ج مس رومہ! اٹھنے مرغیوں کے تھے۔“ زین اسے تڑانے کو بوا کے گلے میں بازو حائل کرتے ہوئے بولا۔ ان کا غصہ بھی تو دور کرنا ہی تھا۔ بولنے سے جھٹکے سے برے کیا۔

”زیادہ پرے رہ کر بات کرو نہ۔“ زین کے جسم سے اٹھوں کی مہک آ رہی تھی۔ سب نے بمشکل ہنسی

دبائی۔

”خبردار! آئندہ گڑبڑ کی، میں ہرگز کوئی لحاظ نہیں کروں گی۔“ بوا کی برداشت بس اتنی ہی تھی۔ برداشت بھی بے دفائی کر چکی تھی۔ بوا کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔

”بوا! چھوڑیں انہیں میں گھر جا کر ابو کو ان سب کی شکایت لگاؤں گی۔“ رومہ، بوا کی اچھی مہمان بن کر بولی۔ رابی نے کوفت سے اسے دیکھا۔

☆.....☆

”زین! آج ای کا فون آیا تھا کہہ رہی تھیں کہ جنوری کے پہلے ہفتے اجمنٹ ہے۔ اپنے لینے ڈریس سلیکٹ کر لو، میں اتنی دیر سے چیک کر رہی ہوں مجھے تو کوئی پسند ہی نہیں آ رہا پلیز ہیلپ می۔“ رابی نے موبائل زین کی طرف بڑھایا تھا۔ وہ نیٹ سے ڈیرائن کیے ہوئے مختلف ڈریس دیکھ رہی تھی۔

”غالباً رابی کی ممکنہ زین سے ہونے والی ہے۔“ مالٹے کی پھانک منہ میں رکھتے ہوئے نازی بولی۔

”اور رومہ کی سعد سے۔“ دوسری پھانک بھی منہ کے اندر سب چھت پر بیٹھے دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

”اور واہ بھئی رابی۔ فیانسی صاحب کی پسند کا ڈریس بنوانے کا اچھا بہانہ بنایا۔“ نازی کی زبان پھر سے پھسلی۔

”مجھے بہانہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ مگنی تو بعد کی بات، زین میرا بڑا اچھا دوست ہے۔ میں اس سے مشورے کے بغیر اپنا اتنا ہم ڈریس کیسے بنا سکتی ہوں۔“ رابی کے جواب پر نازی کو افسوس ہوا۔ وہ تو مشرقی لڑکی کے چہرے کے ان رنگوں کو دیکھنے والی تھی جو مگنی شادی کے نام پر اس کے چہرے پر چھاتے ہیں مگر رابی کے معاملے میں ایسا کچھ نہیں تھا وہ کافی اعتماد سے کہہ رہی تھی۔

”ٹھیک کہتی ہے رومہ۔ یہ شرم سے پانی نہیں،

ڈھٹائی سے برف ہوتے ہیں۔“ نازی بڑبڑائی۔ ”رومہ! تم نے کس کی پسند کا ڈریس بنانا ہے؟“ نازی کی زبان کو بریک بھی لگ ہی نہیں سکتا۔ No Response سعد موبائل پر مصروف رہا اور رومہ نے بھی سنی ان سنی کر دی۔

”بھری ہوئی ہوتی؟“ نازی پھر سے بولی۔ ”تم چپ نہیں رہ سکتیں؟“ رومہ چڑھی۔

”لگ اٹ، یہ مجھے اور زین دونوں کو پسند آیا ہے۔“ رابی نے موبائل رومہ کی طرف اچھالا اس کی نظروں میں ستائش اتری۔

”بہت اچھا ہے۔“ رومہ نے نازی کو موبائل پکڑ لیا۔ وہ کافی اشتیاق سے دیکھنے لگی۔

”رومہ! میری مانو تم بھی ایسا ہی بنا لو۔“ رابی نے کافی خلوص سے مشورہ دیا۔ رومہ نے اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے اس کے متعلق کچھ سوچا نہیں۔“

”تو سوچ لو، چند دن تو باتی پیرا۔“ رابی جانتی تھی کہ وہ اس مگنی سے خوش نہیں ہے تب ہی ایسا سرد سا رد عمل کر رہی ہے۔ اس نے مگنی سے سعد کی طرف دیکھا۔ وہ اس کا بھائی تھا اور وہ اپنی دانست میں اس کے ساتھ بات خوب سمجھ رہی تھی مگر ماپوسی ہوئی رومہ اگر پیرا ہی تھی تو پیرا وہ اس طرف بھی نہیں تھی وہ اس سارے قصے سے دور موبائل میں مگن تھا۔

”رومہ! ابھی دیکھ لو، ای پہلے ہی اتنا غصہ کر رہی تھی۔ ذرا سا کام نہیں کر سکتیں تم لوگ، نہیں تو میں پوچھ لیتی ہوں۔“ رابی پھر سے بولی۔

”مجھے دکھانے کی ضرورت نہیں۔ جس نے پہننا ہے اس سے پوچھو۔“ سعد کہتا ہوا چلتا بنا۔ رابی دانست چلی گئی۔

☆.....☆

”اتنا داس کیوں ہو رہی ہو؟ کتنی فضول سی بات کو سن رہی تھیں ہو رہی ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے

کہ سعد کوئی سٹریل سا لڑکا نہیں اور ہم کون سا سدا کے بد تمیز ہیں، بس کبھی کبھی ہنسی مذاق کو دل کرتا ہے۔ کوئی زیادہ فرق تو ہے نہیں سعد میں اور تم میں۔ ایک ہی گھر سے ہو، ایک ہی کالج سے پڑھے ہو، عمریں بھی ایک جیسی ہیں اور مزاج تم نے خود اپنے خراب کر رکھے ہیں۔“ رابی، رومہ کے پاس بیٹھ گئی۔ ”سٹریل تو خیر سے آج کل سعد بھی بہت ہو رہا ہے۔ کوئی لفٹ ہی نہیں۔ جانے سمجھتا کیا ہے خود کو نان سینس۔“ رومہ محض سوچ سکی بولی بس اتنا ہی۔

”تمہارا بھائی ہے اس لیے ہی تمہیں پسند ہے، میں ہی بری ہوں۔“

”بات اگر بھائی کی ہو تو مجھے تو زین بھی پسند ہے اور بھائی وہ تمہارا ہے۔ تم اس کے بھی سر پر چڑھی رہتی ہو۔ بات صرف سوچ کی ہے اور تم سب کو غلط ہی سوچا کرو۔“ رابی پہلے تو ہنسی مگر پھر سنجیدگی اوزھ لی۔

”ای نے چچی کو کہہ دیا تھا۔ میں نے اپنے جیسا ہی تمہارا ڈریس آرڈر کیا ہے اور اتنی ٹینشن نہ لو، کئی دن سے تم نے فیشن بھی نہیں کیا۔ کوئی ماسک نہیں تم تو کبھی منہ سے ماسک اترنے ہی نہیں دیتی تھیں۔“

”آج کل اس لیے نہیں لگاتی کہ بڑی ٹینس ہوتی ہے، لہذا کہیں جھیریاں ہی نہ چہرہ ڈھانپ لیں۔“ سعد نے رابی کی بات اچھی رابی اٹھ کر چلی گئی اور وہ اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

”سنو! مگنی سے انکار کب تک کرنے والی ہو؟“ اس کے سوال سے رومہ کے چہرے پر حیرانگی چھائی مگر اس نے وحیان نہ دیا۔

”خیر مجھے تو کبھی ہنسی ہو بڑوں کی بابت استفسار کر رہا ہوں۔“ حیرانگی برقرار تھی۔ سعد ذرا سا مسکرایا۔ وہ بڑے اطمینان سے بول رہا تھا جیسے اسے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔

”زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج کل تمہارے چہرے کے تاثرات تو کچھ ایسا ہی عیاں۔



کر رہے ہیں۔" رومہ نے خشکی دکھائی اور رخ موڑ لیا۔  
 "میرا سر کھانے کی ضرورت نہیں۔ میری مرضی،  
 میں جو جی میں آئے وہی کروں برائے مہربانی مجھے  
 کچھ دیر کو کھلا چھوڑ دو۔" بے رنجی سے جواب آیا۔ کچھ  
 دیر پہلے جو جلیسی کے جذبات پیدا ہوئے تھے۔ سعد کی  
 آمد کے ساتھ ہی دم توڑ گئے۔ دل خواہ بخواہ خوش فہم  
 ہونے لگا۔ سعد کندھے اچکا تا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ فرق  
 اب بھی اسے نہیں پڑا تھا۔ کم از کم اس کے تاثرات  
 سے تو یہی عیاں تھا۔

☆.....☆

"کبھی کبھی ہم دوسروں کو بات بات پر جس بات  
 پر سرزنش کرتے ہیں۔ وہ ہم میں خود اتنی وافر مقدار  
 میں موجود ہوتی ہے مگر ہمارا دھیان دوسروں سے ہٹے  
 تو ہم خود میں جھانکیں۔" سعد مسلسل رومہ کو سنائے  
 جا رہا تھا اور وہ محض ہوں کہہ کر سخت سے سر جھٹک  
 دیتی۔ سال کی آخری شام بھی اور وہ واپس گھر کے  
 لیے بس اسٹاپ کی طرف جا رہے تھے۔

"زین! اگول گپے کھاتے ہیں۔" رابی کا دل لگیایا  
 تھا۔ سعد کو پسند نہیں تھے اور رومہ سڑک پر کھڑے ہو کر  
 کچھ کھانے کو بدتمیزی سمجھتی تھی۔ لہذا وہ دونوں ٹھیلے کی  
 طرف بڑھے اور وہ دونوں پیچھے کھڑے رہ گئے۔

"کیا ہے مجھ میں جو مجھے نظر نہیں آتا؟" رومہ  
 حساب برابر کرنے کو خونخوار تیور لیے سعد کو گھور رہی  
 تھی۔ سعد کا اسے چڑانے کو دل تو چاہا اس نے سوچا  
 کہ وہ کہہ دے وہ کون سا رومہ کو کہہ رہا ہے اور یہ رومہ  
 کو کیسے پتہ کہ وہ اسے کہہ رہا ہے۔ مگر آج سب کچھ سزا ہو  
 ہی جانا چاہیے تھا۔

"تم میں بدتمیزی ہے۔ بدتمیزی ہی ہے، بوگی ہو تم  
 اسٹیوڈنٹ لڑکی۔" رومہ حیرانگی سے اس کے الفاظ سن  
 رہی تھی۔

"مانا کہ میں بدتمیزی ہوں، بدتمیزی ہوں مگر خود  
 کون سا تم میں تمیز آگئی ہے۔ ہم تو پھر بھی کسی کی بات

کا آرام سے جواب دے دیتے ہیں اور تم جب بھی  
 میں نے تم سے بات کی تم نے بھی سیدھے منہ جواب  
 نہیں دیا۔ جانے اتنی مرچیں کہاں سے کھا لیتی ہو۔ بوا  
 سے آکس کریم کی فرمائش کرنا ہی بدتمیزی نہیں، بلکہ  
 جب کسی کو کہہ دیا جائے کہ میرا سر کھانے کی ضرورت  
 نہیں، یہ بھی بدتمیزی ہی ہے۔ کسی کو بات بات پر  
 ٹوکنے سے تمیز نہیں آجانی بلکہ خود عمل کرنے سے آتی  
 ہے۔" سعد بہت نرمی سے کہہ رہا تھا اور وہ منہ کھولے  
 سنتی جا رہی تھی۔ وہ اتنی غلط تھی؟ اور وہ بھی تو غلط تھا وہ  
 ماننا تھا مگر وہ مانتی نہیں تھی۔ تھوڑا فرق تھا۔

وہ جواباً خاموش رہی۔ سعد بہت کرارے جواب کا  
 منتظر تھا۔ منتظر ہی رہ گیا۔ شام ڈھلنے والی تھی انہیں  
 جلدی نکلتا تھا۔ سعد، زین اور رابی کو بلانے چل دیا۔

☆.....☆

کسی نے رکشے سے ایک بوری سڑک پر پھینکی  
 تھی۔ رومہ کی حساست بیدار ہوئیں۔ اسے اچانک  
 سے ٹی وی میں بتائی جانے والی باتیں یاد آئیں۔ اگر  
 کوئی اپنا سامان کہیں چھوڑ دے یا پھینک دے تو فوراً  
 پولیس کو اطلاع کی جائے۔ خوف سے اس کا چہرہ زرد  
 پڑ گیا۔ تیزی سے بس آ رہی تھی اور اگر وہ اسے پھینک  
 دیتی پھر بلاسٹ ہوتا۔ "اف!" رومہ نے جھرجھری لی  
 اسے کچھ کرنا چاہیے تھا۔

"بم..... بم..... بم....." وہ حلق پھاڑے چلانے  
 لگی۔ بس بوری سے چند فٹ کے فاصلے پر رک گئی،  
 ارد گرد لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ کوئی ڈرتا آگے نہیں  
 بڑھ رہا تھا۔

"اس میں بم ہے، میں نے خود دیکھا۔ وہ کچھ  
 لوگوں نے اس بوری کو پھینکا تھا۔" وہ ہٹلا رہی تھی۔  
 پولیس موبائل قریب آ کر رکی جلد ہی مزید فورس کو بلا لیا  
 گیا۔ لوگوں کا ہجوم وسیع تر ہوتا گیا۔

"پلیز سب لوگ یہاں سے جگہ خالی کر دیں۔  
 خطرہ ہے۔" ایک کانسٹیبل سب کو اس جگہ سے ہٹا رہا

تھا۔ زین، رابی اور سعد بھی تیزی سے رومہ کی طرف  
 بڑھے۔ وہ اس تماشے کو لگا دیکھ کر آئے تھے۔

"کیا ہوا؟ ٹھیک ہو تم؟" سعد تفتیش سے پوچھ رہا  
 تھا۔ رومہ زرد رنگت لیے پوری کود کچھے جا رہی تھی۔ ایک  
 اور موبائل آ کر رکی چند کتے اور کچھ پولیس مین نکلے۔

کتوں نے پوری کو سونگھا اور پھر سے منہ پیچھے کر لیا۔  
 ابھن بڑھ رہی تھی۔ چند کانسٹیبل آگے بڑھے۔ بم کی  
 موجودگی کو چیک کرنے والے آلات ان کے ہاتھوں  
 میں تھے۔ بوری کو کھولا گیا۔ حیرت ہی حیرت۔

بوری کوڑے سے بھری پڑی تھی۔ کوڑے کو بھی  
 چیک کیا مگر وہ بم میں نہ بدلا۔ کوڑا ہی رہا۔ سب کی  
 ملاحظی نظریں رومہ کی طرف اٹھیں۔ اس کی نظریں  
 شرمندگی سے جھکیں۔

"کس نے اطلاع کی تھی کہ یہاں بم ہے؟"  
 شکستیں نظریں تو کسی آفیسر کی ہی لگتی تھیں۔ سب  
 نے رومہ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کئی لمبے تاسف سے  
 اس کی طرف دیکھتا رہا۔ لوگ وہی دبی دبی ہنس رہے  
 تھے۔ شرمندہ کر دینے والی ہنسی۔

"ہمارے عوام بھی کیا کریں۔ اتنے بلاسٹ ہو  
 چکے ہیں کہ ہر جگہ بم ہی سمجھا جاتا ہے۔ ان کا قصور  
 نہیں۔" اسے شاید رومہ پر ترس آ گیا جو کہہ کر چلا  
 گیا۔ ہجوم بھی چھٹا گیا۔

کب کی چھپائی ہنسی کو نکلنے کا راستہ مل گیا۔ زین،  
 رابی اور سعد کے قہقہے اس کے کان میں پڑ رہے تھے۔  
 وہ شرمندگی سے سرخ ہوتی گئی۔

"میں نے کہا نا تم بوگی بھی ہو۔" سعد نے اس  
 کے کان میں سرگوشی کی۔ رومہ کی آنکھوں میں آنسو  
 آگئے اور وہ تینوں بے چین ہو گئے۔

"بھوتم نے بھی نیو ایئر کے لیے ایک یادگار  
 جوگ مارا ہے۔ جیسے ہم بونگیاں مارتے ہیں۔ ڈونٹ  
 ڈرنی رومہ۔" سعد اسے بہلانے لگا۔

"ہم تو شرم سے پانی پانی ہونے کی بجائے،

ڈھٹائی سے برف ہو جاتے ہیں۔ آخر دسمبر سے کل  
 سے جنوری بھی شروع ہو جائے گا اگر برف ہو بھی  
 جائے تو کسی کو اعتراض نہیں ہونے والا بن جاؤ  
 برف۔" رابی اسے چھیڑنے لگی۔ جوش سے آواز بلند  
 ہو رہی تھی۔

"مس نصیحت! ایسی چیزوں کو دل پر نہیں لیتے۔ نہ  
 ہی سوگ مناتے ہیں بلکہ بے غم ہو جاتے ہیں۔ بونگیاں  
 تو زندگی میں چلتی ہی ہیں۔" زین نے پیار سے اس کا  
 سر تھپکا۔ وہ اس کی شرمندگی مٹانا چاہتے تھے۔

"یا..... یو آر رائٹ۔ ڈھٹائی سے برف بن  
 جاتے ہیں اور بے غم بھی۔" رومہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

اس سال کی ساری بدگمانیاں اس سال پر ہی چھوڑ  
 دی گئیں۔ اگلا سال بڑا تروتازہ ہونا تھا۔ خوش خوش  
 سا کیوں کہ دل خوش تھا کچھ نیا کیا تھا۔

"نئے سال کی آکس کریم بوا کے شہر کے بازاروں  
 میں کھانی ہے یا اپنے شہر کے بازاروں میں؟" سعد  
 پوچھ رہا تھا۔

"اپنے شہر سے۔" رومہ کھلکھلائی۔  
 "بار! بس پکڑو شاید آخری ہے جو اپنے شہر کو  
 جا رہی ہے۔" زین چلایا۔

"میں نے تو ابھی اس شہر سے اپنی مگنی کی شاپنگ  
 بھی کرنی تھی۔" رومہ نے منہ بسرا ان سب کو حیرت  
 نہ ہوئی۔

"شاپنگ کل اپنے شہر سے کریں گے۔ اگر یہ بس  
 نکل گئی تو اپنے شہر کی آکس کریم بھی نکل جائے گی۔"

زین اور رابی بس میں بیٹھ چکے تھے۔ سعد نے ہاتھ  
 بڑھا کر رومہ کو بھی بس میں کھینچ لیا۔ یقیناً نیا سال اچھا  
 ہونے والا تھا۔ جب بے غم ہو جائیں تو سب اچھا ہی  
 لگتا ہے۔ غم تو زندگی کو چاٹ جاتے ہیں۔ بس کوشش  
 ہونی چاہیے بے غم ہونے کی "ٹینشن فری"۔

Happy new year

☆.....☆

## بگھڑی گھڑی ہمارے

جیسے ہی ہماری گاڑی سٹپل کر اس کر کے مین روڈ پر آئی، وہ دو اسٹوڈنٹ میری توجہ کا مرکز بن گئے جو بائیک پر سوار مین روڈ پر چلے جا رہے تھے۔

ارے! یہ نہ سمجھیں کہ میں ان لڑکوں کو تازہ رہی تھی۔ وجہ موٹر بائیک کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہونے لڑکے کے ہاتھ میں موجود دو کیلے تھے جن میں سے ایک کو چھیل کر وہ کھا رہا تھا۔ آپ پھر غلط نہیں کا شکار ہو گئے ہیں۔ بھئی میں کوئی غدیدی نہیں ہوں نہ ہی مجھے اس کے کیلے کھانے پر کوئی اعتراض ہے میں مسلسل اس لڑکے پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ نہ جانے مجھے یہ ”خوش فہمی“ کیوں تھی کہ وہ لڑکا کیلا کھا کر اس کا چھلکا مین روڈ پر نہیں پھینکے گا لیکن اس وقت میری خوش فہمی چاروں شانے چت ہو گئی جب اس نے کیلا کھا کر چھلکا بغیر سوچے سمجھے سڑک پر پھینک دیا۔ اس نے یہ زحمت بھی نہ کی چلو اگر چھلکا سڑک پر پھینکنا اتنا ہی ”ضروری“ ہے تو اسے سڑک کے کنارے پر ہی پھینک دے۔ یہ دیکھ کر میرا دم ہی نکل گیا (معاذرتاً حقیقت میں نہیں۔ حقیقت میں نکل جاتا تو میں اس وقت آپ سے بات نہ کر رہی ہوتی۔) کہ پیچھے سے تیز رفتاری سے آنے والے دو موٹر سائیکل سوار اس کیلے کے چھلکے سے پھسلے پھسلے بچے۔

یہ صورت حال دیکھ کر میرے بھائی (اب یہ نہ پوچھیے گا وہاں میرا بھائی کہاں سے آ گیا؟ یاد رہے گاڑی میرا بھائی چلا رہا ہے۔) نے دونوں لڑکوں کو

”حسب توفیق“ برا بھلا کہا۔ پہلے میں نے سوچا کہ گاڑی سے اتر کر ان چھلکوں کو اٹھا کر سائینڈ پر ڈال دوں لیکن سڑک پر اتنی چیز ٹریفک تھی کہ کوئی بھی رنگ کر ان چھلکوں کو اٹھا نہیں سکتا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے کسی گاڑی کی زد میں آ کر جان گنوانے کا خدشہ تھا اب آپ سے کیا پردہ مجھے اپنی زندگی بہت پیاری ہے اس لیے اس خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ لہذا میں نے دل میں یہ دعا کی کہ اس چھلکے پر سے کوئی موٹر سائیکل سوار نہ گزرے اور کوئی گاڑی والا ان چھلکوں کو اپنی گاڑی سے کھل کر ”ناکارہ“ کر دے۔ گاڑی کا کیلے کے چھلکے سے پھسلنے کا خطرہ نہیں ہوتا۔ چار پیروں والی سواری جو ہوئی۔ چھلکے کو ناکارہ کرنے والا کام ہم نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ہماری گاڑی دوسری لین میں تھی۔ آپ کو جانتے ہیں ”بحیثیت قوم“ اسی فیصد مسائل صرف دعا کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے اس وقت میں نے بھی یہی حکمت عملی اپنائی تھی۔

خیر اگلے سٹپل پر بائیک ہماری گاڑی کے بالکل آگے کھڑی تھی۔ (ہاں ہاں وہ دونوں اسٹوڈنٹ بھی بائیک پر سوار تھے۔ آپ کیا سمجھے تھے بائیک اکیلے ہی وہاں کھڑی تھی۔

”کمال ہے بھئی! آپ کہ بھی کیا کہنے؟“ مجھے نا جانے کیا ہوا میں نے بغیر سوچے سمجھے گاڑی کا شیشہ نیچے کیا تو میرے بھائی نے میرا ارادہ بھانپ لیا۔

”کیا کر رہی ہو کیوں سڑک پر تماشہ لگوانا ہے؟“

کہہ کر میرا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ شیشہ اوپر کر دیا۔ سٹپل ابھی پوری طرح گرین بھی نہیں ہوا تھا، مطلب ابھی پہلی لائٹ ہی آن ہوئی تھی کہ لڑکے زن سے گاڑی نکال کر لے گئے اور میرے لیے سوچوں کے در ”وا“ کر گئے۔

”آپ کیا جانیں میرے لیے سوچنا کتنا تکلیف دہ عمل ہے۔ دو دو گھنٹے سوچنے کے بعد بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ میں کیا سوچ رہی ہوں؟“ خیر آج قسمت



Hankies

... absorbent  
..... elegant  
..... & luxury

Decorative Hankies  
KITCHEN TOWELS  
Luxury Size

Hankies

HIP

Health & Hygiene Products

حاصل کرتی رہتی ہوں۔ ان سب کا خیال ہے کہ میں حقیقت میں "پاگل" (میں ان کے خیال سے بالکل بھی متفق نہیں ہوں۔) بھلا میں ایک ریپر یا چھلکا وہاں نہیں پھینکوں گی تو کوڑے کے اس ڈھیر کو کیا فرق پڑے گا۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاؤں کہ کوڑے کے ڈھیر کو "ایک ریپر" کا فرق تو پڑ ہی گیا ہے نا۔ اب آپ لوگوں سے بات کی ہے تو ممکن ہے ہمارے ارد گرد جگہ جگہ کوڑے کے جو ڈھیر لگے ہوئے ہیں انہیں لاکھوں نہیں تو "ہزاروں ریپر ز اور چھلکوں" کا فرق تو پڑ ہی جائے گا۔

آپ سب سے میری درخواست ہے کہ کوئی چیز یا پھل کھا کر اس کا ریپر یا چھلکا سڑک پر ہرگز نہ پھینکیں بلکہ اگر آپ گاڑی میں سفر کر رہے ہیں تو ان چیزوں کو شاپنگ بیگ میں ڈال کر گاڑی میں ہی رکھ لیں اور راستے میں کسی کوڑے ڈان یا گھر واپس آ کر گھر کے کوڑے دان میں ڈالیں اور اگر بائیک پر ہیں یا پیدل چلتے ہوئے کوئی چیز کھا رہے ہیں تو کھانے کے بعد ریپر یا چھلکے کسی ایسی جگہ پر پھینکیں جہاں سے کسی گزرنے والے کے پھسل کر گرنے کا خدشہ نہ ہو بلکہ بہتر تو یہی ہے کہ ان چیزوں کو کوڑے دان میں ڈالیں۔ اس "چھوٹی" سی بات سے بچنے کی کوشش ضرور کریں جو کسی کے لیے "بڑے نقصان" کا باعث بن سکتی ہے اگر آپ کو میری یہ بات ناگوار گزری ہے تو گزرتی رہے (آپ کیا سمجھتے تھے میں معافی مانگنے لگی ہوں) کیونکہ مجھے یقین ہے جب آپ میری اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو آپ کو یہ بات بہت معقول لگے گی اور آپ میرے شکر گزار ہوں گے۔ (بی پوزیٹو سارے یہ میرا بلڈ گروپ نہیں ہے بلکہ یہ میں اپنی حوصلہ افزائی کے لیے کہہ رہی ہوں۔) اچھا پھر اللہ حافظ لیکن مجھے بتائیے گا ضرور کہ آپ نے اس بارے میں کیا سوچا ہے۔

☆.....

نے "یاوری" کی اور میں یہ سوچنے میں کامیاب ہوئی کہ یہ طالب علم ملک و قوم کی بہتری کے لیے کیا کریں گے جن کو یہ تک معلوم نہیں کہ ان کی لاپرواہی کسی کی جان لے سکتی ہے یا کسی کو معذور کر سکتی ہے۔

"میرا خیال ہے میں نے ٹھیک ہی سوچا ہے۔"

ان لڑکوں کا پوچھا گیا کہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ ایک "مشہور" پرائیویٹ کالج میں زیر تعلیم ہیں۔ اب ماں باپ لاکھوں روپے نہیں بھرتے ہیں تو بچوں کو اتنا "حق" تو ملنا چاہیے کہ وہ جو چاہیں وہ کر سکیں اگر ہم بچوں کو روکیں گے تو ان کی "کریٹیویٹی" متاثر ہوگی لیکن پھر بھی والدین اور تعلیمی اداروں سے "پرورد" (شاید کوئی میری بات سن لے۔) اچیل ہے خدارا! اپنے بچوں کو "اچھی تعلیم" کے ساتھ "اچھی تربیت" بھی دیں کیونکہ اچھی تربیت کے بغیر اچھی تعلیم بے فائدہ ہو جاتی ہے۔

اب دیکھیے نا! کیلے کا چھلکا سڑک پر پھینکنا بظاہر ایک چھوٹی اور عام سی بات ہے لیکن اس سے ہونے والے نقصان کا شاید ہمیں اندازہ نہیں ہے۔ یقیناً اس لڑکے کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی ہوگی کہ اس نے جو چھلکا سڑک پر پھینکا ہے وہ کسی کے لیے بم بلاسٹ جتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے لیکن میں اس بات کے لیے بہت حساس ہوں کیونکہ میں اپنے پڑوسی کو اس حادثے کا شکار ہوتے دیکھ چکی ہوں اور اس دن سے میرا یہ ریکارڈ (گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈ نہیں بھی اور نہ ہی بچتے والا ریکارڈ) رہا ہے کہ میں نے کبھی کسی چیز کا ریپر یا کسی پھل کا چھلکا سڑک تو کیا کہیں ایسی جگہ بھی نہیں پھینکا جہاں پہلے سے کوڑے کا ڈھیر ہو اور لوگ اس ڈھیر کو "ترقی" دینے میں دل و جان سے جتے ہوں اگر مجھے کوئی کوڑے دان یا ڈسٹ بن نظر نہ آئے تو میں وہ چھلکا یا ریپر جو میرے ہاتھ میں ہوتا ہے اسے آرام سے اپنے بیگ میں ڈال کر اپنی دوستوں اور عزیز واقارب سے "پاگل" کا خطاب



ساتھ بیڈ سے اترتی دے قدموں گلاس ونڈ کے قریب جا پہنچی تھی۔  
 ”مجھ میں نہیں آ رہا کہ تم سے کس طرح معذرت کروں۔“ بھاری دکھش آواز نے میزہ کی دھڑکن مزید  
 تیز کر دی تھی۔

”پتا نہیں کیسے میری زبان سے یہ الفاظ پھسل گئے کہ میں تمہیں جانتا ہوں۔“  
 ”آپ نے سچ کہا تھا۔ اس میں معذرت کرنے والی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ دم لہجے میں بولی تھی۔  
 ”مگر یہ سچ مجھے عارش کی موجودگی میں نہیں کہنا چاہیے تھا۔ جب کہ میں جانتا ہوں کہ تم اس کی وجہ سے

ناکلہ طارق

سلسلہ وار ناول

قسط نمبر 23

## جو عشق میں بیٹھی وہ عشق ہی جانے

اور جانے پہچانے نمبر نے اسے اتنا بوکھلا دیا کہ وہ کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر پارون کی کال ریسیو کر گئی تھی  
 مگر دوسری جانب چھائی گہری خاموشی پر اس نے ایک نگاہ احتیاطاً خرمن پر ڈالی تھی اور پھر دھڑکتے دل کے



Copied From Men



بہت محتاط رہتی ہو، اس نے کچھ کہا نہیں مگر میری بے تکلفی پر شاید اس نے ناگواری محسوس کی ہو۔“  
 ”آپ پریشان مت ہوں، یہ عارش کو بھی معلوم ہے کہ آپ مجھے جانتے ہیں اور یہ کہ انسٹی ٹیوٹ کے باہر بھی میری ملاقات آپ سے ہوئی ہے۔“ اس کی بات نے ہارون کو حیران کیا تھا۔

”یہ تم نے عارش کو بتایا تھا؟“

”نہیں... مگر میرے معاملات سے وہ پتہ نہیں کیسے باخبر ہو جاتا ہے۔“

”تمہیں کچھ کہا تھا اس نے یا میرے بارے میں کوئی سوال کیا تھا؟“

”نہیں مگر اس نے باور کروا دیا کہ وہ انجان نہیں ہے۔“

”کس بات سے انجان نہیں ہے؟“

”اس سچ سے جو آج اس کے سامنے آپ کہہ گئے۔“

”میں نے کون سا سچ کہا تھا؟“

”میرے خدا۔ میری رہی سہی نیند بھی آپ اڑا دیں گے۔“ میزہ زچ ہوئی تھی مگر اگلے ہی پل ہارون کی مدھم ہنسی نے اسے شرمندہ کر دیا تھا۔

”معافی چاہتا ہوں۔ میں نے تمہاری نیند کو ڈسٹرب کیا۔“ وہ بولا تھا۔

”میں جاگ ہی رہی تھی۔ خرمین کے گھر میں ہوں اس نے آج یہیں روک لیا تھا۔“

”میں تمہیں دیکھ کر چونک گیا تھا۔ میرے آنے سے پہلے کیا تم رورہی تھیں؟“ ہارون کو یاد آیا تھا۔

”ای کے دور جانے کی وجہ سے سرگودھا میں میرے تایا ابو کی سرجری ہوئی ہے ابو تو خرمین کے پیرئس کے ساتھ پہلے ہی جا چکے تھے۔“

”اب کیسی طبیعت ہے تمہارے تایا ابو کی؟“

”وہ ابھی ہاسپٹل میں ہی ہیں۔ ڈاکٹرز ابھی ان کی طرف سے مطمئن نہیں ہیں۔“ وہ بچھے لہجے میں بتا رہی تھی۔

”پریشان مت ہونا، وہ جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔ مجھے یقین ہے۔“ ہارون کا تسلی آمیز لہجہ اسے اچھا لگا تھا۔ وہ مزید کچھ کہہ رہا تھا مگر میزہ بری طرح چونک کر اچانک قریب ہوتی خرمین کو دیکھا تھا جو بغیر کچھ بولے اس سے سیل فون لے چکی تھی۔

”میزہ! میں نے جو کہا تم نے سنا۔“ ہارون کو اس کی خاموشی کا احساس ہوا تھا تو پوچھا تھا۔

”بولتے رہیں بولتے رہیں ہمیں بھی تو ذرا اپنی باتوں سے مستفید کیجیے۔“ خرمین کے مسکراتے لہجے نے یقیناً ہارون کی ساعتوں کو دھچکا پہنچایا تھا۔

”میرے اگلے شو میں یہ اعلان ہونے والا ہے کہ خرمین کو ہارون جیسے لفظوں کے ساحر پر یزید میٹر کی بولتی بند کروانے کا اعزاز مل چکا ہے۔“ ہارون کی خاموشی پر وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

”سوچ لو، تمہارے زیادہ تر سٹریٹس میرے بھی فین ہیں۔ کسی کو تمہارا اعزاز ہضم نہیں ہوگا۔“ ہارون نے مسکراتے لہجے میں کہا تھا۔

”اس دھمکی کا اثر مجھ پر نہیں ہونے والا، ویسے آپ کی خبر تو میں بعد میں لوں گی مگر میزہ کی اب خبر نہیں ہے۔ آپ کے جانے کے بعد یہ بڑی ڈھٹائی سے یہی کہتی رہی تھی کہ یہ بس سرسری سا آپ کو جانتی ہے اور یہ کہ انسٹی ٹیوٹ کے بعد ایک بار اتفاق سے آپ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔“ بولتے ہوئے خرمین نے اسے گھورا تھا جو چورسی بنی ہوئی تھی۔

”جب وہ کہہ رہی ہے تو یقین کر لو۔“

”پھر آپ کہیں گے کہ آنکھوں دیکھی کبھی بھی نکل لوں۔“ اس کے خشمگین لہجے پر وہ دھیرے سے ہنسا تھا۔

”ویسے آپ بڑی مشکل میں پھنسنے والے ہیں۔“ خرمین کے معنی خیز لہجے پر میزہ نے ہول کر اس سے سیل فون لینا چاہا تھا مگر وہ بروقت پیچھے ہوئی تھی۔

”جس خاتون کو بقول آپ کے آپ جانتے ہیں ان پر لو میرج کا بھوت سوار ہے۔ آپ ذرا بیخ کر رہیں تو اچھا ہے۔“

”خرمین! مجھ سے بالکل بات مت کرنا تم۔“ میزہ شدید ناراضی سے اس کے ہنستے چہرے کو دیکھتی بیڈ کی سمت چلی گئی تھی۔

”بہت شکریہ مجھے خبردار کرنے کے لیے اب فون بند کروں میں یا عارش کے ہاتھوں قتل ہونے کے لیے تیار رہوں؟“ ہارون کے سوال پر ہنستے ہوئے اس نے خدا حافظ کہہ دیا تھا کہ ابھی تو اسے میزہ کی ناراضی بھی دور کرنی تھی۔

☆.....☆

کچھ تذبذب کے ساتھ خرمین نے دھیرے سے اس کے شانے کو تھپتھا کر پکارا بھی تھا، مگر یہ نیند سے بمشکل آنکھیں وہ کھول سکا تھا۔

”عارش! مجھے ابھی ریڈیو جانا ہے۔“ وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی تھی۔

”کیا، اس وقت؟“ پوری آنکھیں کھول کر عارش نے ایک نظر وال کلاک کو اور پھر اسے دیکھا تھا۔

”کسی وجہ سے ہارون آج مارننگ شو کے لیے نہیں جا سکتے۔ ابھی عثمان سے پتا چلا ہے کہ مجھے اور عثمان کو ہارون کا شو ہوسٹ کرنے کے لیے ریڈیو جانا ہے۔“

”کہیں نہیں جا رہی ہو تم۔“ سرعت سے اٹھا وہ اس کی بات کاٹ گیا تھا۔

”صبح کے 7 بجے ہیں ابھی چپ کر کے بیٹھی رہو گھر میں ریڈیو سے فون آیا تو میں بات کر لوں گا۔“ وہ بگڑ کر بولا تھا۔

”سمجھنے کی کوشش کرو، میں اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ریڈیو نہیں جا سکتی تھی تو ہارون نے میرا پروگرام ہوسٹ کیا تھا اب ان کو میری ضرورت ہے تو.....“

”میں کچھ نہیں جانتا، مجھے کچھ مت سمجھاؤ۔“ بڑی طرح جھلا کر وہ پھر اس کی بات کاٹ گیا تھا۔

”اب میں عثمان سے کیا کہوں گی؟“ بے بس نظروں سے خرمین نے اسے دیکھا تھا۔



”جنم میں بھیج دو اسے۔“ بگڑے لہجے میں ہی بولتا وہ دوبارہ کبل میں چہرہ چھپائے لیٹ گیا تھا۔  
”نہ تم کہیں جا رہی ہونہ میں تمہیں لے کر کہیں جاؤں گا۔ میری چھٹی کا دن عمارت مت کرو۔“ وہ کبل کے اندر سے ہی بولا تھا۔

”میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کر رہی۔ عثمان مجھے ساتھ لے جا رہا ہے۔“ وہ التجائی لہجے میں بولی تھی۔  
”اسے گھر میں داخل بھی مت ہونے دینا۔“ کبل چہرے سے ہٹا کر اس نے تہیہ کی تھی۔  
”مگر میں نے تو اسے گھر میں بلا لیا ہے۔ وہ باہر ہی بیٹھا ہے۔“ خرمن نے انتہائی معصومیت سے اسے سلگا دیا تھا۔

”اس شیطان کو تم نے گھر میں آنے کیوں دیا؟“ جھنجھلا کر بولتا وہ پھر اٹھ بیٹھا تھا جب کہ خرمن اپنی ہنسی نہیں روک سکی تھی۔  
”تمہیں ہنسی آرہی ہے میں کیا بے وقوف نظر آتا ہوں۔ یہ ایک ہی دن ملتا ہے اور اس میں بھی تم.....“  
شدید ناراضی سے اسے دیکھتا ہوا وہ چپ ہو گیا تھا۔

”عارض! ہو جاتا ہے کبھی کبھی ایسا جا ب ہے یہ اب تم اس طرح ناراض ہو گے تو میں کیسے جا سکوں گی؟“  
وہ آنکھوں میں مظلومیت سجائے بولی تھی۔  
”مجھے کچھ نہیں پتا، جو کرنا ہے کرو۔“ ہاتھوں سے بکھرے بال درست کرنا وہ خفت سے بولا تھا مگر پھر رک کر اسے دیکھا تھا جو خاموشی سے اسے ہی دیکھ رہی تھا۔  
”کتنا وقت لگے گا؟“ وہ خفگی سے ہی پوچھ رہا تھا۔

”صرف دو گھنٹے۔“  
”جانتا ہوں تمہارے دو گھنٹے۔“ جل کر بولتے ہوئے وہ کبل دور جھٹکتا بیڈ سے اترنا چاہ رہا تھا۔ جب

خرمن نے ہنستے ہوئے چہرہ اس کے شانے سے مس کیا تھا مگر اس کا موڈ ہنوز بگڑا ہوا ہی تھی۔  
”میرے لیے ناشتہ تیار کرو۔“ ہٹ دھری سے آرڈر دیتا وہ واش روم کی طرف گیا تھا جب کہ وہ گہری سانس لیتی کرے سے نکل آئی تھی۔ لاؤنج میں ہی صوفے پر نیم دراز عثمان ٹی وی کے چینل چینیج کرنے میں مصروف تھا۔

”عثمان! مجھے عارش کے لیے ناشتہ تیار کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“ لاؤنج کی طرف بڑھتی وہ بولی تھی۔

”ظاہر ہے، اب تو ہر حال میں اسے ناشتہ چاہیے ہوگا۔ اس کی فرمانبرداری کرنے کی کوشش کرو گی تو ایسے ہی وہ سر پر چڑھے گا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اپنی کراری زبان استعمال کر لینا اسے سمجھ میں بھی تمہاری وہی زبان آتی ہے۔“ عثمان نے جسمیں نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”اچھا اب چپ رہو، عارش کا موڈ پہلے ہی خراب ہو چکا ہے۔“  
”تھوڑا سا چیخ چلا کر اجازت لیتیں تو وہ اپنے سارے موڈ بھول جاتا، اب اٹھاؤ نخرے، میرے لیے بھی کچھ لے آؤ کھانے کے لیے، میری بیوی اس وقت آرام کر رہی ہے اور میں اسے بے آرام نہیں کر سکتا تھا۔“

”اب تمہارے لیے بھی ناشتا بناؤں؟“ پہنچ گئے پھر ہم وقت پر۔“ خرمن جھلائی تھی۔

”جلدی کر لو، تمہیں اپنے سنگھار بھی مکمل کرنے ہوں گے۔ آٹھ بجے تک لازمی ریڈیو پہنچنا ہے۔“  
عثمان کے گھر کتنے پروہ عجلت میں کچن کی طرف گئی تھی۔

ٹی وی اسکرین سے نظر ہٹانا عثمان اس کی طرف متوجہ ہوا تھا جو کانی کینہ تو نظروں سے اسے دیکھتا صوفے پر براجمان ہوا تھا۔  
”بیچ، صبح تم بڑے نکھرے نکھرے لگ رہے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ استانی کے تیور بگڑ جائیں۔“ عثمان نے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”اب تم مزید میرا دماغ خراب مت کرو۔“ وہ ناگواری سے بولا تھا۔  
”پتہ نہیں کون سا گناہ کیا تھا میں نے جو تمہیں برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔“  
”استانی! ذرا آکر سن لو یہ عارش غصے میں جانے تمہارے بارے میں کیا کیا بول رہا ہے۔“ عثمان نے

کچن کی طرف منہ کر کے آواز لگائی تھی اور پھر عارش کے تاثرات پر اس کی ہنسی بلند ہو گئی تھی۔  
”میرے لیے پراٹھے بنانا، مجھے پراٹھے ہی چاہئیں۔“ عارش نے تپ کر کچن کی طرف آرڈر بھیجا تھا جب کہ عثمان کی ہنسی غائب ہو گئی تھی۔

”ہاں بھی چھوٹے پراٹھے، مرغ چھولوں کے ساتھ دو گرم چائے لے آ ملائی مار کے۔“  
کچن کی طرف اپنا آرڈر بھیج کر وہ عارش کی طرف متوجہ ہوا تھا جو لکھا جانے والی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”اس سے پہلے کہ میں ہو جاؤں باؤ لا جو ناشتے میں مل رہا ہے شرافت سے ہضم کر لو۔“ عثمان بول رہا تھا جب خرمن مسکراہٹ چھپائے لاؤنج میں آئی تھی۔

”کیوں ڈانٹے جا رہے ہو عارش کو، میں نے زیادہ وقت تو نہیں لگایا۔“ گرم گرم پراٹھے اور آیلٹ کی پلیٹیں ٹیبل پر رکھتی وہ بولی تھی۔

”زیادہ اس کی طرف داری مت کرو اور جلدی ناشتہ کر کے چلنے کی تیاری کرو، اس کی فکر میں بے حال ہونے کے ڈرامے میرے سامنے ایسے کر رہی ہو جیسے میں تمہیں جانتا نہیں۔“ عثمان کے طنز یہ لہجے پر خرمن کی ہنسی نظروں سے عارش کو دیکھا تھا۔

”اب ناشتہ شروع کرو گے یا مجھے اور مزید باتیں سنوانی ہیں؟“ ناراضی سے عارش کو مخاطب کرتی وہ عثمان کی طرف گئی تھی۔

☆.....☆

میں بخوبی پہنچی وہ کبھی عارش کو دیکھ رہی تھی اور کبھی عثمان کو وہ دونوں ہی بہت سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ آج کچن کے دن عارش اسے عجلت میں پک کرتے گھر پہنچا تو وہ یہی سمجھی تھی کہ خرمن نے گھر پر بلایا ہوگا مگر وہ دونوں اسے گھر لے جانے کے بجائے اس ریسیورٹ میں لے آئے تھے اور جو کچھ عارش نے اس کے گوشہ گزار کیا تھا وہ اس کے لیے شدید قسم کا جھٹکا ہی تھا۔

”میزہ! جو باتیں ابھی میں نے کی ہیں، اتنا یاد رکھنا کہ وہ ہم تینوں کے درمیان ہی رہیں اور مجھے تم پر مکمل بھروسہ ہے۔“ بہت سنجیدگی سے عارش نے اسے تنبیہ بھی کی تھی۔

”عارش! میرے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ مجھے واقعی شک لگا ہے۔“ میزہ دنگ تھی۔

”ہارون اور ایک سے ملنے کے بعد اب یہ سب تمہیں حیرت انگیز نہیں لگتا چاہے۔ کبھی کبھی حقیقت حیران کن ضرور ہوتی ہے مگر حقیقت تو اپنی جگہ مسلم موجود رہتی ہے۔“ عثمان نے کہا تھا۔

”مگر یقین تو تم دونوں بھی نہیں ہو۔“ میزہ بولی تھی۔

”ہاں، ہارون کے ماں باپ سے ملنے کے بعد بھی مجھے سو فیصد یقین نہیں ہے مگر مجھے یہ بھروسہ ہے کہ سو فیصد یقین بھی کھل ہونے والا ہے اور اس کے لیے مجھے تمہاری ضرورت ہے۔“ عارش کے سنجیدہ لہجے پر وہ مزید الجھی تھی۔

”دیکھو! میں اب تک ہارون کی فیملی کے بارے میں جس حد تک معلومات کر چکا ہوں وہ نا کافی ہیں۔ اہم بات بس یہ پتہ چلی ہے جو کہ بعد میں ہارون نے بھی کفرم کر دیا کہ ان کی فیملی ہمیشہ سے اس شہر میں نہیں رہی ہے۔ مزید جو کچھ میں جاننا چاہتا ہوں وہ مجھے صرف تمہارے ذریعے ہی ہارون سے معلوم ہو سکتا ہے اور تمہیں میری مدد کرنی ہوگی۔ ورنہ عنقریب میرا زور بیک ڈاؤن ہونے والا ہے۔“

”مگر میں ہارون سے کیا کہوں گی؟ میں کیسے ان کے پرسٹو کے بارے میں جان سکتی ہوں؟“ میزہ حتیٰ دق رہ گئی تھی۔

”ابھی میں اپنی زبان کھولوں؟“ عثمان کی خشمکین نظروں پر وہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”میزہ! تم میری اس الجھن کو سلھانے میں مدد کرو، اس کے بعد ہارون سے تمہاری شادی کروانا میری ذمہ داری ہے۔“ عارش کی سنجیدگی نے اسے بوکھلا دیا تھا۔

”یہ کیا بول رہے ہو تم، وہ کیوں کرنے لگے مجھ سے شادی؟“

”اس کے فرشتوں کو بھی کرنی پڑے گی۔ کیا وقت گزاری کے لیے تمہارے ساتھ بیچ کر رہا ہے۔“ فیٹیول میں گھوم رہا ہے فون کاڑ کر رہا ہے۔ اب یہ مت کہنا کہ اس کے پاس تمہارا نمبر بھی نہیں ہے۔“

عارش نے بری طرح اسے گھرک دیا تھا وہ کچھ بول بھی نہیں سکتی تھی۔

”جو کام عارش نے دیا ہے اسے اب پوری ایمانداری اور ہوشیاری سے کرنا، ہارون کو کسی قسم کا شک نہیں ہونا چاہیے تم پر اور اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو یاد رکھنا تمہارے اماں ابا کو فون کھڑکا دوں گا اور تمہارے بھائی کی غیرت بھی جگانے میں دیر نہیں لگے گی مجھے۔“ عثمان کی دھمکی پر میزہ نے اسے خونخوار نظروں سے دیکھا تھا جب کہ عارش بمشکل مسکراہٹ چھپا سکا تھا۔

”میں اپنی پوری کوشش کروں گی مگر صرف خرمن کی وجہ سے۔“ میزہ بگڑے تیوروں کے ساتھ بولی تھی۔

”اب چلو یہاں سے سب ہماری ٹیبل کی طرف ہی نظریں جمائے بیٹھے ہیں ان محترم کی وجہ سے۔“ میزہ نے بولتے ہوئے عثمان کی فخریہ مسکراہٹ کو گھورا تھا۔

”اسے فیم کہتے ہیں۔ اشارز ہمیشہ لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔ تم کیوں جل رہی ہو؟“

”ابھی کچھ عرصے میں ہی پتا چل جائے گا کہ یہ فیم کتنی بھاری ہوتی ہے۔ پبلک پراپرٹی بن کر رہنا آسان نہیں ہے، میزہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے تم اب اس قابل نہیں رہے کہ تمہارے ساتھ باہر گھوما جائے۔“ عارش کے خشمکین لہجے پر وہ بس ڈھٹائی سے مسکراتا رہا تھا۔

☆.....☆

ریڈیو اسٹیشن میں اسے واقعی دو گھنٹوں سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ وہاں وہ اسٹاف کے درمیان ہویا اسٹوڈیو میں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ واپس گھر آنے پر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی کہ عارش کا موڈ اچھا نہیں تھا مگر اسے کوئی فکر نہیں تھی جانتی تھی کہ عارش کی ناراضی دور ہو جائے گی اگر وہ اس سے کوئی فرمائش کر دے لہذا اس نے شام کو باہر جانے کا ارادہ ظاہر کر دیا تھا۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا تھا کہ بچن کی طرف سے بے فکر ہو کر اس نے وارڈ روم کو ٹھیک کر لیا اور کچھ دوسرے ادھورے کام بھی کر لیے۔ پیلا کے پارلر میں معمول کی طرح اس کی کچھ ہیلپ کر دی تھی اور اپنے چہرے کی ٹوک پبلک بھی سنوارنے کا موقع مل گیا تھا۔ عارش کے ساتھ باہر جانے کا مقصد ادھر ادھر گھومنا ہرگز نہیں تھا۔ عارش کے انکار کے باوجود وہ زبردستی اسے شاپنگ مال کی طرف لے گئی تھی۔ کافی دن گزرنے کے باوجود عارش نے اپنے لیے ایک شرٹ تک نہیں خریدی تھی۔ آج وہ اس کے لیے شاپنگ کرنا چاہتی تھی۔ اس کے بار بار احتجاج کے باوجود عارش کسی چیز میں انٹرسٹ نہیں لے رہا تھا۔ خرمن جانتی تھی کہ اپنے جوتوں سے لے کر لباس تک کی خریداری وہ عثمان کے ساتھ کرتا تھا۔ یہ سچ تھا کہ عثمان کی چوائس زبردستی تھی مگر وہ بھی اب ایسی گئی گزری نہیں تھی سو عارش سے بحث کرنے کے بجائے اس کے لیے جو کچھ اسے اچھا لگتا رہا وہ خریدتی رہی تھی۔ پیلا کے پارلر کے لیے اور اپنے لیے اس نے کاسٹیکس کا کچھ سامان لیا تھا اور آخر میں جب وہ عثمان کے لیے ایک پرفیوم اور جیکٹ لے کر فارغ ہوئی تب تک عارش شاپنگ بیگز سنبھالے اچھی خاصی کوفت اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔

”تمہارے ساتھ ڈیٹ پر جانے کی خسرت میں دل میں لیے گزر جاؤں گا۔ آج کچھ امید جاگی تھی مگر تم نے یہاں خوار کر کے میری امید کا گلا گھونٹ دیا۔“ وہ شدید ناراضی سے بولا تھا۔

”بیوی کے ساتھ کون احمق موڈ ڈیٹ پر جاتا ہے؟“ خرمن حیرت سے ہنسی تھی۔

”میں ہوں وہ احمق مرد۔“ خشمکین لہجے میں بولتا وہ دوسری طرف متوجہ ہوا تھا اور اگلے ہی پہل اس کے قدم رک گئے تھے۔ آگے جاتی خرمن بھی چونک کر رکتی اس کی طرف پلٹی تھی۔

”اب کیوں رک گئے؟“ حیرت سے بولتے ہوئے خرمن نے اس کی نظروں کے تعاقب میں اس بڑی سی شاپ کو دیکھا تھا جہاں بے بی، ہابا کلاتھ کا سائن جگمگا رہا تھا۔ خرمن کی آنکھیں پوری کھل گئی تھیں۔ اگلے ہی پہل وہ تیزی سے عارش کی طرف بڑھی تھی۔ جو شاپ کی گلاس وال سے ڈسپلے میں کئی چیزیں اور خوب صورت کپڑوں سے نظر ہٹانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس پوری شاپنگ کے دوران پہلی بار عارش نے کسی چیز میں دلچسپی ظاہر کی تھی۔

”عارش! فوراً چلو یہاں سے۔“ اس کے ارادے بھانپتے ہی وہ بجلت میں بولی تھی۔

رداڈا جگسٹ [85] جنوری 2015ء

”یہاں اتنا وقت برباد کر دیا مگر جو لینا چاہیے تھا اسے ہم بھول گئے۔ مجھے اس شاپ میں جانا ہے اور تم انکار نہیں کرو گی۔“ وہ قطعاً لہجے میں بولا تھا۔

”عارش! ابھی سے اس کی کیا ضرورت ہے اس کام کے لیے بہت وقت ہے۔“ وہ شپٹا ہی تو گئی تھی۔

”ہرگز نہیں، وقت کم ہے اور مجھے اس کے لیے بہت کچھ خریدنا ہے۔“

”عجب لگے گا، مجھے شرم آئے گی وہاں۔“ سرخ چہرے کے ساتھ وہ ہچکچائی تھی۔

”چلو میرے ساتھ۔“ اس کا ہاتھ پکڑے وہ شاپ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ وہ تو اپنی جینپ میں زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کر پائی تھی مگر عارش بہت پر جوش تھا۔ خوشی اس کے چہرے سے چھلکی جا رہی تھی۔ جتنی رفتار سے وہ پکڑے اور دیگر چیزیں پسند کر رہا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ اپنے بچے کے لیے سب کچھ وہ آج ہی خرید لے گا۔ خرمن نے بمشکل ہی اسے کنٹرول کیا تھا۔ جانتی تھی کہ وہ کتنا بے تاب اور بے چین ہے۔ رات میں سونے سے پہلے تک وہ بچے کے بارے میں باتیں کرتا رہتا تھا۔ اس کے لیے ابھی سے وہ پلاننگ شروع کر چکا تھا۔ خرمن کو یقین تھا کہ جب وہ اپنے بچے کا چہرہ دیکھے گا تو پاگل ہوا ٹھے گا کیوں کہ وہ ابھی سے اس کے لیے بہت حساس ہوتا جا رہا تھا۔

بہت اچھا سا ڈزرن کرنے کے بعد وہ دونوں عروسہ کی طرف پہنچے تھے۔ فاران کی خیریت دریافت کرنے، وہ پہلے سے کافی بہتر ہو چکا تھا مگر بازو اور پیر کا پلاسٹر اترنے میں ابھی وقت لگتا تھا۔ خرمن کو گھر کا ماحول اور فاروق کا مزاج دونوں ہی نارمل لگے تھے۔ عروسہ کے اصرار کے باوجود وہ زیادہ دیر ان کے پاس نہیں رک سکی تھی کیوں کہ اسے بہت زیادہ جھکن محسوس ہو رہی تھی۔

گھر کی طرف واپس روانہ ہوتے ہوئے وہ مطمئن تھی۔ آج کا دن بہت اچھا گزرا تھا۔ کچھ چونک کر اس نے عارش کو دیکھا تھا جو اپنے اپارٹمنٹ کے مین گیٹ میں داخل ہونے کے بجائے آگے بڑھ آیا تھا۔

”ہارون کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے کا فرض بنتا ہے تمہارا انہیں اچھا لگے گا۔“ اس کے سوال کرنے سے پہلے ہی وہ بولا تھا۔

”اس وقت؟“ خرمن نے حیرت سے اپنی رسٹ وراچ میں وقت دیکھا تھا۔

”عارش! 11 بج چکے ہیں۔ وہ ہماری وجہ سے ڈسٹرب ہو جائیں گے۔“

”مگر مجھے یقین ہے کہ وہ ہمیں دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔“ عارش کا مکمل ارادہ تھا جانے کا لہذا وہ بھی خاموش ہو گئی تھی۔

گیٹ پر ہارون نے ہی ان دونوں کا استقبال کیا تھا۔

”میرے لیے یہ بڑی سعادت کی بات ہے کہ F.M ریڈیو کی اتنی مشہور آر جے میرے گھر خود شریف لائی ہیں۔“ ہارون کے مسکراتے لہجے پر خرمن ہنستے ہوئے ایک کی طرف متوجہ ہوئی تھی جو یقیناً خوشی میں ہی چنچتا ان کی طرف آیا تھا۔

”مجھے معلوم تھا عارش آپ کو یہاں لے کر آئیں گے۔ مجھ سے وعدہ جو کیا تھا۔“ ایک چپکا تھا جب کہ ان سب کے ہمراہ آگے بڑھتے ہوئے خرمن صبیحہ کی طرف متوجہ ہوئی تھی جو گھر کے داخلی دروازے پر کھیں

ان سب کی ہی مختصر تھیں۔

”آپ نے فون پر مجھ سے شکایت کی تھی کہ میں خرمن کو آپ کے پاس نہیں لایا۔ اب میں نے آپ کی شکایت دور کر دی ہے۔“ عارش نے مسکراتے ہوئے ان سے کہا تھا جو بڑی محبت سے خرمن کو گلے لگا رہی تھیں۔

”نہیں اب تو مزید یہ شکایت ہو گئی ہے تم سے کہ اپنی اتنی پیاری بیوی سے تم اتنی دیر سے ملو رہے ہو مجھے۔“ صبیحہ کی پر شفقت نظروں پر خرمن مسکرائی تھی۔ وہ اسے بالکل اجنبی نہیں لگی تھیں۔ ان کے چہرے پر پہلا تقدس، آنکھوں میں چمکتی شفقت اور لہجے کی حلاوت، ان کا لمس سب کچھ اسے فاطمہ جیسا ہی لگا تھا۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہونے تک صبیحہ نے اس کا ہاتھ تھامے رکھا تھا اور اسے اپنے قریب ہی بٹھالیا تھا۔

”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ خرمن نے ہارون سے پوچھا تھا۔

”اب میں بہتر ہوں، صبح شاید بدلتے موسم کا اثر تھا جو طبیعت ناساز تھی۔“

”آپ کو پورا یقین ہے کہ موسم کا ہی اثر تھا؟“ عارش کے مسکراتے لہجے پر وہ دھیرے سے ہنسا تھا۔

”آپ بھائی سے ناراض نہیں ہیں۔ ان کی وجہ سے آپ کو سنڈے کو بھی ریڈیو جانا پڑا۔“ ایک نے خرمن کو مخاطب کیا تھا۔

”خرمن! مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری جگہ تمہیں اور عثمان کو ڈسٹرب کیا جائے گا۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔“ ہارون نے فوراً کہا تھا۔

”اب مجھے شرمندہ مت کریں۔ ہم سب تو حیران تھے کہ آپ اپنا کوئی شومس نہیں کرتے ہیں۔“ خرمن بول رہی تھی جب کہ اس کے قریب ہی موجود صبیحہ بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم کی تیز روشنی میں ڈارک مرون فیض سے اسکا روف میں قید اس کا جگمگانا چہرہ اس کی آواز سب کچھ ان کے دل میں اتر رہا تھا۔ ہارون کے عارش کی طرف متوجہ ہونے پر وہ صبیحہ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

”بہت پیاری ہوتی، اپنی آواز سے بھی زیادہ۔“ ان کے لہجے اور آنکھوں میں جانے کیا تھا کہ خرمن کچھ بول نہیں سکی تھی۔

”تمہارے ماں باپ بھی بہت اچھے ہوں گے جنہوں نے تمہاری اتنی اچھی تربیت کی ہے وہ خیریت سے ہیں؟“

”جی وہ دونوں خیریت سے ہیں مگر ابھی اس شہر میں نہیں ہیں۔ بابا اپنے بڑے بھائی کے پاس گئے ہوئے ہیں سرگودھا، امی بھی ان کے ساتھ گئی ہیں۔“

”تمہارے والد کے بڑے بھائی تمہارے تایا ہوئے۔“ صبیحہ مسکرائی تھیں جب کہ کچھ شرمندہ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ تب ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہشام تزلباش کی نظریں خرمن پر ٹھہر گئی تھیں۔ جب کہ ان کی رعب دار شخصیت نے اسے سنجیدہ اور مرعوب کر دیا تھا۔ عارش نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ان سے مصافحہ کیا تھا۔ خرمن نے مدغم لہجے میں ان کو سلام کیا تھا۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ ہشام تزلباش کے بیٹھے ہی صبیحہ اٹھ رہی تھیں جب خرمن نے ان کا ہاتھ

”ابھی آتی ہوں تم پہلی بار یہاں آئی ہو، ایسے ہی تو نہیں جانے دوں گی۔“ اسکارف میں چھپے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتیں وہ بہت محبت سے بولی تھیں۔

”کوئی تکلف مت کریں۔ میں پہلی بار آئی ہوں مگر آخری بار نہیں، ہم بس اب اجازت چاہیں گے۔“

”خرمن! ابھی تو تم دونوں آئے ہو اور اتنی جلدی تم جانے کی بات کر رہی ہو۔“ ہارون نے کچھ ناراضی سے اسے دیکھا تھا۔

”آپ ناراض مت ہوں ابھی تو صرف ہم آپ کی خیریت دریافت کرنے آئے تھے۔ آئندہ جب آئیں گے آپ کی مرضی سے ہی جائیں گے۔“ خرمن سے پہلے ہی عارش نے کہا تھا۔

”دراصل ہم شام سے ہی گھر سے نکلے ہوئے ہیں۔ واپس آتے ہوئے یہاں آنے کا ارادہ ہو گیا۔ ورنہ اتنی رات میں ہم آپ سب کو ڈسٹرب نہیں کرتے۔“ خرمن نے کہا تھا۔

”یہ بات عارش کہتے تو میں یقین کر لیتا کیوں کہ یہ جلدی سو جاتے ہیں مگر آپ تو 12 بجے تک ریڈیو پر شو ہوسٹ کر رہی ہوتی ہیں۔“ ایک نے فوراً ہی کہا تھا جب کہ خرمن بس عارش کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”عارش! کم از کم کانی کے لیے تو رک جاؤ تمہاری وجہ سے ہمیں بھی مل جائے گی اور زیادہ وقت بھی نہیں لگے گا۔“ ہشام قزلباش بولے تھے۔

”اب تو رکنا ہی پڑے گا۔“ عارش نے مسکراتی نظروں سے صبیحہ کو دیکھا تھا۔

”ایسے ہی کہہ رہے ہیں ورنہ روز اسی وقت میں ان کے لیے کانی بناتی ہوں۔“ چھینپی مسکراہٹ کے ساتھ بولتیں وہ اٹھ گئی تھیں۔

”خرمن! آپ دوبارہ آئیں گی تو میں آپ کو اپنے پالتو مور دکھاؤں گا۔“ ایک نے اچانک اسے مخاطب کیا تھا۔

”ایک! اس طرح بڑوں کا نام نہیں لیتے ہیں۔“ ہشام قزلباش نے اسے فوراً ٹوکا تھا۔

”پاپا! ہمیں تو شکر ادا کرنا چاہیے کہ یہ ہمارے ناموں سے ہمیں نہیں پکارتے۔“ ہارون نے بھی خشمگین لہجے میں ایک کو مزید شرمندہ کیا تھا۔

”ایک کو اجازت ہے ہمارے نام لینے کی، اس لیے آپ اس کو مت روکیں۔“ عارش نے کہا تھا۔

”ویسے تم خرمن کو مور دکھا کر مجھے کسی مشکل میں نہ پھنسا دینا کیونکہ ہمارے گھر میں کبوتروں کے بعد اب کسی بچرے کی جگہ نہیں ہے۔“

”آپ کے گھر میں کبوتر ہیں، مجھے کیوں نظر نہیں آئے؟“ ایک نے شدید حیرت سے کہا تھا۔

”اب گھر آؤ گے تو ٹیرس پر جا کر ان کا دیدار کر لیتا۔“ عارش نے کہا تھا۔

”عارش! تم کبوتروں کے لیے ٹائم کیسے نکالتے ہو؟“ ہارون بھی حیرانی سے بولا تھا۔

”میں اپنے لیے ٹائم نہیں نکال پاتا آپ کبوتروں کی بات کر رہے ہیں ان محترمہ سے پوچھیں۔ بچپن سے کبوتروں سے عشق ہے ان کو۔“

”خرمن! تم نے کبوتر پالے ہوئے ہیں؟“ ہارون نے ہنستے ہوئے حیرت سے اسے دیکھا تھا جو اب اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

”بس اب تیار ہو جاؤ، ریڈیو پر تمہارا ریکارڈ لگنے والا ہے۔“ ہارون کے کہنے پر وہ ہنسی تھی مگر اگلے ہی پل اس کی ہنسی معدوم ہو گئی تھی۔ جب اس نے ہشام قزلباش کو بہت سنجیدہ نظروں سے اپنی جانب دیکھتا پایا۔ بہت عجیب سا کچھ محسوس کرتی وہ دوبارہ ان کی جانب دیکھنے سے گریز کرتی رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں جب صبیحہ کانی کے ساتھ واپس آئیں تو وہ ایک سے ہی بات کر رہی تھی جب کہ باقی تینوں مرد حضرات ملکی اور سیاسی حالات پر گفتگو کر رہے تھے۔ کانی پینے کے دوران صبیحہ اس سے ہلکی پھلکی باتیں کرتی رہی تھیں ان سے نظر بچا کر وہ ہشام قزلباش کی طرف متوجہ ہوتی رہی تھی۔ کیوں؟ یہ وہ بھی نہیں جانتی تھی کانی کے بعد عارش نے جانے کی اجازت چاہی تھی کیوں کہ اسے اندازہ تھا کہ خرمن اب گھر جانے کے لیے بے چین ہوگی۔

”خرمن! تم سے اچھی طرح بات بھی نہیں ہو سکی۔ اب جانے کب آؤ گی تم۔“ صبیحہ کی آنکھوں میں اسے حسرت سی نظر آئی تھی۔

”آپ فکر مت کریں، میں جلد ہی دوبارہ آؤں گی۔ قریب ہی تو گھر ہے۔ آپ بھی جب چاہیں میرے گھر آ سکتی ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بہت خلوص سے بولی تھی۔ اسے واقعی صبیحہ بہت اچھی اور دل کے قریب لگی تھیں۔

”اچھا! اب جو میں تمہیں دے رہی ہوں۔ بہت محبت سے دے رہی ہوں تم انکار مت کرنا۔“ صبیحہ بولی تھیں اگلے ہی پل خرمن ذنگ رہ گئی تھی جب انہوں نے اپنے ہاتھ سے ایک انگوٹھی اتار لی تھی۔

”یہ کیوں کر رہی ہیں آپ، اس کی کیا ضرورت۔ بر؟“ خرمن نے انہیں روکنا چاہا تھا مگر وہ ان سنی کے انگوٹھی اس کے ہاتھ میں پہنا چکی تھیں۔ جب کہ اس نے مدد طلب نظروں سے عارش کو دیکھا تھا۔

”عارش کی طرف مت دیکھو وہ کچھ نہیں کہے گا اور اگر کہے گا تو میں اس سے ناراض ہو جاؤں گی۔“ صبیحہ نے مسکراتی نظروں سے عارش کو دیکھا تھا۔

”آپ یہ اس لیے کہہ رہی ہیں کہ آپ کو یقین ہے میں آپ کو ناراض نہیں کر سکتا۔ اب ہمیں یہاں سے رخصت کرنے سے پہلے کچھ توجہ آپ مجھے دیں گی؟“ عارش نے مسکراتے ہوئے سر ذرا ان کے سامنے جھکایا تھا۔

”ظاہر ہے تم میرے لیے خرمن سے پہلے ہو۔“ پر شفقت انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتیں وہ مسکرائی تھیں۔ صبیحہ کے ہمراہ باہر آتے ہوئے اسے ہشام قزلباش ارد گرد دکھائی نہیں دیئے تھے۔ بالکل غیر ارادی طور پر اس نے گروں موڑ کر دیکھا تھا۔ دور کے ہشام قزلباش اس کی طرف ہی متوجہ تھے جو گڑ بڑا کر فوراً ہی اپنے ساتھ چلتیں صبیحہ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

وڈا اسکرین سے نگاہ ہٹا کر عارش نے ایک نظر اسے دیکھا تھا جو اپنی انگلی میں چسکتی نازک سی انگوٹھی پر نظر جمائے بالکل خاموش تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ عارش کی آواز نے اسے چونکایا تھا۔

”مجھے بہت عجیب لگ رہا ہے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کا زیور اتار کر مجھے دے دیا۔ انہوں نے اتنی محبت اور عزت دی وہ کافی تھا۔“ وہ تذبذب میں مبتلا بولی تھی۔

”یہ ان کی محبت کا اظہار ہے جس کے لیے دل میں محبت ہوتی ہے اس کے سامنے قیمتی سے قیمتی چیز بھی اہم نہیں رہتی اور تم اس قابل ہو کہ تمہیں اپنا سب کچھ دے دیا جائے۔“ ایک گہری نظر اس پر ڈالتا وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔

”تمہیں کیسے لگے ہارون کے پیرٹس؟“ اس کی خاموشی پر وہ پوچھ رہا تھا۔

”بہت اچھے۔“ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔ اچانک ہی اس کی آنکھوں کے سامنے ہشام قزلباش کا چہرہ آگیا تھا۔ ان کی پرکشش شخصیت نے اسے بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔

☆.....☆

شدید گھبراہٹ، بے چینی اور بے قراری نے آج پھر انہیں بے حال کر رکھا تھا۔ رات دیر سے دیر سے قیامت بن کر آج پھر ان پر گزر رہی تھی۔ چہارست پھیلی تاریکی اور گھٹن میں زندگی کہاں تھی۔ کھلتی سانسوں کے ساتھ ان کے جسم سے جان نکلتی جا رہی تھی۔ لرزتے قدموں سے چلتیں وہ اسٹڈی روم کے کھلے دروازے پر رک گئی تھیں۔ سامنے وہی منظر تھا وہی عذاب ناک خاموشی میں ولی کو چیر دینے والی گریہ و زاری کی کرب ناک کراہیں جو اس شخص کے دل سے ابھر رہی تھیں۔ صبیحہ کو اپنے دل میں کئی خنجر ایک ساتھ اترتے محسوس ہوئے تھے۔ یہ اذیت ناقابل برداشت تھی۔

جبدے میں گرے اپنے دل کے زخم اللہ کو دکھاتے ہوئے اس انسان کو کتنے سال گزر چکے تھے۔ دیوار کا سہارا لیے وہ بمشکل توازن قائم رکھ سکتی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے گرتے آنسوؤں کا دروازہ ہرگز بھی اس انسان کے درد سے کم نہیں تھا جو جبدے میں تھا یہ فریادیں کب تک دل سے نکلتی رہیں گی اور جانے کب آسمان والے تک پہنچیں گی۔ یہ صبر تو اب زندگی کے ساتھ ختم ہونا تھا اور زندگی اب وہ بھی کتنی رہ گئی تھی۔ ان کے بے آواز آنسو اور دل کے اندر اٹھتا درد کا تلاطم سینہ کو بی پر مجبور کر رہا تھا۔ پتہ نہیں کس طرح وہ اپنے بکھرتے وجود کو کچھ پختہ وارڈ رو ب تک گئی تھیں۔ وہ قیمتی بیگ جس میں ان کی جان ان کی سانسیں اور خوشیاں تک بند تھیں اسے سینے سے لگائے وہ وہیں بیٹھتی چلی گئی تھیں۔ اسٹڈی روم سے باہر آنے ہشام قزلباش ساکت کھڑے رہ گئے تھے۔ کئی چابک ان کی پشت پر پڑتے عذاب کو بڑھا گئے تھے۔ بیگ میں سے ایک ایک چیز نکالتیں وہ دیوانہ وار ان سب چیزوں کو چومتی جا رہی تھیں۔ یہ کام وہ پہلی بار نہیں کر رہی تھیں۔ وہ کام جو موت سے بڑھ کر اذیت ناک تھا۔ رات کے پہروں میں یہ کام کرنا ان کی زندگی کا لازمی حصہ بن چکا تھا۔ اپنے وجود کے گم شدہ حصے کو اس کی خوشبو کو اس کے لمس کو ڈھونڈنے کے لیے جو کہیں وقت کے اندھیروں میں گم ہو چکا تھا۔ اس کی تلاش میں انہیں اس بیگ کو کھولنا پڑتا تھا۔ جس میں ان کی زندگی قید تھی۔ ڈبڈبائی نظروں سے صبیحہ نے ان کو دیکھا تھا جو بہت خاموشی سے قریب آئے تھے۔ شدت ضبط سے ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ایک لفظ بھی کہے بغیر

رداؤ انسٹ 90 جنوری 2015ء

وہ بکھری چیزوں کو واپس بیگ میں ڈالنے لگے تھے۔

”یہ سزا کب ختم ہوگی۔ میں دن رات اللہ سے پوچھتی ہوں مگر مجھے جواب نہیں ملتا۔ آپ اللہ سے پوچھیں اسے ہم پر رحم کب آئے گا۔“ زار و قطار رو تیں وہ کہہ رہی تھیں۔

”اللہ سے سوال نہیں کیے جاتے صبیحہ! اس کے لیے جو صبر تم کرتی آئی ہو اسے ضائع مت کرو۔“ وہ لرزتے لہجے میں بولے تھے۔

”اور کتنا صبر؟ یہ صبر تو مجھے ختم کر چکا ہے۔ اب کیا بچا ہے۔“ ان کے بازو سے سر ٹکائے وہ بلک اٹھی تھیں اور ہشام قزلباش کے پاس کہنے کے لیے کوئی لفظ بھی نہیں رہا تھا۔ تسلی کے لفظ صبر کی تلقین یہ سب سالوں سے دہراتے دہراتے وہ تھک چکے تھے۔ لفظوں کی تاثیر ختم ہو چکی تھی اور اب تو تمام لفظ بھی مگر طویل عرصے سے تڑپتی بلکتی عورت کو ان کے لفظوں کا ہی تو سہارا رہا تھا اب تک وہ جانتے تھے کہ اگر صبیحہ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تو وہ مر جائیں گی اور وہ خود بھی تو اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے۔

”اللہ کی رضا میں راضی رہو صبیحہ! وہ کب تمہاری آہیں سن لے کب اپنے کرم کی بارش کر دے کون جانتا ہے وہ کبھی اپنے بندوں کو واپس نہیں کرتا۔“

”مگر میری ساری امیدیں ختم ہو چکی ہیں اور میں بھی۔ کوئی ایک بار مجھے اس کا چہرہ دکھا دے۔ اس کے بعد زندگی بھی مجھ سے چھین لے۔“ ہذیبانی انداز میں روتی چھینٹیں وہ جیسے دیوانہ وار کمرے سے نکلی تھیں مگر ہر یکدم ہی ان کی چیخیں دم توڑ گئی تھیں۔

حشت زدہ نظروں سے وہ اسے دیکھ رہی تھیں جو ریلنگ پر ہاتھ رکھے آخری اسٹیپ پر رکھا ہوا تھا۔ صبیحہ کو دیکھتے ہوئے اس کا دل کسی آہنی ٹکڑے میں جکڑنے لگا تھا اور چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ اس کی نظریں ان پر ہی ساکت تھیں جو دیر سے دیر سے چلتیں اس کے قریب آ چکی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ کہیں دور بھاگ جائے مگر وہ پتھر کا نمسہ بن چکا تھا۔

”پاروں! تم جانتے ہو اس کی آنکھیں بالکل تمہارے جیسی تھیں۔“ لرزتے لہجے میں بولتے ہوئے وہ اپنی طرف جھکایا تھا۔

”آخری بار تم نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔“ بتے آنسوؤں کے ساتھ وہ بے اختیار اس کی آنکھوں کو چوم رہی تھیں۔ بار بار چوم رہی تھیں۔ ان کے آنسوؤں سے اس کی آنکھیں بھی بھگ گئی تھیں جو آج بھی اپنے صبیحہ کی محبت میں مجرم تھا اس بے بس تڑپتی عورت کا گناہ گار تھا۔

”اللہ کی بارگاہ سے چھو اٹھا۔“ وہ لب دیوانہ وار اس کے ہاتھوں کو چوم رہی تھیں۔ ساکت کھڑے ہشام نے ہاتھوں سے بھٹکے بڑھ کر صبیحہ کے ہاتھوں سے اس کے ہاتھ چھڑائے تھے۔ ضبط سے خون رنگ ہونی انہوں نے ہارون نے باپ کے چہرے پر پھیلی اذیت کو دیکھا تھا اور اگلے ہی پل سیڑھیاں چڑھتا گیا تھا۔ یہی کراہوں نے اسے کسی پاتال میں لے جا کر غرق کر دیا تھا۔

”کوئی بد دعامت دینا صبیحہ! ہمارے ساتھ وہ بھی مستقل اذیت کو سہتا آ رہا ہے۔ میں مرتے دم تک تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی کی بھیک مانگا رہوں گا مگر تم اسے.....“ آج پھر وہ بھگتے لہجے میں

رداؤ انسٹ 91 جنوری 2015ء

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ تمام پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### آپنا اصل کیوں نہیں دے

- ✧ ہرائی ٹیک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای ٹیک کا پرنٹ پر یوٹیو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریویج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہرائی ٹیک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ یہ ایم کو آئی، ہمارے کو آئی، کچھ بڈ کو آئی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریویج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد و ب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں [www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)

ان سے التجا کر رہے تھے جو ان کے سینے سے لگیں روتے روتے غڑھال ہو چکی تھیں۔

☆.....☆

گہری نیند ٹوٹنے کا سبب شاید اس کی سانس بھی تھیں جو سینے میں پھنس رہی تھیں۔ سن دماغ اور وجود کے ساتھ وہ اب تک ان دردناک کراہوں اور تاریک ہیولوں کے درمیان گہری ہوئی تھی۔ چند لمحے اسی طرح ساکت رہنے کے بعد اس نے ایک نظر گہری نیند سوئے عارش کو دیکھا تھا اور پھولی سانسوں کو سنبھالتی اٹھ بیٹھی تھی۔ اس کی پیشانی عرق آلودہ تھی۔ اندر گھٹن بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک بے بسی سے اس نے سر ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ یہ سب اب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ اب پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ جہاں تاریکی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ وہ جانتی تھی کہ کتنی بار خود کو مار کر اس نے زندگی کو اپنے موافق بنایا تھا۔ ہر سوچ ہر خیال ہر سوال کو کھریج کر دل و دماغ سے نکال پھینکنے میں اس کو زمانے لگے تھے۔ خود کو چاک بکٹ مار کر سدھایا تھا۔ ایک ایک کرچی کو سینے کے بعد وہ اب پھر سے بکھرنا نہیں چاہتی تھی۔ ایک نئی زندگی میں داخل ہو کر بڑی مشقتوں سے اس نے خود کو ایک سانچے میں ڈھالا تھا۔ کم از کم اب وہ اپنی اس نئی زندگی تک، ماضی کے کسی تاریک سائے کو رسائی حاصل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ جو خلا تھا اسے اب کبھی نہیں بھرنا تھا۔ وہ یہ قبول کر چکی تھی اسے قبول کرنا ہی تھا ورنہ اس دنیا میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ اپنی زندگی کی وہ اب قدر کرتی تھی۔ زعمہ رہنا اسے عزیز ہو چکا تھا۔ اب اس مقام تک آ کر وہ بار بار مرنے کی اذیت نہیں سہنا چاہتی تھی۔ سائیڈ ٹیبل کی دراز سے ان ہیلر نکالتے ہوئے وہ اپنے اعصاب کو مضبوط کرنے کی کوشش میں کامیاب ہو رہی تھی۔ اس کا حال اس کے ماضی سے زیادہ طاقتور ہے اور اسے صرف اپنے حال میں جینا ہے۔ اپنے مستقبل کو تانناک کرنا ہے جو گزر گیا سو گزر گیا۔ دھیرے دھیرے پانی کے گھونٹ لیتی وہ پرسکون ہونے لگی تھی۔ خالی گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھتی وہ چونک کر عارش کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”کچھ نہیں ہوا، بس پیاس لگی تھی اس لیے اٹھ گئی۔“ اس کے استفسار پر وہ بتا رہی تھی۔

”تم بالکل برف کی طرح سرد ہو رہی ہو۔“ اس کا ہاتھ تھام کر قریب کرنا وہ تشویش میں مبتلا ہوا تھا۔

”مجھے تمہاری طبیعت بہتر نہیں لگ رہی۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں، کبیل سے باہر تھی اس لیے میرے ہاتھ ٹھنڈے محسوس ہو رہے ہیں۔ تمہیں اب

مجھے سونے دو۔“ اس کے بازو پر سر رکھے وہ بند آنکھوں کے ساتھ بولی تھی۔

”میں پریشان ہو گیا تھا۔“ اس پر کبیل ٹھیک کرنا وہ بولا تھا۔

”تمہیں پریشان ہونے کا شوق ہے۔“

”سن کرا چھا لگا۔“ اس کے ناراض لہجے پر بند آنکھوں کے ساتھ بس مسکرائی تھی۔

(جاری ہے)



تھی۔ سلجوق ایک ہاتھ میں ڈرائیو تھا۔ اور ایک ہاتھ میں برش لیے ہالوں کو سکھا رہا تھا۔ کتب خانے ٹیبل پر رکھ کر اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

”ہماری جوڑی کتنی اچھی لگتی ہے نا؟“ آئینے میں اس کے ساتھ بننے والی شبیہ کو ہنوز دیکھتے ہوئے بولی۔

”مجھے تمہاری یہ حرکتیں اور بے فکری باتوں سے چڑ

اس سے ٹپ کر بہت خوش تھے۔ وہ صبح جلدی بیدار ہو گیا تھا۔ واش روم سے نہا دھو کر نکلا تھا بلیک کلر کی ڈریس پیٹنٹ ٹرٹ گوری رنگت میں اس کا چہرہ خوب دک رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

”-yes, come in“ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر گئے آئینے کے سامنے کھڑے ہوتے کہا تھا۔ دروازہ کھول کر کتب خانے لے کر اندر داخل ہوئی

مہرین کنول

افسانہ

## میں نے اور سالی نو

سلجوق کل ہی کینڈا سے آیا تھا چھ سال قبل وہ بزنس بھی جمایا تھا۔ سب عمر واسلے، مازہ اور احمر پڑھنے گیا تھا۔ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد وہیں اپنا (سلجوق کے ماں باپ) اور چچا چچی احسن اور ہادیہ



ہے۔" سلجوق فوراً آئینے کے سامنے سے ہٹا تھا۔  
 "ہا ہا ہا ہا۔" وہ بے اختیار ہنسی تھی اور پھر ٹرے کی طرف بڑھی تھی۔

"یہ لیجئے چائے۔" تسبیح نے کیتلی سے چائے کپ میں ڈال کر سلجوق کو دیتے ہوئے کہا۔  
 "میں چائے نہیں پیتا۔" سلجوق نے ناگواری سے تسبیح کو دیکھتے ہوئے کہا۔  
 "لیکن آپ تو ہر صبح چائے پینا پسند کرتے ہیں۔"  
 تسبیح کو حیرت ہوئی تھی۔

"مجھے تمہارے ہاتھ کی چائے پینا پسند نہیں۔" اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔  
 "جیسی آپ کی مرضی۔" تسبیح زیادہ بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھی اس لیے چائے کا کپ واپس ٹرے میں رکھ کر بولی تھی۔  
 "happy new year" تسبیح نیوایز کارڈ سلجوق کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"مجھے یہ چونچلے بالکل پسند نہیں ہیں۔ کیا جتنا چاہ رہی ہو؟" سلجوق نے کارڈ لے کر بیڈ کے ایک طرف بے دردی سے پھینکتے ہوئے کہا۔  
 "ایسی بھی کیا بے رخی، آپ کی بچپن کی منکوحہ ہوں، بھئی بچپن میں آپ ہم پر بہت مرا کرتے تھے نا۔" تسبیح شرارت سے بولی تھی۔

"اب اپنی شکل لے کر یہاں سے چلی جاؤ" میں بچپن کے نکاح کو نہیں مانتا۔ وہ سب صرف گڈے گڑیا کا ٹھیل تھا جسے ہمارے بڑوں نے کھیلا تھا میں بھول چکا ہوں تم بھی بھول جاؤ۔" سلجوق نے سفاکی سے کہا تھا۔

تسبیح اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی تھی۔ آنکھوں میں آنی نمی کو صاف کر کے کمرے سے باہر نکل گئی۔  
 تسبیح کے جانے کے بعد سلجوق نے اپنا موبائل اٹھایا اور ایک شاسا فون ٹوڈ دیکھنے لگا، کتنا محصوم اور بھولا بھالا چہرہ تھا اس کا جسے تمکین حیدر کہتے تھے۔ اس کے

دوست اشعر کی کزن تھی۔ کینیڈا میں ہی اشعر کی پارل میں ملاقات ہوئی تھی، زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔

☆.....☆  
 دوپہر کے کھانے کی ٹیبل پر سب ہی موجود تھے سلجوق بھی اپنے کمرے سے نکل کر ڈائننگ ٹیبل پر کرسی گھسیٹ کر بیٹھا تھا۔  
 "واہ آج کھانا لگتا ہے مام آپ نے بنایا ہے؟"  
 سلجوق نے مائرہ کو مخاطب کیا جو اس کی پلیٹ میں تو رمد ڈال رہی تھیں۔

"نہیں بیٹا آج یہ سب کھانے تسبیح نے بنائے ہیں خاص تمہارے لیے۔ بڑی سعادت مندی ہے۔"  
 مائرہ نے شفقت سے بیٹے کو کہا تھا۔  
 "لیکن مجھے یہ کھانے بالکل پسند نہیں۔" سلجوق نے پلیٹ پر بے ہٹا کر نخوت سے کہا۔  
 "لیکن بیٹا یہ سب تمہاری پسند کے کھانے ہیں تم بڑے شوق سے کھاتے ہو۔" مائرہ نے حیرت سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی مام! لیکن مجھے تسبیح کے ہاتھ کے کوئی پکوان نہیں پسند۔" سلجوق نا پسند لہجے میں کہہ کر وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ تسبیح اپنی آنکھوں میں آنی نمی کو چھپائے وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

"معاف کیجیے میں ذرا دکھتی ہوں۔" حیرت سے دیکھتے احسن اور ہادیہ سے نظریں چراتے ہوئے مائرہ نے کہا تھا اور سلجوق کے کمرے میں آئی تھی۔  
 "سلجوق! یہ کیا بد تمیزی ہے کیا یہی اخلاق سیکھ کر آئے ہو کینیڈا سے نہ بڑوں کا لحاظ مروت کچھ نہیں تمہارے چچا چچی کیا سوچتے ہوں گے تمہارے بارے میں کل تسبیح کی رخصتی ہے وہ اب ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس آ جائے گی ایسے میں تمہارا رویہ ہرگز کونا گوارا گزرے گا۔" مائرہ نے سلجوق کو ڈپٹے ہوئے کہا۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپ مام! میری اور تسبیح کی شادی! تسبیح کی رخصتی امپا سبل! اور مجھے بتایا بھی نہیں۔" سلجوق نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔  
 "مام! یہ رخصتی نہیں ہو سکتی، میں تسبیح کو پسند نہیں کرتا۔" سلجوق نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"ہمارا ارادہ تمہیں سر پر اترو دینے کا تھا مگر تمہیں نہ جانے کیا پریشانی ہے تسبیح سے، جب سے آئے ہو تسبیح سے ٹھیک طرح سے سلوک نہیں کرتے وہ تمہاری منکوحہ ہے بچپن میں ہی تم دونوں کا نکاح کر دیا گیا تھا یہ سب تمہیں پتہ ہے؟ میں اب مزید تمہاری ایک نہیں سنوں گی کل شام ہی رکھی گئی ہے رخصتی، تم تیار رہنا۔"  
 "مام! یہ سارا فساد وہ نکاح ہے جو تسبیح کے ساتھ بچپن میں ہوا تھا، میں ابھی جا کر اسے طلاق.....!!"  
 "چٹاخ!" ایک پھپھو سلجوق کے گال پر مائرہ نے مارا تھا۔

"اتنی بڑی بات تم سوچ بھی کیسے سکتے ہو اگر ایسا کیا تو میرا ہوا منہ دیکھو گے۔" مائرہ سلجوق کو ہکا بکا چھوڑ کر چلی گئیں۔ سلجوق نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ رخصتی نہیں ہونے دے گا۔

صبح شام میں ہونے والی تقریب کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ سلجوق کو ناشتہ کرانے کے بعد مائرہ اسے ایک دیدہ زیب لباس دے کر اسے تاکید کر کے چلی گئی تھیں اور دوسری طرف تسبیح سہانے خواب لٹنے کی خوشی میں بیٹھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ شام بھی ہو چلی تھی۔ مہمانوں کی آمد بھی ہو رہی تھی۔ کیا کیا نہ آرائش اور زیبائش کی گئی تھی۔ ہندی چوڑیاں، بندیا، نت جھومر، رانی ہار، جھمکے، انگوٹھیاں، پائل اور پنک کلر کا خوبصورت سا بھاری زیبائش کا شرارہ۔ اس پر پوری دلہن کا نکھار آیا ہوا تھا۔

مائرہ تسبیح کو دیکھ کر سلجوق کے کمرے میں آئی تھی۔ "سلجوق..... سلجوق بیٹا! مائرہ نے کمرے کا

جائزہ لیا۔ وہ کہیں موجود نہ تھا۔ اچانک مائرہ کی نظر ٹیبل پر رکھے کاغذ پر پڑی وہ اسے اٹھا کر پڑھنے لگیں۔

"مام! جس وقت آپ میرا خط پڑھ رہی ہوں گی، میں یہاں سے جا چکا ہوں گا۔ میں تسبیح کو پسند نہیں کرتا۔ میں کینیڈا واپس جا رہا ہوں۔" مائرہ کے ہاتھ سے خط گر چکا تھا۔

تسبیح کو جب یہ پتہ چلا اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ احسن اور ہادیہ بیٹی کے غم میں پاگلوں کی طرح مائرہ اور احمر پر برس پڑے۔

"بھائی صاحب اور بھابھی ہم نے اپنی بیٹی آپ کو کیا اس لیے سوچی تھی کہ ایک دن آپ کا بیٹا اسے یوں بھری محفل میں تماشہ بنا کر چھوڑ کر چلا جائے۔ ہماری بیٹی کی زندگی برباد کر دی سلجوق نے۔" احسن نے احمر اور مائرہ کو کٹھور پین سے لتاڑا۔

"نہیں بابا جانی! اس میں تباہی اور تائی امی کا کوئی قصور نہیں، سلجوق نے لاپرواہی کا مظاہرہ کیا ہے میرا ان سے نکاح ہوا ہے نکاح کے وقت عمریں ہی کیا تھیں۔ میری گیارہ سال اور ان کی اٹھارہ سال میری رخصتی وقت پر چھوڑ دیجیے۔" مہمان تو سلجوق کے جانے کا سن کر چہ گویاں کرتے چلے گئے تھے۔ احسن اور ہادیہ منہ بنا کر اپنے کمرے میں چلے آئے اور مائرہ اور احمر، تسبیح کو خود سے لگائے اپنی مالالتق اولاد پر آنسو بہاتے رہے۔

☆.....☆

"سلجوق یہ بریسلٹ کس کے لیے لے رہے ہو؟" جیولری شاپ پر کھڑے سلجوق کو بریسلٹ خریدتے دیکھ کر پوچھا تھا۔  
 "وقت آنے پر بتا دوں گا۔" سلجوق نے رازداری سے کہا تھا۔

"اور یہ کب آئے گا وقت؟" اشعر نے معنی خیزی





سے کہا۔  
”بہت جلد۔“ سلجوق نے شاپ سے باہر نکلنے ہوئے کہا۔

اشعر کو اس کے گھر ڈراپ کر کے سلجوق حکیمین حیدر کے گھر آیا تھا۔ حکیمین آئے روز اس کا استقبال کرتی سلجوق کے لائے ہوئے گفٹ لے لیتی اور کبھی کبھی ریٹورنٹ بھی جاتی اور کبھی بھاری شاپنگ کرتی۔ سلجوق دل کے ہاتھوں مجبور اس کے غرے اٹھاتا۔ ایک دن سلجوق کا دل ٹوٹا تھا حکیمین کے گھر اس نے اس کا رشتہ مانگا تھا۔

”حکیمین اپنے کزن کے ساتھ منسوب ہے۔“ حکیمین کی ماں نے ہی سلجوق کو بتایا تھا۔ حکیمین نے بھی بے رخی برتی تھی۔ اشعر بھی وہاں موجود تھا اور سلجوق پر غصہ ہوا تھا۔

”سلجوق مجھے پہلے بتانا چاہیے تھا کہ تم حکیمین میں انٹرنلڈ ہوتا کہ میں تمہیں پہلے روک لیتا۔“ اشعر نے نخوت سے کہا۔

”لیکن کیوں، اگر مجھ سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا تھا تو مجھ سے وہ تخفے کیوں لیے گئے اور حکیمین اتنے آرام سے میرے ساتھ شاپنگ اور ریٹورنٹ کیوں جاتی تھی؟“ سلجوق کو بھی غصہ آیا تھا حکیمین سے زیادہ خود پر کہ وہ کیسے اتنی کٹھور اور بے مروت لڑکی کے جھانسنے میں آ گیا۔

”تم سے وہ تخفے کسی نے نہیں مانگے تھے تم خود لاتے تھے۔ شاپنگ اور ریٹورنٹ بھی خود لے کے جاتے تھے۔ آئندہ یہاں قدم مت رکھیے گا۔“ حکیمین نے سلجوق کو دو ٹوک لہجے میں کہا۔ اشعر الگ منہ بسرے ہوئے تھا۔

سلجوق بڑی ریش ڈرائیونگ کر کے گھر پہنچا تھا۔ آنکھوں میں آنی نمی کو روک نہیں پارہا تھا۔ اپنے کمرے کی ہر چیز اٹھا اٹھا کر پھینک رہا تھا۔ چیخ رہا تھا،

چلا رہا تھا اور زار و قطار رو رہا تھا کہ ایک فیملی فوٹو ہاتھ میں آئی اس سے پہلے کہ اسے پھینکتا ہاتھ روک لیا اپنے ماں باپ اور چچا چچی کے پُرفیشن چہرے جیسے اسے دیکھ رہے ہوں اور ان کے ساتھ ایک معصوم چہرہ شری آنکھیں لیے اس سے سوال کر رہا تھا۔

”سلجوق دل ٹوٹنے کا مزہ چکھا، کیسا لگ رہا ہے؟“ سلجوق کی آنکھوں سے سیل رواں تھا جو اس کے چہرے کو گیلا کر رہا تھا اور کب وہ نیند کی وادیوں میں چلا گیا اسے پتہ ہی نہیں چلا۔

☆.....☆

”سلجوق آفس سے سیدھا گھر پہنچا تھا۔ عاقب سلجوق کا خالہ زاد کزن پاکستان سے آیا تھا، اس کے گھر پہلے سے موجود تھا۔

”ارے عاقب تم یہاں کیسے؟“ سلجوق نے حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت سے پوچھا تھا۔

”بھئی تم سے سخت ناراضی کا اظہار کرنے آیا ہوں تم اتنے بڑے بزدل نکلو گے میں نے سوچا بھی نہیں تھا آخر کیا برائی تھی تبھی بھائی میں میں تو کہتا ہوں جا کر دیکھو وہاں پر تمہارے ماں باپ کی جو تم نے ان کی خدمت کرنی تھی وہ بھی تبھی بھائی سرانجام دے رہی ہیں اگر کچھ شرم ہے تو چلے جاؤ وہاں۔“ عاقب یہ کہہ کر وہاں سے چلتا ہوا سلجوق جمل سا ہو کر تبھی کی فوٹو کو دیکھتا مخاطب ہوا۔

”لگتا ہے آپ ہمارا انتظار کر رہی ہیں، اب آپ کا انتظار ختم۔“ اور پھر سب حیران رہ گئے سلجوق اچانک لوٹ آیا۔ ماڑہ اور ہادیہ کی آنکھیں اشکبار تھیں، سلجوق نے ان کو کہا تھا۔

”آپ رخصتی کی تیاری کیجیے۔“ سلجوق نے ماحول خوشگوار کیا تھا۔ اس بات پر احسن اور احمر نے سب کچھ بھلا کر اس کو گلے لگالیا۔ تبھی نے اس کی آمد کا سنا تو خوشی کے بجائے اس کے آنسو رواں ہو گئے۔ ماڑہ

نے اسے آ کر سلجوق کے لیے پکوان بنانے کے لیے کہا اور تبھی بیچ نہ کر سکی۔

”داد بہت خوب یہ تو رسمہ کس نے بنایا ہے؟“ سلجوق نے کھانا کھاتے ہوئے ماڑہ سے پوچھا۔

”بیٹا، تبھی نے بنایا ہے مگر تم کو تو اس کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں، میری طبیعت ذرا نا سازھی اسی لیے تبھی سے کہہ دیا تھا۔“ ماڑہ نے سادگی سے کہا تھا۔

”مام! تبھی واقعی بہت اچھا کھانا بناتی ہے after all اب اسی کے ہاتھوں سے زندگی بھر کھانا ہے۔“ سلجوق کی بات پر سب نے قہقہہ لگایا اور تبھی وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

رات کو سب سے نظریں بچا کر سلجوق، تبھی کے روم میں آیا۔ تبھی اپنی سوچوں میں گم ڈرینک ٹیبل پر لگے آئینے کے سامنے بیٹھی تھی کہ اچانک ایک اور شبیر اس کے سامنے بیٹھی۔

”ہماری جوڑی کتنی اچھی لگتی ہے نا؟“ سلجوق نے شرارت سے کہا۔ تبھی کے بے اختیار ہٹنے پر سلجوق حفا اٹھاتا قہقہہ لگانے لگا۔

”آپ یہاں سے چلے جائیں مجھے اسی حرکتیں پسند نہیں۔“ تبھی نے ناگواری سے کہا۔

”اسکی بھی کیا بے رخی، بھی میرے بھاگنے سے پہلے تم ہم پر بہت مرا کرتی تھیں نا؟“ سلجوق نے تراست سے کہا۔

”کیسے میری نقل مت اتاریے کیا جتنا چاہ رہے ہیں آپ؟“ تبھی نے پُر ہلکوا انداز میں پوچھا تھا۔

ہم نہ رہے ہم جو تھے کبھی  
خود کو چھوڑا پیچھے کہیں  
تیری اور بڑھنے لگے  
تیری طرح بننے لگے  
اب تو محبت میں لٹنے چلے

سلجوق خمار لہجے میں گلگلتا ہوا ایک ڈائمنڈ بریلیٹ تبھی کو پہنانے لگا۔

”چھوڑ دیں میرا ہاتھ۔“ تبھی نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تھی۔

بھئی آپ ہماری منکوحہ ہو، کل آپ کی رخصتی ہے بارات لے کر آؤں گا تیار رہنا۔“ یہ کہہ کر سلجوق کمرے سے نکل گیا اور تبھی انگشت بدنداں رہ گئی۔

سلجوق دھوم دھام سے بارات لے کر ہال میں آیا تھا۔ رخصتی شاندار ماحول میں ہوئی تھی کہ سب کی آنکھیں خوشی سے اشکبار تھیں۔ تبھی دلہن بنی سلجوق کی سچ پر بیٹھی تھی۔ سلجوق کمرے میں داخل ہوا تھا تبھی کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

”آہم!“ سلجوق نے گلا کھنکھارا۔ تبھی نے پلکیں اٹھا کر اوپر دیکھا۔ سلجوق نے ایک ٹھٹھی ڈھیا کھول کر ڈائمنڈ رنگ تبھی کی انگلی میں پہنا دی۔

”سال نو مبارک ہو تبھی!“ ایک نیو ایئر کارڈ تبھی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے سلجوق نے کہنا شروع کیا۔

”تبھی ماضی میں جو مجھ سے غلطیاں ہوئی ہیں وہ دوبارہ نہیں دہرائی جائیں گی۔“ سلجوق نے تبھی کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

”دعدہ!“ تبھی نے کہا۔  
”پکا دعدہ آؤ اب ہم تینوں خوشی کی بہاروں کو ایک ساتھ well come کریں۔“

”تینوں.....؟“ تبھی نے حیرت سے پوچھا۔  
”میں، تم اور سال نو ہا ہا ہا۔“ سلجوق اور تبھی مسکرا دیے تھے۔

سال نو ان کی نئی زندگی کی شروعات میں ساتھ ساتھ تھا۔

☆.....☆



## اعتراف

”ارے شہینہ! تم نے قمر میاں کی دلہن کو دیکھا“ ذریعے جہیز اتراتا تھا۔ کرین کے ذریعے! ”موسے  
ارے کروڑوں کا جہیز اپنے ساتھ لائی تھی کرین کے بھدے نقوش والی عارفہ رحیم اپنی مردانہ آواز کے



چاہیے، بس آپ دو کپڑوں میں اپنی بیٹی کو بیاہ کر  
ہمارے حوالے کر دیں لیکن اس بندے نے بھی اپنی  
شان دکھا دی، بیٹی کو اتنا جہیز دیا کہ سب کی آنکھیں  
پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔“

عارفہ رحیم اپنے بھتیجے کی دلہن کا ذکر ایسے فخر و غرور  
سے کر رہی تھیں کہ جیسے وہ خود ہی کرین سے جہیز لے  
کر اتری تھیں۔

”ارے عارفہ! تم نے وہ برابر والی مدیحہ باجی کو  
نہیں دیکھا کس قدر جہیز دیا ہے انہوں نے اپنی تینوں  
بیٹیوں کو اور کیا فایو اشار ہوگئیں میں اپنی تینوں بیٹیوں



ساتھ جو گفتگو تھیں۔  
”اور یہ بھی نہیں کہ قمر میاں کی دلہن کوئی بد شکل یا کم  
شکل لڑکی تھی جس کی خانہ پوری کے لیے اماں بابا نے  
بیٹی کو جہیز سے لا دیا ہو، ارے میں تو کہتی ہوں ارشد  
بھائی کی بہو چاند کا کلڑا ہے چاند کا کلڑا۔“ وہ اپنی پھولی  
سانسوں کے ساتھ تھوڑی دیر کو رکی اور ایک دم سے  
پھر شروع ہو گئی۔

”ارے ارشد بھائی نے تو صاف کہہ دیا تھا لڑکی  
دالوں سے کہ ہمیں جہیز وہیز کچھ نہیں چاہیے۔ اللہ کا  
دیا ہمارے پاس سب کچھ ہے ہمیں تو بس آپ کی بیٹی

کی شادی کی واہ واہ! "شمینہ بیگم نے بھی عارفہ بیگم کی تائید میں ایک اور مالدار پارٹی کا قصہ چھیڑ دیا۔

"ہاں ہاں شمینہ! مجھ سے زیادہ اور کس کو علم ہوگا اس بات کا اور تمہیں پتہ ہے وہ بے چاری تھی کیا؟ ایک معمولی اسکول ٹیچر زمانہ شش عشر کر رہا تھا ان کی بیٹیوں کی شادی پر۔" عارفہ رحیم نے اپنی بات ختم کر کے واو طلب نظروں سے شمینہ کی طرف دیکھا۔ تو شمینہ بیگم نے بھی ان کی تائید میں بولنا اپنا فرض سمجھا۔

"ہاں عارفہ! بڑی محنت کی اس غریب عورت نے ایک معمولی اسکول ٹیچر ہو کر پائی پائی جوڑ کر لاکھوں کا جہیز بنایا ہے اس عورت نے اپنی بیٹیوں کے لیے۔ ویسے عارفہ سنا ہے تمہاری بہو بھی بڑے مالدار گھرانے سے آئی ہے پھر تو گھر بھر دیا ہوگا اس نے تمہارا؟"

شمینہ بیگم رازداری سے عارفہ رحیم کے قریب ہوتے ہوئے سرگوشی والے انداز میں گویا ہوئیں تو عارفہ رحیم جیسے پیش میں آ کر پھٹ سی پڑیں۔

"ارے بس بس رہنے دو شمینہ! کہنے کو بڑی مالدار ہے چار چار بھائی ڈاکٹر انجینیر ہیں۔ باپ اتنا بڑا بزنس مین ہے اور بیٹی کو دیا کیا ہے ایک معمولی سا بیڈ روم سیٹ اور بس ایسا لگتا ہے جیسے کسی فقیر کی بیٹی کو بیاہ کر لے آئے ہیں۔"

"اُف میرے خدا یا حد ہوتی ہے کسی بات کی۔" زارا گھنٹے بھر سے ذرا تنگ روم میں بیٹھی اپنی ساس عارفہ رحیم اور پڑوسن شمینہ بیگم کی باتیں سن رہی تھی جس دن سے وہ اس گھر میں رہیں بن کر آئی تھی اس دن سے آج تک عارفہ رحیم نے اس کا بیٹا دو بھر کر رکھا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے دولت مند لڑکی ہونے کے باوجود بھر پور طریقے سے جہیز نہ لانے کے طعنہ دیتی رہتی تھیں اور پھر اسی پر ہی برا بھلا کہنے پر اکتفا نہ کرتی بلکہ ہر آنے جانے والے ملنے جلنے والے پڑوسی سے بہو کے معمولی جہیز لانے کا رونا روتی رہتیں اور خاص طور پر شمینہ آنٹی اور زبیدہ کے

ساتھ مل کر اسے سنانے کے لیے کریں اور ٹرک بھر کر جہیز لانے والی لڑکیوں کے سچے جھوٹے قصے سنایا کرتیں اور وہ پانچ سال سے ان کی یہ کڑوی کسلی باتیں خاموشی سے سن رہی تھی اور غصے کا گھونٹ پی رہی تھی۔ حالانکہ جی تو چاہتا تھا کہ ایسی جاہل عورتوں کو جیج جیج کر گالیاں دے اور کوسے لیکن پھر وہی سسرال کا مسئلہ آڑے آ جاتا وہ نصیر سے ان کی جاہلانہ حرکتوں اور رویوں کی شکایت کر کے گھر میں جھگڑا فساد نہیں کرانا چاہتی تھی، اپنا اور اپنے میاں کا سکون بر باد نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے تو وہ صبر کا گھونٹ خاموشی سے پی رہی تھی۔ گھر کی بڑی اور بزرگ ہونے کے پتے وہ عارفہ بیگم کو کچھ تو نہیں کہتی تھی ہاں احتجاجاً گھنٹے دو گھنٹے کی جو بیٹھک گھر والوں کے ساتھ ہوتی تھی جس میں وہ ایک اچھی بہو ہونے کے ناتے انہیں تھوڑی بہت کہنی دینے کی غرض سے شرکت کر لیتی تھی وہ احتجاجاً ضرور ختم کر دیتی تھی اس کی ساس عارفہ رحیم اور نند حسینہ بیگم جہالت کی وہ منہ بولتی تصویریں تھیں کہ شیطان بھی پناہ مانگتا نظر آتا تھا۔

ہر آنے جانے والوں اور ملنے جلنے والوں سے وہ دونوں اس کی برائیاں کرتی تھیں ہی لیکن اس سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ جب گھر کے بلیکبیرڈوں سے فارغ ہو کر گھنٹہ دو گھنٹہ ان کی کپنی میں کپ شپ لگانے کی غرض سے آ پٹھتی تو دونوں نند اور ساس باری باری شروع ہو جاتیں جہیز و مال دولت کا موضوع چھیڑ کر تو بھی حسینہ و جمیل حور پری لڑکی کا ذکر جو ان کے بھائی بیٹے سے شادی کے لیے مری جا رہی تھی تب زارا کے لیے دو منٹ بھی وہاں مزید بیٹھنا دو بھر ہو جاتا لیکن وہ پھر بھی بڑی ہمت اور صبر کے ساتھ بیٹھتی ان کی گھنگو کا موضوع بدلنے کی کوشش میں لگ جاتی اور پھر گھنٹے آدھ گھنٹے کی کوشش کے بعد وہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتی لیکن اب حد ہو گئی تھی اٹھتے بیٹھتے آتے جاتے کھاتے پیتے جہاں اس کا سامنا

ہوتا ماں بیٹی کی لعن طعن شروع ہو جاتی کچھ نہیں تو اپنے پاس بٹھا کر پلاننگ کے تحت دونوں ماں بیٹیاں شروع ہو جاتیں۔

"ای آپ کو یاد ہے سسلی آنٹی نے جو بھینا کارشہ دیکھا تھا کتنی بڑھی لکھی اور حسین لڑکی تھی نا اور گھریاد ہے آپ کو ہزار گز کا۔ کوٹھی کیا تھی پورا محل لگ رہا تھا قیمتی نوادرات سے سجا محل اور لڑکی کیا تھی۔"

"ارے اسے چھوڑو! تمہیں وہ وکیل صاحب کی لڑکی یاد ہے کیا لڑکی تھی اور کیا دولت کی ریل جیل تھی ارے گی تو پیٹرول پمپ چل رہے تھے اس کے باپ کے اور کتنی منت سماجت کر رہے تھے وہ لوگ لیکن بس اپنی قسمت سے کون لڑ سکتا ہے۔"

"بس سالن کا چولہا ہلکا کر دوں؟" عارفہ رحیم منہ پھیر کر کہتی ہیں تو وہ سالن دیکھنے کے بہانے وہاں سے اٹھ جاتی۔ ان کے منہ جو نہیں لگنا چاہتی تھی اور پھر لگ کر بھی کیا کرتی ادھر وہ کچھ کہتی ادھر وہ دونوں عورتیں مل کر ذرا سی بات کو رانی کا پہاڑ بنا کر اس کے میاں کے کان بھرنا شروع کر دیتیں اور پھر خواہ مخواہ ہی ایک ہنگامہ اور فساد کی فضا پیدا ہو جاتی اس لیے بہتر یہی تھا کہ وہ خاموشی سے خون کے گھونٹ پیتی رہے اور کم سے کم ان کی جاہلانہ کپنی میں اٹھنے بیٹھنے سے پرہیز کرے لیکن آج تو حد ہو گئی تھی۔

زارا ہنسن میں جانے کے لیے کور بیڈور سے گزر رہی تھی کہ عارفہ رحیم اپنی خالہ زاد بہن نبیلہ کے ساتھ مل کر منہ بھر کر اسے خوب برا بھلا کہ رہی تھیں۔ تب ہی اس کے قدم جہاں تھے وہاں رک گئے۔

"ارے تمہیں کیا پتہ نبیلہ! دیکھنے کو معصوم ہے اندر سے کئی کائیاں اور بھری ہوئی ہے ارے خیال ہے جو غلطی سے بھی کبھی ساس نندوں کے پاس بیٹھ جائے، غریب تو دیکھو مہارانی صاحبہ کے کل کی چھو کرئی ایسے اگرتی پھرتی ہے جیسے اپنے ساتھ لاکھوں کا جہیز لائی ہو۔" لے دے کہ عارفہ رحیم کی ٹانگ پھر جہیز پر

آ کے ٹوٹی۔

"ارے دو دو بھائی ڈاکٹر انجینیر ہیں باپ بزنس مین ہے اور جہیز دیکھو بھیک منگولوں والا کل کی چھو کرئی اور اگرتو دیکھو شرم تو ذرا آتی نہیں ہے۔"

"اُف میرے خدا! اتنی بے عزتی اتنی انسٹل اب بہت ہو گیا اب یہ سب کچھ برداشت سے باہر ہوتا جا رہا ہے آج تو وہ ان کو آئینہ دکھا کر رہے گی اب چاہے اس کا گھر بے یا اجڑے۔"

"آتی ہے بہت شرم آتی ہے مجھے آپ جیسی عورتوں کی سوچوں پر، حرکتوں پر آپ جیسی عورتوں کی بے حسی اور سفاکی پر بہت شرم آتی ہے مجھے عارفہ بیگم! آپ جیسی عورتوں کو ایک مسلمان قوم کا فرد کہتے ہوئے جو کہنے کو تو خود کو مسلمان قوم کا فرد کہتے ہیں لیکن فعل اور عمل کانروں اور جاہلوں سے بھی بدتر ہیں شرم آتی ہے مجھے آپ جیسے لوگوں کو انسان کہتے ہوئے جو انسانیت کے نام پر بدنما دھبہ ہیں۔ شرم آتی مجھے اپنے آپ پر جو ایک مسلمان ہونے کے ناتے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سنت کی پیروی کرنے کے بجائے جنہوں نے اپنی لاڈلی بیٹی کو جہیز میں صرف ایک لوٹا جائے نماز اور چٹائی دی تھی اور میں ان کی سنت اور احکام کے خلاف بیڈروم سیٹ اور ٹی وی بوڑھ لائی۔ شرم آتی ہے مجھے اپنے آپ پر مسلمان کہتے ہوئے جس نے اللہ اور نبی کے احکام بھلا کر دنیا کے خوف اور دکھاوے کے لیے عمل کیا۔ شرم آتی ہے مجھے اپنے آپ پر آپ لوگوں کی سوچ پر.....!!" زارا وقار ردی ہوئی وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور عارفہ بیگم اپنی کزن نبیلہ کے سامنے شرم سے نگاہیں جھکائے اپنے کیے پر شرمندہ بیٹھی تھیں۔ اس کل کی چھو کرئی نے ان کو ان کی اوقات جو یاد دلادی تھی۔

☆.....

ایسا کیا تھا ان دانوں میں جو انہیں دھکا رو دیا گیا تھا؟  
وہ سمجھ نہ سکی۔

☆.....☆

وہ بچپن سے ذہین تھا۔ بے تحاشا ذہین، جس عمر  
میں بچے انگ کر بولنا سیکھ رہے ہوتے ہیں اس عمر  
میں وہ روانی سے انگش نظمیں یاد کر کے سنا تا۔

Twinkle Twinkle Little Star اور

دانوں کو چھتے کے بجائے ساری کی ساری چڑیاں  
آسمانوں کی طرف برداز کر گئیں۔ یوں جیسے مٹی بھر  
باجرے کے دانے سلگتی ہوئی چنگاریاں ہوں۔ صبح  
سے شام ہو گئی لیکن کوئی برعدہ ان دانوں کو کھانے  
نہیں اتر اتری کہ کوئی چوٹی بھی انہیں نہیں لے کر گئی۔  
باجرے کے وہ چند دانے گھاس میں پڑے رہ گئے۔  
ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کو کھانے کا حکم نہیں دیا گیا

ایقان علی

افسانہ

## بہار

غصہ نے مٹی بھر باجرے کے دانے چڑیوں کے  
غول کی طرف اچھال دیے جو لان کی لمبی لمبی گھاس  
میں چھپے تھے منے کیڑے بکوڑے کھا رہی تھیں لیکن  
اسے حیرت کا جھٹکا لگا جب اس کے پھینکے ہوئے



Copie



**Humpty Dumpty** سے ازبر تھیں۔ اماں حیران ہوئیں اور سوچیں پڑھ پڑھ کر اسے دم کرتیں۔ نظر اتار تیں ہر ہفتے گلے میں سورۃ الناس کا تعویذ ڈالتیں۔ ایک ہی تو بچہ تھا وہ بھی شادی کے آٹھ سال بعد ہونے والا دل و جان سے پیارا تھا۔ ابا البتہ فخر کرتے تھے۔ ایسا ذہین و فطین بچہ جو ملا تھا انہیں جہاں جانتے کاندھے پر سوار وہ ساتھ ہوتا۔ پڑ پڑ باتیں کرتا، ہرگز زبان بند رک رک کر دیکھتا تھا۔

”ارے سلیم صاحب یہ آپ کا بیٹا ہے؟ ماشاء اللہ کیسا پیارا بچہ ہے۔“

”ارے دیکھو، ہاں وہی بچہ وہ جو کاندھے پر سوار ہے۔ کیسی صاف زبان ہے۔“

”اوائے ہوئے آج باپا کے ساتھ زین آیا ہے۔ چلو اٹکل کو لظم سناؤ۔“ ابا فخر سے چلتے، فخر سے سب سنتے، شکر کرتے ایویں کہتے ہیں اولاد فقہ ہے۔ ایسی پیاری اولاد کیسے فقہ ہو سکتی ہے۔ پھر وہ اسکول میں داخل ہو گیا۔

وہاں بھی یہی حال رہا۔ ننھا منا سا زین سلیم ساروں کی آنکھوں کا تارا رفتہ رفتہ پورا اسکول سے جان گیا۔ ہر کوئی اس کا خیال رکھنا فرض سمجھتا کوئی پاس سے گزرا چاکلیٹ تھما دی۔ لظم سنی اور ثانی کھلا دی۔ بریک میں اپنے ساتھ پراٹھا کھلایا۔ کیسا پیارا ہے ناں؟ کیسی پیاری باتیں کرتا ہے۔

اور زین میاں کو ساروں کے نام ازبر تھے۔

نئی آنکھوں والی زویا، موٹا سا اسد، لمبی سی 5th کی ماریہ، دانش، ظہیر، ہینک والا علی اور زویا، اسد ظہیر وغیرہ خوش رہتے کہ زین کو وہ یاد ہیں۔

پڑھائی میں تو میں نے پہلے عرض کی کہ وہ بے مثال تھا، کوئی ہم سری کرنے والا نہیں تھا اس کی، ہر سوال کا جواب موجود تھا۔ بچے رو رو کر سو تک کتنی یاد کرتے اور زین کو ہزار لاکھ تک کی باتیں معلوم تھیں۔ اردو کا سبق بغیر اگلے فر فر پڑھ لیتا، باقی بچے وہی سبق چار سو اٹھتر غلطیوں کے ساتھ تین دن میں

پڑھتے۔ مانو کوئی کمپیوٹر فٹ تھا داغ میں۔ بلک بلک نکل، سوال از کیا اور کلک کرتے ہی جواب حاضر۔ ایسا بچہ پیارا کیوں نہ ہوتا سب کو، سو پیارا تھا سب کو۔ تین سال میں پانچ جماعتیں پاس کر ڈالیں۔ پانچویں کے امتحان میں پورے صوبے میں اول رہا۔ وظیفہ ملا، مبارک بادیں ملیں اور ہر طرف ڈاؤ واہ..... ہو گئی۔

ابا کا سینہ پھیلا چلا گیا۔ فخر سے، خوشی سے، اماں کی پھونکیں بھی بڑھ گئیں۔ ماشاء اللہ آٹھ سال کا تھا اور بغیر اگلے فر فر انگلش میں بات کرتا تھا۔ خاندان میں کوئی شادی بیاہ کی تقریب ہوتی تو وہ خاص طور پر مدعو کیا جاتا تھا۔ زین زین کی ہر طرف۔

آٹھویں جماعت میں ایک بار پھر معزز کی پورے ملک میں چوتھی پوزیشن پر آیا تھا۔ وزیر اعظم صاحب نے خود اپنے ہاتھوں سے شیلڈ دی تھی۔ اماں، ابا شکر کرتے نہ سمجھتے تھے۔ آٹھ سال کے صبر پر کیسا اچھا انعام ملا تھا ناں۔

☆.....☆

ابا اور اماں کی شادی میں شرکت کی غرض سے اسلام آباد گئے تھے۔ وہ امتحانوں کی وجہ سے گھر پر تھا۔ اسکول سے واپس آیا تو بازی پلٹ چکی تھی۔ اماں ابا کے خون میں تیر لاشے، وہ رو بھی نہ سکا۔ صدمے کے مارے برف کی بسل کی بات دہرا گیا۔ خٹھنڈا..... بغیر کسی احساس کے۔

قسمت تھی، قسمت سے کون لڑتا؟ جیسا بھی ذہین و فطین ہو۔ نہیں لڑ سکتا۔ وہ بھی نالڑ سکا۔ در نہ بچا لیتا اپنی اماں کو ابا کو۔

وہ اکیلا تو رہ گیا تھا مگر.....

”میں ابا کی طرح ہوں تمہارے لیے زین۔ فکر مت کرو۔“

”مجھ سے کہنا، جو بھی چاہتے ہو۔“

ماموں، چاچو، خالائیں سب موجود تھے۔ پھر اکیلا

کیسے؟ آنکھ کا تارا تو وہ پہلے بھی تھا۔ اب پھیلی کے چھالے کی مانند تھا۔ چاچو تاپا اپنے بچوں کے لیے بند میں کچھ لاتے پہلے زین کے لیے آتا۔ ثانی اماں پہلے کھانا اسے دیتیں، چاچیاں اس کے بستے کا پیاں پہلے سے موجود رکھتیں، کپڑے جوتے، غرض کوئی کمی نہ تھی۔

قدرت نے اسے چھپر بھاڑ کر دیا تھا۔ رفتہ رفتہ بھولتا گیا وہ اور زخم جتنے مرضی گہرے ہوں، مندرل ہو ہی جاتے ہیں۔ گھاڑ بھر ہی جاتے ہیں۔

میٹرک میں ٹاپ کر لیا زین سلیم نے، پورے ملک میں سب سے اوپر تھا زین سلیم۔ سلیم رضا کا اکلوتا اور ذہین و فطین بیٹا، انعامات ملے، تحائف و ملائف صدر صاحب نے اپنی جانب سے دس لاکھ کا چیک دیا۔ ایک اور بازی جیت لی تھی اس نے۔

☆.....☆

وہ بے تحاشا ذہین ہے۔

یہ اس کا فخر بن گیا اور پھر غرور۔

”ہاں میں ذہین ہوں۔ فخر ہوں۔“

وہ خود سے کہتا اور پھر زمین پر نہ نکلتے۔ ایسی قابلیت ہر کسی میں تھوڑی ہوتی ہے۔ کوئی کوئی ہوتا ہے ایسا جیسا وہ تھا۔ زین سلیم۔

ایک بڑے کالج میں داخلہ مل گیا اسے، بادشاہوں کے سے ٹھاٹھ ہو گئے اس کے، ہاں وہ بادشاہ ہی تو تھا۔ سب کر سکتا تھا اپنی عقل کے بل بوتے پر، ون کورٹ بھی ہاں ہاں بڑا ذہین تھا وہ۔

ایک خوبی فخر بن گئی تھی اور اب غرور۔

وہ ایسا پرندہ تھا جو آسمان کی پرواز پر نکلتا ہے تو اسے دیکھنے کے لیے سر کو بہت اونچا اٹھانا پڑتا ہے، ایسا ہی پرندہ تھا وہ جسے بخوبی احساس تھا کہ ”پر“

صرف اسے دیے گئے ہیں اور وہ بہت اونچا ”از“ نکلتا ہے سو وہ اڑ رہا تھا بہت اونچا۔

☆.....☆

اس کے کالج میں ریاضی کے نئے استاد آئے تھے۔

”سر عمران علی۔“

وہ بہت نفیس سے تھے۔ شائستہ سے، دھیماسا بولنے والے، ساری کلاس کے فہورٹ تھے اور پھر رفتہ رفتہ پورے کالج کے فہورٹ بن گئے تھے۔

”سر عمران کو دیکھا کہیں؟“

یہ چائے..... سر عمران کے لیے۔

”سرا چھ لگ رہے ہیں۔“

ہر طرف ”سر عمران، سر عمران“ ہو گئی۔

اور زین سلیم؟ وہ زبانوں سے اترنے لگا۔

اور زین سلیم جس نے آج تک صرف اپنے ارد گرد طواف دیکھے تھے۔ اپنی پوجا کروائی تھی۔ زبانوں سے ”زین..... زین..... کی پکاریں سنی تھیں، وہ زین سلیم ششدر رہ گیا۔

”ایسے کیسے سر عمران نے اس کی جگہ لے لی؟“

وہ حیرت سے سوچتا، پھر غصہ آنے لگتا بے تحاشا غصہ۔

”میں اتنا ذہین اور وہ.....“

پاگل سمجھ نہ سکا کہ استاد اور شاگرد میں کیا مقابلہ؟ اور پھر وہ دل ہی دل میں ان سے بے تحاشا

نفرت کرنے لگا۔ کلاس میں، باہر یا کہیں بھی وہ نظر آجاتے تو وہ غصے سے گھورتا نظر انداز کرنے کی اواکاری کرتا، کالج میں ان کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی تھی۔ وہ ہر دلہیز بن چکے تھے۔

اور پھر اس سال کالج کے بہترین استاد کی ٹرائی بھی انہی کا مقدر بن گئی۔ بہترین طالب علم آج بھی وہی تھا لیکن اسے کوئی خوشی نہ ہوئی اپنی ٹرائی لے کر، اسے غصہ آیا سر عمران کی ٹرائی دیکھ کر۔

انہیں نچا دکھانے کی وہ سازشیں بننے لگا، انہیں غلط ثابت کرنے کی، انہیں بے عزت کرنے کی۔

”اوز اس دن..... وہ ریاضی کی کلاس لے رہے

تظاریں۔ ہاتھ باندھے کھڑے ملازموں کی تظاریں، عزت..... شہرت اور بے تحاشا پیسہ۔ وہ قابل رشک انسان تھا۔ دنیا کی ہر آسائش اس کے قدموں میں تھی۔ گھر، گاڑی، فیکٹریاں، بیوی دو بچے اور کیا پاپے تھا عزت..... شہرت..... پیسہ..... وہ بہت بلندی پر تھا، بہت اونچا۔

☆.....☆

”یہ لونڈیراں! دس ہزار روپے ہیں، خیریت سے شادی گزر جائے تمہاری بیٹی کی اور یہ سیٹ ہے یہ رکھ لو۔“

خفسہ نے دونوں چیزیں ملازمہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ وہ ممنون ہوئی۔

”خدا سلامت رکھے بی بی! آپ کو اور صاحب کو اور زیادہ خوشیاں دے۔“ وہ دعائیں دیتی رہی۔ رات میں ملازمہ نذیراں جب کام سے فارغ ہو کر گھر جا رہی تھی تو اس کی بیٹی اس کے ساتھ تھی۔ کوٹھی سے کافی دور آنے کے بعد نذیراں نے بغل میں دبا ڈبہ کھولا اور اس میں سے ہار بندے نکال کر کھلے گٹر میں بہا دیے۔ اس کی بیٹی چلائی۔

”اماں پاگل ہے کیا؟ کیا کر رہی ہے؟“ لیکن نذیراں اب نوٹوں کی گندی بھی گٹر میں اچھال چکی تھی۔

”اماں تو پاگل ہو گئی ہے؟“

”بکواس نہ کر! نذیراں غرائی۔“

”حرام کی کمائی کا یہ زیور اور پیسہ، میں کیسے اپنی حلال کی کمائی سے پالی ہوتی بیٹی کو پہنا دوں۔ ساری زندگی تنکا تنکا حلال رزق جوڑا اور اپنے بچوں کی پرورش کی میں نے، اب کیوں حرام کھلاؤں؟“

”لیکن اماں حرام کیسے؟“ اس کی بیٹی حیران ہوئی۔

”مجھے معلوم ہے سب، حرام ہے سب حرام ہے جتنی تو خدا کی ہر مخلوق اسے کھانے سے گریزاں ہے

عمران اکڑائے صدر صاحب سے چیک اور شیڈ وصول کر رہا تھا۔ عروج پر تھا وہ اور زیادہ اونچائی پر جانے کی خواہش تھی اسے۔ کوئی ہر نہیں سکتا تھا اسے۔

وہ بھٹے بعد انجینئر بننے کے لیے وہ امریکا جا رہا تھا۔

اور سر عمران کے گھر میں ماتم تھا۔ رات میں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ وہ بچ نہ سکے تھے جنازہ تیار تھا۔

☆.....☆

خفسہ کمرے میں آئی تو وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

6 سال بعد بھی وہ ویسا ہی شاندار تھا۔ گزرتے ماہ رسالے نے اس کی وجاہت کو اور بڑھا دیا تھا۔

چھ سال پہلے جب وہ امریکا سے انجینئر بن کر لوٹا تھا تو ایسا ہی شاندار تھا۔ اس کا ہر قدم جیسے دل پر پڑتا تھا۔ وہ جدھر سے گزرتا تھا۔ لوگ گردنیں موڑ موڑ کر اسے دیکھتے تھے ایسا قد کاٹھ، ایسا وجہہ انسان ہر کوئی تھوڑی ہوتا ہے وہ ایک ہی تھا زین سلیم، زین کی ممانی نے جب خفسہ کا رشتہ مانگا تو اس نے فٹ پاں کر دی تھی۔ تصویر میں اسے دیکھتے ہی قہقہے لگتی تھیں اور بڑی روشن آنکھیں جیسے اندر تک اتر جاتی تھیں اور سارا حال جان لیتی تھیں۔ مضبوط جسم اور دلکش مسکراہٹ۔

شادی کے پہلے دن سے ہی اسے محبت ہو گئی تھی۔ زین سلیم سے جو سب سے زیادہ ذہین اور دلچسپ تھا۔

اور 6 سالوں میں اس نے ترقی بھی تو کی تھی۔ ایک انجینئر کی حیثیت سے جانب کرتا کرتا پچھلے چھ سالوں میں وہ ایک فرم کا مالک بن چکا تھا۔ چار سو روپے کا کلیٹ 4 کنال کے وسیع بنگلے سے 8 کنال کی کوٹھی میں بدل گئی تھی۔ گاڑیوں کی

Board کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

چار منٹ میں سوال حل تھا۔ سر عمران کا 14 سالہ تجربہ صرف 4 منٹ میں ذہانت نے ختم کر ڈالا تھا۔

”بہت عمدہ زین بہت اعلیٰ۔“ انہوں نے اسے تھکی دی اور زین کی دیوتا کی مانند ہو گیا۔

”میں فاج ہوں سر؟“

”ہاں تم ہو۔“ وہ مسکرائے۔

”آپ کو میری بات ماننا ہوگی۔“ عجیب آواز تھی اس کی۔

”ہاں بولو۔“

اور اس کی بات سن کر ساری کلاس کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

☆.....☆

دو سال بیت گئے۔ 16 سالہ زین سلیم نے F.Sc میں بھی اپنی پوزیشن برقرار رکھی۔ پورے ملک میں ٹاپ، وہ ناقابل تسخیر ہو گیا تھا۔ اپنی ذہانت کے پردوں سے اڑتا وہ آسمان کی ان بلندیوں پر پہنچ چکا تھا جہاں کسی اور پرندے کے آنے کی ہمت نہیں تھی۔

چاچی، تاپا، خالائیں اپنے بچوں کو اس کی مثالیں دیتے، بھلا کوئی تھا اس کے جیسا کوئی بھی نہیں تھا۔ کالج میں جس جس طالب علم نے اس کے ٹاپ کا سنا تو حیران رہ گیا۔

”کیا اس سب کے بعد بھی جو اس نے سر عمران کے ساتھ کیا اسے اتنی زیادہ عزت مل گئی؟“

”ٹاپ کیسے کر لیا اس نے یار؟ دیکھا نہیں سر عمران کیسے رو رہے تھے اس دن؟“

”ذہین بھی تو بہت ہے، سر عمران کو کیسا ہرایا تھا۔“

”تو کیا اللہ تعالیٰ ذہین لوگوں کو سزا نہیں دیتا؟ جو اس نے کیا اس کے بعد تو عذاب آتا تھا۔“

اور ان سب سے بے نیاز زین سلیم غرور سے

تھے۔ ”ایکسر سائز (مشق) نمبر 5.3 کا سوال نمبر 4، یہ حل نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی عبارت غلط دی گئی ہے، اسے حل نہیں کیا جا سکتا۔ اگلے سوال پر چلتے ہیں۔“

سر اگلا سوال پڑھنے لگے اور وہ اپنے دماغ میں جمع تفریق کرنے لگا، سوال حل ہو سکتا تھا، اس کا دماغ اسے نئی راہ دکھانے لگا۔

”ایلیکسیوزی سر!“ وہ اپنی سیٹ پر کھڑا ہوا۔

”جی۔“ سر عمران بولے۔

”میں آپ کے ساتھ شرط لگانا چاہتا ہوں۔“

”کیسی شرط؟“ سر کے ساتھ ساتھ ساری کلاس اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”میں یہ سوال حل کر سکتا ہوں جو آپ کے مطابق حل نہیں ہو سکتا۔“

سر عمران مسکرائے۔

”میں 14 سالوں سے پڑھا رہا ہوں ڈیڑھ! آپ جیسے کئی ذہین اسٹوڈنٹس اور استاد اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کر چکے ہیں لیکن یہ حل نہیں ہو سکا کیوں کہ یہ عبارت غلط ہے۔“

وہ بھی ہنسا۔ ”یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ میں اسے حل کر سکتا ہوں؟ Let's bat (ایک شرط ہو جائے؟)“

اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں سر عمران بھی مسکرائے، وہ اپنی ذہانت پر پرامید تھا اور وہ اپنے 14 سالہ تجربے پر۔

”جیتنے والا ہارنے والے سے کچھ بھی کر داسکتا ہے۔“ سر عمران نے کہا تو وہ راضی ہو گیا۔ یہی وہ چاہتا تھا۔

اب استاد کو کیا پتا کہ شاگرد کیا چاہتا ہے۔ وہ تو اس کی حوصلہ افزائی کے لیے صحت مند مقابلہ کروانا چاہ رہے تھے۔ وہ اپنی سیٹ سے اٹھا اور White

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## پہلے پاکستان سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ٹیبل :-

- ✧ ہرائی بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ دیب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہرائی بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم کوالٹی، نارل کوالٹی، کمپریڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرف نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

• واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں، ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں [www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)

Copied From Web

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN

خصوصی نے اس چھتری سائز کے کیک پر چھری چلا دی۔ ہر طرف قہقہے بھر گئے۔

”نیا سال مبارک ہو زین سلیم صاحب!“

مہمان خصوصی کو گلدستہ پیش کیا گیا اور مبارک دی گئی۔ وہ سکرانے 52 سالہ زین سلیم کی سکرانٹ پر سارا جہان سکرادیا۔ وہ مائیک پر آئے اور بات کرنے لگے۔ سب لوگ عزت سے کھڑے ہوئے اور سر جھکا کر سننے لگے۔ تھا کوئی انسان اس جیسا کامیاب؟ اس جیسا عزت دار؟ سات زمینوں میں نہیں تھا سات آسمانوں میں نہیں تھا اور کوئی تھا اس جیسا بد نصیب انسان؟ سات زمینوں میں نہیں تھا

سات آسمانوں میں نہیں تھا۔ دنیا اور دنیا کی حرام آسائشوں سے نوازے گئے اس خوش قسمت انسان جیسا کوئی سیاہ بخت بھی نہیں تھا۔ کوئی ایک بھی نہیں۔

ہادلوں کی تہوں میں بھی نہیں اور پانٹال کی گہرائیوں میں بھی نہیں۔ آخرت کے خزانوں سے ٹھکرا دیے گئے اس مردود کو اندازہ تک نہیں تھا کہ وہ کیا ہو چکا ہے۔ بے شمار عزمیں شہر میں پالینے والے اس انسان کے دل پر نقل ڈال دیئے گئے تھے۔ ویسے ہی عقل

جیسے اس جیسے مردود محلون انسان کے لیے جنتوں کے دروازوں پر ہیں دنیا کو پا کر خوش ہو جانے اس بد قسمت انسان سا تھا کوئی مفلس؟ جس کے لیے توبہ کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے جس کے رزق کے ہر دانے پر حرام کی مہر تھی اور جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ اس جیسا کوئی بے مراد جس نے انبیاء جیسے مقدس پیشے والے استاد کا دل دکھایا تھا؟ تھا کوئی بے مراد اس جیسا جس سے اللہ ناراض تھا؟

☆.....☆

اور مجھے پتہ ہے یہاں ہے۔ بددعا کا اثر ہے۔“

”کس کی بددعا ماں؟“

نذیراں نے لمبی سانس بھری۔ دور جگمگاتی کوٹھی دکھائی دے رہی تھی۔

”صاحب کے استاد کی بددعا میں نئے سنا ہے صاحب نے اپنے کالج کے کسی استاد سے شرط لگائی تھی۔ وہ شرط ہار گئے صاحب نے اپنے استاد کے منہ پر تھپڑ مارا تھا سزا کے طور پر، چہ چہ کیسے سنگدل ہیں صاحب، اپنے استاد صاحب کو تھپڑ مار دیا۔ ان کے استاد سنا ہے حد سے مر گئے۔“ نذیراں دکھنی ہو گئی تھی۔

”ہائے ہائے ماں! پھر ہم کیوں ادھر کام کرتی ہیں جو خواہ ہمیں ملتی ہے وہ بھی حرام ہوئی ناں۔“

”قسم ہے مجھے اپنی اولاد کی اپنی محنت کی کمائی لیتی ہوں ان سے، تنخواہ سے اوپر جو بھی پیسہ کھانا ملتا ہے راستے میں ضائع کر دیتی ہوں حرام نہیں کھاتی میں، اللہ ہمیں بچائے رکھے، چل اب چل گھر۔“

”چہ چہ ماں! ایسی چہالت۔“

وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی چلنے لگیں اور دو روز زین سلیم کے 8 کنال کی کوٹھی کے لان میں جو کے مٹھی بھر دانے ویسے کے ویسے پڑے تھے۔ انہیں کھانے کا حکم نہیں تھا۔ رزق حلال کھانے والے ہر ذی روح کو ان کا کھانا حرام ٹھہرا تھا۔ ان مٹھی بھر دانوں سے غرور کی بو آتی تھی۔

☆.....☆

26 سال بعد.....!

آج سال کی آخری شام تھی۔ بارہ بجتے میں چند منٹ باقی تھے۔ ہر کوئی نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے لیے پر جوش تھا۔ کاروباری حلقوں کی جانب سے منعقد کردہ اس رات کا مقصد نئے سال کا جشن منانا تھا۔ بارہ بج گئے مبارک بادیں دی جانے لگیں۔ آتش بازی سے آسمان سج گیا اور مہمان

ردا ڈائجسٹ 110 جنوری 2015ء

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

## وفا کیسی کہا کا عرصہ

اس کے ہاتھوں میں جو کچھ آ رہا تھا، وہ اسے زمین پر پھینکتی جا رہی تھی۔ درد تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا، اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ ابھی مر جائے گی، ابھی اس کا جسم ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔ ہر طرف کالج بکھرے پڑے تھے۔ وہ بھی تو اندر سے آہستہ آہستہ ایسے ہی بکھر رہی تھی، ایسے ہی ٹوٹ رہی تھی اس کا اپنی



ذات پر مان یقین ایسے ہی تو بکھرا تھا اور اسے اس کی کرسیاں اپنے سارے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اس کا اندر بولہ بان ہو رہا تھا۔

تو گرد یواروں سے چکے وحشت بھری نظروں سے اپنے مالک کی اکلوتی بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔ سچ سچ کر اس کے گلے میں درد ہو رہا تھا لیکن اندر کا درد ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ بھی سزا براہیم حواس باختہ سی لاؤنج میں داخل ہوئیں اور اسے ایسے دیکھ کر مزید پریشان ہو کر اس کی طرف بڑھیں، حالانکہ راستے میں بکھرے کئی کالج ان کے پاؤں میں چبھے تھے۔ آخر ماں تھیں اپنا درد بھلا کر بیٹی کو گلے لگالیا۔

”کیا ہوا بیٹا.....! چھو تو ٹھیک تو ہے؟“

”وہ ماما..... وہ ماما.....!“ اتنا کہتے ہی وہ ان کے بازوؤں میں ڈھے گئی۔

☆.....☆

”کیسی ہیں آپ حیا؟“ وہ ہاتھوں میں خوبصورت بٹے لیے مسکرا کر ہمیشہ کی طرح محبت سے بولا تو حیا نے رخ پھیر لیا۔

وہ مسکراتے ہوئے اتنا خوبصورت لگتا تھا کہ ہمیشہ حیا سے مسکراتا دیکھ کر رخ موڑ لیتی کہ کہیں اسے نظر ہی نہ لگ جائے۔ اس کے کوئی جواب نہ دینے پر سوز ابراہیم محبت سے بولیں۔

”اب پہلے سے بہتر ہے۔ تم بیٹھو اس سے باتیں کرو میں آئی ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولیں اور باہر نکل گئیں تو وہ پریشان سے لہجے میں بولا۔

”دیکھو حیا! کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں انگریز باہر نہ نکالا جائے تو وہ ناسور بن کر انسان کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیتے ہیں، اسے انسان سے حیوان بنا دیتے ہیں۔ تم مجھے اپنا شوہر سمجھ کر نہ سبھی چلو دست مان کر اپنا دکھ درد مجھ سے شیئر کر دینا وعدہ کرتا ہوں میں تمہارا شوہر بن کر نہیں تمہارا دوست بن کر سنوں گا۔“

اس کے انداز میں اس قدر محبت اور اچنائیت تھی کہ حیا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا ہر درد اسے بتاتی چلی گئی۔

☆.....☆

”ہیلو! کیسی ہو تم دونوں؟“ وہ ہمیشہ کی طرح اچانک ہی آ کر بولا تھا، اسے دیکھ کر حیا کے دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔ وہ تھا بھی ایسا کہ لڑکیوں کے دل اسے دیکھ کر دھڑکنا بھول جاتے تھے، ان سب دیوانی لڑکیوں میں حیا کا شمار بھی ہوتا تھا۔ اب بھی وہ ایک دم نروس ہوئی تھی پھر سنبھل کر بولی۔

”ہم تو ٹھیک ہیں، آپ کیسے ہیں؟“

”ارے واہ، یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں کس قدر ہینڈسم ہوں مسکرا کر پوچھ رہی ہو کہ میں کیسا ہوں؟ حیرت ہے یار۔“

”منہ دھور کھو۔“ اس کی بات پر نامہ بگڑ کر بولی اور کانی کے کپ کو منہ لگالیا تو یوسف مصنوعی حیرت سے بولا۔

”ارے واہ یار! صبح کو ہی میں نے DOV سے منہ دھویا تھا۔ لڑکی کیا بات کر رہی ہو ویسے حیا ہے ہی خوبصورت ہاں تمہیں DOV کی ضرورت ہے سیر لیس یار۔“ اس کے خوبصورت کہنے پر مزید نروس ہوئی گئی، جبکہ نامہ اور یوسف اب بری طرح لڑ رہے تھے بھی حیا بات بدل کر جلدی سے بولی۔

”اچھا یوسف! یہ بتاؤ پیر کا کیا ہوا؟ قیل ہونے کا ارادہ تو نہیں ہے تمہارا؟“

”نہیں یار! بٹ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ تم ہر سال کی طرح اس سال بھی فرسٹ آؤ گی۔ نامہ کی طرح مت سیکنڈ آناو کے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اور پھر اس نے دن رات محنت کی۔ کھانا پینا بھول کر پڑھائی میں لگ گئی، رات دن کمرے میں بند رہ کر وہ پڑھائی کرنے لگی تھی۔ نامہ اور یوسف دونوں کزن تھے لیکن دونوں کی



بنتی بالکل بھی نہیں تھی، کیونکہ نامہ سنجیدہ مزاج تھی جب کے یوسف شریب۔ حیا کی نامہ بہت اچھی دوست تھی اس لیے بھی حیا بھی یوسف سے ملنے لگی اور پہلو ہائے میں حیا کے دل نے اسے ہائے ہائے کب کہا اسے خود پتہ نہیں چلا۔ رات رات بھر پڑھنے کے نتیجے میں بیچر کے ختم ہوتے ہی اسے زور دار بخار نے آن گھیرا تھا۔ اس لیے وہ دو دن کالج نہ جاسکی اس وقت وہ ٹیس پر کھڑی خابوش چاند کو غور سے دیکھ رہی تھی، جب اس کے موبائل پر پیپ ہونے لگی، یوسف کالنگ کے حرف چمک رہے تھے اس نے جلدی سے کال ریسیو کی تھی۔ دل ایک دم سوکھ اور پر اچھلا تھا۔ ایک ہی سانس میں کیے گئے اتنے سارے سوالوں پر وہ مسکرا کر رہ گئی۔

”بخار تھا مجھے۔“  
 ”دوائی لی تم نے، اب طبیعت کیسی ہے؟“  
 ”ہاں بابا میڈیسن لے لی ہیں اور اب ٹھیک ہوں۔“  
 ”اچھا کل آؤ گی کالج؟“ وہ بے قراری سے بولا۔  
 ”ہاں آؤں گی۔“ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس نے فون بند کر دیا اور دل سے مسکرا دی۔

☆.....☆

ابراہیم اور مصطفیٰ دو بھائی تھے۔ ابراہیم کی صرف ایک بیٹی حیا تھی جب کہ مصطفیٰ کا صرف ایک بیٹا شرجیل تھا۔ مصطفیٰ کی بیوی نادیہ شرجیل کی پیدائش پر ہی چل بسی تھی۔ اس کے کچھ عرصے بعد مصطفیٰ بھی چل بسے تھے تب سے ابراہیم نے شرجیل کو اپنے بیٹے کی طرح پالا تھا۔

”بیٹا! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ وہ جلدی جلدی ناشتہ کر رہی تھی ابراہیم لان میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ جب کہ شرجیل ان کے ساتھ بیٹھا کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھا، کیونکہ آج اتوار تھا اسی لیے وہ گھر پر تھے۔ سزا ابراہیم کے سنجیدگی

سے کہنے پر حیا نے سر ہلا کر کہا۔  
 ”جی ماما نہیں۔“

”اب تمہارے پیچھے ختم ہو گئے ہیں، تو میں اور تمہارے بابا چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی شرجیل سے کرویں۔ اپنے گھر کا بچہ ہے اور اس طرح تم ہم سے دور بھی نہیں ہوگی۔“

”پلیز ماما“ وہ دکھ سے بمشکل بولی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔  
 وہ ماں میں سمجھ گھٹیں اور بولیں۔

”کون ہے وہ لڑکا؟“ اور پھر اس نے انہیں یوسف کے بارے میں بتا دیا تو وہ پُرسوجھ ابراز میں بولیں۔

”دیکھ تم اسے ڈنر پر بلا لو۔“ اتنا کہتے ہی وہ ایک جگہ سے اٹھیں اور اپنے کمرے میں بند ہو گئیں۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے ناراض ہو کر نہیں ہیں پر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ اس سے زیادہ دیر تک ناراض نہیں رہ سکتیں۔

دوسرے دن وہ تک سب سے تیار ہوئی اور یوسف کو مہینج کر دیا کہ اسے کالج کے گراؤنڈ میں آکر ملے۔ وہ آگیا تو دونوں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر بیٹھے گئے۔ حیا شرمنا کر بولی۔ ”یوسف! وہ..... ماما نے آج آپ کو ڈنر پر بلایا ہے۔“

”کیوں؟“  
 ”وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں اس لیے۔“  
 ”لیکن مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں وہ؟“ اس کی حیرت کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ حیا تھوڑا جھجک کر بولی۔

”آپ کی اور میری شادی کے سلسلے میں۔“  
 ”میں اور تم سے کیوں شادی کرنے لگا حیا؟“  
 ”ہم دونوں محبت کرتے ہیں تو شادی بھی.....!“  
 ”کیا.....! یہ کیا بکواس ہے۔ کس نے کہا میں تم سے محبت کرتا ہوں؟ تم لڑکیاں بھی کس قدر بے وقوف

ہوتی ہو، کوئی تمہارا ذرا سا خیال کیا رکھ لے تم سے منس کر بات کیا کر لے، تم مجھتی ہو کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ پاگل بے وقوف لڑکی! ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ ہر کسی کو اس نظر سے دیکھنا چھوڑ دو کہ اگلا تمہاری محبت میں پور پور ڈوبا ہوا ہے۔ کیا میں نے کبھی تم سے کہا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، یا پھر شادی کرنا چاہتا ہوں؟“ وہ ساکت سی بیٹھی اسے سن رہی تھی، وہ اٹھا اور جاتے جاتے رک کر نفرت سے بولا۔

”ویسے حیا! ایک بات کہوں میں اگر تم سے محبت کرتا ہوتا تو تم سے کبھی شادی نہ کرتا۔ کیونکہ کمزور کردار کی لڑکی سے کوئی بھی محبت کرنا نہیں چاہے گا۔“  
 گھر آ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ سزا ابراہیم اس کی حالت دیکھ کر سمجھ گھٹیں اور پھر اس کی شادی شرجیل سے ہوگئی لیکن حیا نے کبھی اسے وہ مقام نہیں دیا جو کہ اس کا حق تھا ہمیشہ اگتور کیا تھا اس نے۔ اس کے چپ ہونے پر شرجیل کے کچھ کہنے سے پیسے ہی سزا ابراہیم اندر داخل ہوئیں۔

”شرجیل بیٹا! ڈاکٹر نے حیا کو ڈیپ چارج کر دیا ہے۔ آپ گاڑی نکالو ہم آتے ہیں۔“

”جی آئی!“ وہ ادب سے کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔  
 اس کے بعد حیا اس سے مزید کترانے لگی تھی جہاں اسے دیکھ لیتی اٹھ کر چلی جاتی۔ رات کو دیر سے سوتے میں آتی جب وہ اس کا انتظار کرتے کرتے سو جاتا ہوتا۔ اس وقت بھی وہ سویا ہوا تھا، جب وہ کمرے میں داخل ہوئی ادزبا لکونی میں چلی آئی۔ وہ سو جانے کی ایکٹنگ کر رہا تھا اس کے پیچھے آ کر بولا۔  
 ”یہ سب کیا ہے حیا! آخر ہم کب تک ہمسندہ کے روتے کی طرح رہیں گے۔“

”آپ مجھے طلاق دے دیں شرجیل میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔“ وہ اچانک اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

وہ لب بلبھیج کر اس کی کمر سہلاتے ہوئے محبت سے بولا۔ ”ایسا بھی سوچنا بھی مت حیا! تم تو میری زندگی ہو، میں بھلا تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں اور جہاں تک تمہارے کردار کی بات ہے تو وہ دور ہی ایسا ہوتا ہے، جب انسان ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ لیتا ہے، آنکھیں کسی کا خواب دیکھنے لگتی ہیں تم جیسی مضبوط کردار لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی اور حیا کل کو ہم اگر یاد کر کے رونے بیٹھ جائیں تو ہمارا آج بھی تو دکھ بھرا ہوگا اور آج ہم خوشی خوشی زندگی گزاریں تو کل جب ہم اپنا ماضی یاد کریں گے تو کچھ ملے ایسے بھی تو ہوں جنہیں ہم یاد کر کے مسکرائیں، کل کے لیے ہم اپنا آج کیوں خراب کریں یہ کہاں کی عقل مندی ہے۔ بولو؟“

”آپ صحیح کہہ رہے ہیں شرجیل! آئی ایم سوری میں نے آپ کو بہت تنگ کیا پر اب نہیں۔“ حیا نے پرسکون انداز میں کہا، جیسی نفا میں سزا ابراہیم کی آواز گونجی تو شرجیل اس کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلا کر بولا۔  
 ”چلو وعدہ کرو مجھ سے اس سال کو ہم دل سے گزاریں گے تاکہ کل ہم اسے یاد کریں تو ہمارے لبوں پر مسکراہٹ ہونا کہ آنکھوں میں آنسو۔“  
 ”وعدہ۔“ وہ پورے دل سے بولی۔

”پہلی سزا ابراہیم میری جان! ایسا سال مبارک ہو۔“  
 ”آپ کو بھی۔“ وہ دل سے مسکرا دی اور سوچنے لگی کہ شادی سے پہلے وفا کیسی کہاں کا عشق شادی کے بعد شوہر سے ہی وفا اور اسی سے عشق۔ یہ سال اس کے لیے ہزاروں خوشیاں لے کر آیا تھا نجانے کتنے عرصے بعد وہ دل سے خوش ہوئی تھی اور نئے سال کا چاند ان دونوں کی محبت کو حیرت سے دیکھ رہا تھا، کیونکہ اس سال وفا بھی چمکی تھی اور عشق بھی پاک تھا۔

☆.....☆



## وہ اور اجنبی میرا

”اٹھ بھی جاؤ صابرو! کب سے اٹھا رہی ہوں لیکن تمہاری تو نیند ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔“ فریدہ نے تقریباً جھنجھلا کر اس کے اوپر سے کبل کھینچ کر اتارا تھا۔ جب کہ وہ اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔

”کیا ہو گیا ہے فریدہ بی بی! کیوں میری نیند کی دشمن بنی رہتی ہو۔“

”لو کر لو گل اور سن لو بات۔ میں تمہاری دشمن ہوں ارے کب سے میں تمہیں اٹھا رہی ہوں کہ کہیں تم دیدار یار سے محروم نہ رہ جاؤ مگر میں تو تمہاری دشمن ہوں۔ تا تو پھر سوئی رہو میں کیا کروں۔“

”کیا..... کیا مطلب ہے تیرا فریدہ؟“

”چھوٹی مای آئی ہوئی ہیں ساتھ میں وہ صاحب بھی۔“

”کیا! احمد آیا ہے اور تم مجھے اب بتا رہی ہو، ہٹو ڈفر۔“

وہ اسے تقریباً دھکیلاتی ہوئی داش روم میں کھس گئی اور اگلے پانچ منٹ میں وہ مای کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی جب کہ نظروں نے تو احمد سے ہٹنے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ بظاہر مای سے کہہ رہی تھی جب کہ وہ بھی جانتا تھا کہ یہ شکوہ صرف اس کے لیے تھا تو بس مسکرا کر رہ گیا۔

”مای! آپ بھی ناکتے دنوں کے بعد آئی ہیں آج سے تقریباً ایک مہینہ اور پندرہ دن پہلے آپ کراچی سے آئی تھیں اس کے بعد آج آ رہی ہیں۔“

محبت بھی ناکبھی کس قدر چبتاتی ہے تو کبھی عمر بھر کے لیے رونا چھوڑ دیتی ہے اور آپ کے پاس کٹری آپ کا مذاق اڑاتی ہے لیکن محبت تو محبت ہے نا بغیر کسی صلے کے بغیر کسی چاہ کے کی جانے والی محبت ہمیشہ کامیاب ہوتی ہے اور جس محبت میں صلے کی طلب ہو وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہوتی لیکن میں نے تو کبھی بھی کسی صلے کی طلب نہیں رکھی تو پھر مجھے میری محبت کیوں نہیں ملی آخر کیوں میں نامراد رہی؟

صابرو نے اسے ہاتھوں پر لگی مہندی کو دیکھتے ہوئے سوچا اور کئی آنسو آنکھوں سے بہتے چلے گئے۔ جن پر اس کا بالکل اختیار نہیں تھا۔ پاس بیٹھی بیٹیشن نے نری سے اسے ڈانٹ دیا تھا۔

”پلیز مضبوط بنیں صابرو! شادی تو سب لڑکیوں کی ہوتی ہے ایک آپ کی تھوڑی ہو رہی ہے۔ ہر لڑکی کو گھر سے دوا کرنا تو ہونا ہوتا ہے نا، دیکھیں پلیز مت روئیں۔“

”ہاں سچ کہا شادی سب کی ہوتی ہے گھر سے جدا بھی ہر لڑکی ہوتی ہے لیکن میں گھر سے جدا ضرور ہو رہی ہوں مگر یہ شادی مجھے ایسی لگ رہی ہے جیسے میں مر گئی ہوں اور سب مجھے دفنانے کی تیاریاں کر رہے ہیں یہ شادی کا سوٹ میرے لیے کفن سے کم نہیں ہے تم کیا جانو بہت مشکل ہوتا ہے دل میں کسی اور کو لیے کسی اور کی سچ پر جانا۔“ وہ صرف سوچ کر رہ گئی جب کہ بیٹیشن پھر سے اس کا میک اپ کرنے میں مصروف ہو گئی اور اس کے سامنے اس کا ماضی کسی قلم کی طرح گھومنے لگا۔



## ایجنٹ حضرات متوجہ ہوں

السلام علیکم!

صوبہ پنجاب کے ایجنٹ حضرات متوجہ ہوں۔ ادارہ ماہنامہ ”ردا ڈائجسٹ“ نے ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نیوز ایجنٹ حاجی محمد یاسین طاہر کو صوبہ پنجاب بالخصوص فیصل آباد و گردونواح کے شہروں میں ماہنامہ ”ردا ڈائجسٹ“ کی ترسیل (سپلائی کے لیے) سول ڈسٹری بیوٹرز نامزد کیا ہے۔

ان شہروں کے ایجنٹ حضرات محمد یاسین طاہر سے اس موبائل نمبر 0321-7531597 پر رابطہ کریں۔  
چیف ایڈیٹر صالحہ محمود

ہو کہ ابوکس قدر سخت ہیں اگر میں نے اپنے گھر میں یہ بات بھی کی تو وہ میرے گلے گلے کر دیں گے۔“  
”جب تم جانتے تھے کہ تمہارے ابو نہیں مائیں گے تو تم نے کیوں مجھے بڑے بڑے خواب دکھائے کیوں مجھ سے محبت کی بولو جواب دو۔“ وہ تقریباً چیخ کر بولی تو احمد زری سے بولا۔

”ایک بات مانو گی تم یہ شادی کر لو اور روئے بھی اگر آپ کسی کو پانے کا خواب دیکھتے ہیں تو اسے کھونے کا حوصلہ بھی رکھنا پڑتا ہے کیوں کہ ہر خواب پورا نہیں ہوتا صابرہ، مجھے بھول جاؤ اور ہاں میری منگنی ہو چکی ہے کچھ مہینوں میں میری شادی بھی ہو جائے گی مگر میں تم سے محبت کرتا تھا اور کرتا رہوں گا۔“ اس نے مزید کچھ سنے بغیر فون کو دیوار پر دے مارا اور پاگلوں کی طرح چیخ کر رونے لگی۔

اس کے بعد اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا اور اس وقت وہ دلہن بنی بیٹھی تھی اس کی نہیں جس کے اس نے خواب دیکھے تھے بلکہ اس کی جو اس کا مقدر تھا کیسا اتفاق تھا جس سے اس کی شادی ہو رہی تھی اس کا نام بھی احمد ہی تھا اس سارے معاملے میں زندگی نے اسے ایک سبق ضرور دیا تھا۔

بہسی بھی کسی انسان سے توقع یا امید مت رکھنا، ورنہ خالی ہاتھ رہ جاؤ گے ہمیشہ اپنے رب سے مانگنا کبھی خالی ہاتھ نہیں رہو گے کیوں کہ وہ بڑا جبار ہے اسے حیا آتی ہے کہ اس کے در سے کوئی خالی ہاتھ لوٹے۔ ہماری قسمت میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے وہ ہمیں ضرور ملتا ہے نہ زیادہ نہ ہی تھوڑا تو رونے سے بہتر ہے کہ جو ہمیں ملا ہے اسے خوشی سے قبول کر لیں۔ یہی تو زندگی ہے اسی کا نام ہی خوشی ہے اور یہ آج اسے پتا چلا تھا۔ اس نئے سال اس نے اپنی ایک نئی زندگی کا آغاز کیا تھا یہ سوچ کر کے جو غلطیاں اس نے پچھلے سال کی ہیں وہ غلطیاں وہ اس سال بالکل نہیں کرے گی۔

☆.....

”مگر تمہیں میری اتنی ہی یاد آتی ہے تو کراچی آ جایا کرو، سہیل۔“  
”ارے کہاں اسلام آباد سے کراچی کا سفر مجھ سے تو نہیں ہوتا۔“ اس کے جواب پر وہ مسکرا کر رہ گئیں پھر کچھ دیر بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کر کے وہ چلی گئیں تو صابرہ جلدی ستای کا فون چھپا کر واش روم میں گھس گئی۔ پہلی ہی منٹ پر کال ریسیو کر لی تھی احمد محبت سے بولا۔  
”کیسی ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں اگر تم نے آج آنا تھا تو مجھے پہلے ہی بتا دیتے۔“  
”اگر پہلے بتا دیتا تو تمہارے چہرے پر اچانک آجانے کی خوشی کیسے دیکھتا۔“

”اچھا تم خیریت سے گھر تو پہنچ گئے نا؟“  
”ہاں بابا ماجھا بعد میں بات کرتے ہیں اپنا خیال رکھنا اور آئی لو پو۔“ احمد کے کہنے پر صابرہ اپنے آپ سے شرمائی۔ انور اور نسیم کے شن بننے اور میں ہی بیٹیاں تھیں۔ بڑی جیلہ جس کی شادی اپنے چاچو کے گھر ہو گئی تھی اس سے چھوٹی صابرہ جو کہ کالج میں پڑھتی تھی اور بڑی مای کے بھانجے احمد سے محبت کرتی تھی جو مای کو ان کے گھر چھوڑنے آتا تھا۔ احمد بھی اس سے بے حد بے حساب محبت کرتا تھا، سب سے چھوٹی فریدہ تھی جو کہ میٹرک کر رہی تھی۔ احمد اور صابرہ سب سے چوری روز فون پر باتیں کرتے تھے۔ وہ یک جان اور دو قالب تھے۔ احمد کے ابو بے حد سخت تھے۔ مخالف و۔۔۔ نے کروٹ لے ان کی محبت کو دو سال ہو گئے، گھر میں صابرہ کی شادی کی باتیں چلنے لگیں اور آج اسے دیکھنے لڑکے والے آنے والے تھے۔ اس نے لاکھ بھانے بنائے لیکن نسیم بیگم نے اس کی ایک نہیں سنی تو اس نے روتے ہوئے جلدی سے احمد کو فون کیا۔  
”احمد، احمد میں تمہارے علاوہ کسی کی دلہن نہیں بنوں گی۔ پلیز اپنے گھر والوں کو سمجھو۔“  
”کیسی باتیں کر رہی ہو صابرہ! تم اچھی طرح جانتی

## بیرونی پارٹی

”مام! دیکھیں نازیبا مجھے کارٹون دیکھتے نہیں دے رہی۔“ شاز نے رونے کے سانداز میں ماں سے کہا۔  
”اوہ شاز! تنگ مت کرو مجھے کام کرنے دو۔“  
شہلا نے غصے سے کہا اور پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

”ہیلو ڈیر!“ دائیں ہاتھ میں بیک پکڑے اور بائیں بازو پر کوٹ ڈالے آفس سے گھر واپسی پر احسن نے خوشگوار موڈ میں بیوی کو مخاطب کیا اور پھر بیک اور کوٹ سائیڈ میں رکھ کر اس کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا۔  
”ہائے گڈ ایوننگ ہی!“ شہلا نے بھی اسے مسکرا کر ویلم کیا۔

”گڈ ایوننگ ڈیڈی!“ دونوں بچوں نے باری باری باپ کو گڈ ایوننگ کہا۔

احسن پیلس میں گڈ ایوننگ رٹائرٹ ہیلو سے ہی گفتگو شروع ہوتی تھی، یہاں سلام دعا کا کوئی رواج نہیں تھا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ احسن بچوں کی لڑائی منشا کر مڑا تو شہلا کو کاپی پین ہاتھ میں لیے کچھ لکھتے پا کر اس نے پوچھا۔

”پارٹی کی لسٹ بنا رہی ہوں؟“ شہلا نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

”اوہ.....! اچھا فکر نہیں کرو سب ہو جائے گا ابھی پارٹی میں ایک ہفتہ باقی ہے۔“ اس نے بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے تسلی دی۔

”ون دیک باقی ہے صرف اور ابھی تک کچھ بھی تیاری نہیں ہوئی، میں نے کہہ دیا ہے ہماری پارٹی

ریکٹ ہونی چاہیے، میں پارٹی میں کوئی کمی رہنے دینا نہیں چاہتی، پارٹی ایسی ہونی چاہیے جسے لوگ یاد رکھیں۔“ شہلانے پر جوش انداز میں کہا۔

”ہاں، ہاں ایسا ہی ہوگا ڈونٹ وری اب ذرا چائے تو پلوادو پلیز۔“ احسن نے بیوی کو تسلی دی اور پھر اپنی ٹائی ڈھکی کر کے صوفے پر ہی دراز ہو گیا۔

”ساجدہ! جلدی سے چائے لے کر آؤ، اتنی دیر سے لگی ہو تم ابھی تک چائے نہیں بنی۔“ شہلانے وہیں بیٹھے بیٹھے کلاس لی۔ کچھ دیر بعد ساجدہ ڈرتی ڈرتی ٹرائی کھینچتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی ٹرائی چیز سوسے، بریڈ رول، فرائیڈش اور پاشا سے تھی تھی۔ احسن پیلس

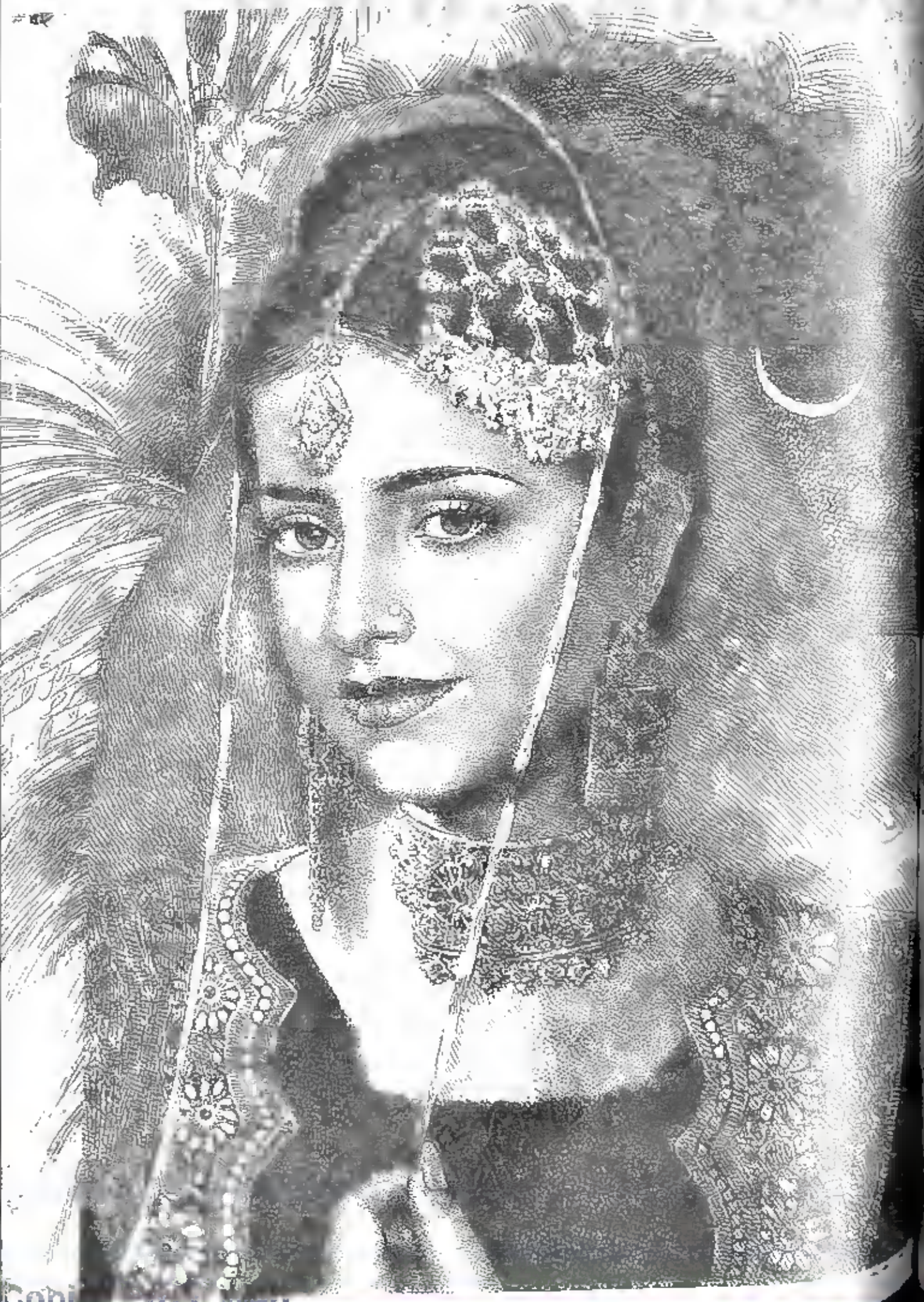
میں شام میں چائے کا روز اسی طرح اہتمام ہوتا تھا۔ صرف شام کی چائے بلکہ رات کا کھانا، ناشتہ سب ہی نہایت اہتمام سے شاپنا انداز میں۔

”تھوڑی دیر ہو گئی۔“ ساجدہ نے سر دھرتے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”ٹھیک ہے آئندہ خیال رکھنا۔“ شہلانے نش کھاتے ہوئے کہا سب چیزیں بہت مزے کی تھیں، اسی لیے اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تھا، اب وہ سب چیزوں کے ساتھ بھرپور انصاف کر رہی تھی۔

”احسن! مجھے نیو ایئر پر کیا گفٹ دے رہے ہو؟“ سوسہ کھاتے ہوئے اسے اچانک یاد آیا تھا۔

”تم بتاؤ تمہیں کیا گفٹ چاہیے؟“ احسن نے چائے سے سب لیتے ہوئے کہا۔



”مجھے ڈائمنڈ رنگ چاہیے اور وہ تم مجھے پارٹی میں سب گیس کے سامنے پہناؤ گے۔“ اس نے حکم دیا۔  
 ”او کے ایز پووش۔“ احسن نے کندھے اچکا کر لاپرواہی سے کہا پھر نیوز دیکھنے لگ گیا۔

☆.....☆

”عاصم! یہ صوفاس طرف رکھو وہاں زیادہ اچھا لگے گا اور صوفہ سیٹ کر کے کرٹز بھی ڈال دینا، آج ہی کرنے ہیں سارے کام۔“ شہلا نے ڈرائنگ روم کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے نوکر کو دیکر کاموں کی یاد دہانی کرائی۔  
 ”جی بی بی جی! ہو جائے گا سب کچھ، آپ ٹکرنہ کریں۔“ عاصم نے اسے اطمینان دلایا اور پھر اس کے حکم کی تعمیل میں لگ گیا۔

شہلا عاصم کے سر پر کھڑی ہو کر ڈرائنگ روم کی سیٹنگ کروا رہی تھی۔ نیا فرنیچر، کارپٹ اور کرٹز احسن پیلس میں سالانہ نوکی تیاریاں جاری تھیں۔ شہلا بہت دل جمعی سے گھر کی تزئین و آرائش میں مصروف تھی۔ شہلا چاہتی تھی پورے گھر میں نیا پینٹ ہو مگر وقت کی کمی کی باعث صرف ڈرائنگ روم اور لاونج میں وال پیپر لگوانے پر ہی اسے اکتفا کرنا پڑا تھا۔

☆.....☆

”کیا کہا ڈاکٹر نے؟“ شہلا نے کمرے میں داخل ہوتے احسن سے پوچھا۔  
 ”اماں کی شوگر اور بلڈ پریشر کنٹرول نہیں ہو رہا، ڈاکٹر کا کہنا ہے نیا ٹریٹمنٹ شروع کرنا ہوگا، اس سے پہلے کچھ ٹیسٹ کروانے ہیں۔“ احسن نے بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے اسے تفصیل بتائی۔

”اف نیا ٹریٹمنٹ اور ٹیسٹ.....! اب ان چکروں میں پڑو۔“ شہلا نے ہاتھوں پر لوشن لگاتے ہوئے سخوت سے کہا۔

”صبح جاؤں گا میں لیب پیز کرتا ہوں ٹیسٹوں کا۔“ احسن نے پرسوج انداز میں کہا اور پھر بلیٹکٹ اوڑھ کے لیٹ گیا۔ شہلا ہاتھوں پیروں پر اچھی طرح لوشن لگا کر

بیڈ پر آئی تو اس کا موڈ بری طرح آف ہو چکا تھا۔ اکثر انسان اپنی زندگی کو خود ہی مشکل بنا دیتا ہے اپنے لیے خود ہی گڑھے کھودتا ہے، بے سکونی کا سامان کر کے سکون کی طلب کرتا ہے۔

☆.....☆

”ہنی! گڈ آفٹرنون۔“ شہلا نے خوشگوار انداز میں احسن سے کہا۔

”اس وقت ہم کیسے یاد آگئے آپ کو؟“ احسن نے شرارت سے پوچھا۔

”ہنی! ایسے ہی تم سے بات کرنے کے لیے رنگ کیا ہے میں نے۔“ شہلا نے ہلکی سی ناراضی سے کہا۔

”او کے اور پارٹی کی تیاریاں کہاں تک پہنچیں؟“ اس نے یاد آنے پر پوچھا۔

”پارٹی کی آرینجمنٹ چل رہی ہے، تم یہ بتاؤ لیب گئے؟“ اس نے تجسس سے پوچھا۔

”ہاں گیا تھا۔“ احسن نے مختصر جواب دیا۔

”کیا ہوا پھر؟“ شہلا کے لہجے میں فکر مندگی نہیں بلکہ کچھ اور تھا۔

”پانچ ہزار کے ہوں کے ٹیسٹ۔“ ایک ہاتھ سے موبائل کان پر لگائے اور ایک ہاتھ لیپ ٹاپ کی کیئر پر چلاتے وہ اسے تفصیل بتا رہا تھا۔

”پانچ ہزار.....!“ شہلا کی چیخ نکلی تھی۔

”احسن سنو! ابھی ہم پارٹی کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں، ویسے ہی ابھی بہت کچھ رہتا ہے، ذرا سی بھی کمی رہ گئی تو ہماری ٹاک کٹ جائے گی اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہتی۔ اماں کونسا کہیں جا رہی ہیں، ان کی دوایاں اور ٹیسٹ ہم بعد میں بھی کروا سکتے ہیں۔ ابھی ہمیں اپنی ساری توجہ پارٹی پر لگانا ہے۔ ٹیسٹ کے چکروں میں پیسے کم پڑ گئے تو ہماری ساری محنت پر پانی پھر جائے گا بلکہ میں تو کہتی ہوں کچھ دنوں کے لیے اماں کو گاؤں چھوڑ آؤ، گھر میں کل پارٹی ہے کھالس کھالس کر ڈسٹربنس کریں گی، تم آج انہیں چھوڑ آؤ

کچھ دنوں بعد واپس لے آیا۔“ وہ سفاکی سے کہہ کر اب احسن کے جواب کی منتظر تھی۔

”ابھی میں ایک میٹنگ میں جا رہا ہوں، تم سامان پیک کر دو ان کا میں آج شام چھوڑ آؤں گا ارکے بائے۔“ احسن کے آخری جملے نے شہلا کو جی جان سے خوش کر دیا تھا۔

☆.....☆

احسن سلیم صاحب اور شاہین بیگم کی اکلوتی اولاد تھا۔ سلیم صاحب گاؤں کے رہنے والے تھے، جب احسن تھوڑا بڑا ہوا تو انہوں نے گاؤں سے شہر کا رخ کیا۔ سلیم صاحب نے دن رات ایک کر کے احسن کو اچھی سے اچھی تعلیم دلوائی اور اس کے بہتر مستقبل کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی، جہاں سلیم صاحب نے احسن کے لیے دن رات ایک کر دیا، وہیں شاہین نے بھی بیٹے کو بہتر زندگی دینے کے لیے بہت محنت کی۔

احسن جب خود مختار ہوا تو جوانی کے زعم میں پسند کی شادی کر لی۔ ماں باپ کو دکھ تو ہوا مگر بیٹے کی خوشی کی خاطر برداشت کر لیا۔ احسن کی شادی کے بعد سلیم صاحب خالق حقیقی سے جا ملے، شاہین بیگم شوہر کی وفات کے صدمے سے نہیں نکلتی تھیں کہ بیٹے اور بہو کے بدلتے رویے نے انہیں مزید توڑ دیا۔ خدا کی زمین ان پر رحم کر دی گئی اور انہیں گھر کے سب سے کونے و اُسٹے گھر سے نہیں کسی بے کار پرزے کی مانند ڈال دیا گیا۔

☆.....☆

انہی اور سفید رنگ کے غبارے کا پینٹ پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بڑی نفاست سے رکھے تھے۔ اندھیرے میں رنگ برنگی ڈسکولائٹس اور بیک گرائنڈ میں چلتا ہلکا ہلکا میوزک ماحول کو خوبصورت بنا رہا تھا۔ سب لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

شہلا بیک ساڑھی اور اس پر سلور جیولری، سب ہی خواتین میں منفرد لگ رہی تھی۔ وہ مہمانوں کو ویلکم کرنے کے ساتھ پارٹی بھی انجوائے کر رہی تھی، اس

کی خوشی دیدنی تھی، سب ہی اس کی آرینجمنٹ کو سراہ رہے تھے۔ احسن نے اسے سب مہمانوں کے سامنے ڈائمنڈ رنگ پہنائی تھی۔ 12 بجے ایک کاٹا جانا تھا، سب کچھ اب تک بریکٹ چل رہا تھا کہ اچانک ساجدہ گھبرائی ہوئی آئی۔

”کیا ہوا ساجدہ؟“ احسن نے پوچھا۔

”وہ صاحب جی گاؤں سے فون آیا ہے، اماں کی طبیعت بگڑ گئی ہے آپ کو بلا دیا ہے۔“ ساجدہ نے ہانپتے ہوئے بتایا۔

”اوہ.....!“ احسن نے ساجدہ کی بات سن کر شہلا کی طرف دیکھا، جو اپنے ہونٹوں کو دانتوں میں دبے احسن کو ہی دیکھ رہی تھی۔

”احسن صاحب! آپ فوراً جائیں۔“ یہ کہنے والے فیضان صاحب تھے۔

”ہاں احسن! آپ کو فوراً اپنی ای کو ہسپتال لے کر جانا چاہیے۔“ شام نے آگے بڑھ کر کہا۔

”وہ پارٹی.....!“

”پارٹی کا کیا ہے جانا ضروری ہے۔“ شرمین، شہلا کو کاٹ کر بولی۔

سب کے اصرار پر احسن اور شہلا کو آخر کار پارٹی ختم کر کے جانا ہی پڑا۔ احسن خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ جب کے شہلا پارٹی کے خراب ہو جانے اور پیسوں کے ضائع ہو جانے پر تڑپ رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا زمین و آسمان غصے سے ایک کر دے۔ غصہ کرتے اور باتیں بتاتے ہوئے ہی اچانک کچھ ہوا اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ کچھ دیر بعد اسے اپنا وجود تارکی میں جانا محسوس ہوا۔

☆.....☆

بوڑھے کمرے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا تو اس نے آنکھیں کھولیں سامنے شاہین بیگم ایک ہاتھ میں شیج پڑھتی دوسرا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھی شفقت



دومحافظ، ذہری حفاظت  
ڈبل فلوراٹائیڈ، ڈبل طلاق



سے اے دیکھ رہی تھیں۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ اس وقت کس منظر میں ہے، اس نے خود کو آکسیجن ماسک اور ڈریس میں جکڑا پا کر ادھر ادھر دیکھا تو کچھ دور احسن سنجیدگی سے کھڑا نظر آیا۔

”م..... میں کہاں؟“ وہ با مشکل یہی بول پائی۔

”شہلا! کیسی طبیعت ہے اب؟“ احسن نے اس کے قریب آ کر آہستگی سے پوچھا۔

”احسن! بچ..... مجھے..... کب..... کیا ہوا؟“ اس نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

”شہلا! اس رات ہائی وے پر ہمارا بہت برا ایکسیڈنٹ ہوا تھا، ہمارا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں ہے، مجھے ایکسیڈنٹ کی اگلی صبح ہوش آ گیا تھا مگر تمہیں آج 5 دن بعد ہوش آیا ہے۔ ڈاکٹرز تو ناامید ہو گئے تھے مگر ماں کی دعائیں رنگ لے آئیں اور تمہیں اللہ نے نئی زندگی بخش دی۔ اماں ایکسیڈنٹ والی رات سے تمہارے پاس ابھی تک یوں ہی بیٹھی ہیں۔“ احسن نے نم آنکھوں سے ماں کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

جس رات ان دونوں کا ایکسیڈنٹ ہوا، اسی رات شاہین گاؤں سے واپس آ گئی تھیں۔ انہوں نے سب کچھ بھلا کر اپنی بیماری کو نظر انداز کر کے دن رات شہلا کے سر اپنے پیٹھے گزارے تھے۔ شاہین بیگم نے شہلا کی زندگی کے لیے اللہ سے گڑ گڑا کر دعائیں مانگی تھیں۔ انہوں نے اس کے علاج کے لیے اپنے کلینک بچ دیے تھے، جو ان کے پاس سلیم صاحب کی آخری نشانی تھے۔ ان کلینکوں کو انہوں نے چھپا کر بہت احتیاط سے رکھا تھا۔ شادی کے بعد سے وہ اسے سنبھالتی آرہی تھیں مگر جب بات اولاد کی آئے تو ماں اپنی ساری متاع اس کی خاطر قربان کر سکتی ہے۔

”بیٹا! تم یہاں شہلا کے پاس بیٹھو، میں شکرانے کے نفل پڑھ کر آتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ گئیں۔

”امی! مجھے معاف کر دیں۔“ شاہین بیگم کے قدم رکے تھے، انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا شہلا کی آنکھوں

سے ندامت کے آنسوؤں کی بارش جاری تھی۔ وہ آج ان سے معافی کی طلب گار تھی ان کے آگے سوالی تھی اور جب اولاد ماں باپ سے محبت سے کچھ مانگتی ہے، تو وہ لہجہ لگائے بغیر سب کچھ بھلا کر اولاد کو فوراً اس کی طلب گار چیز دینے کے لیے تڑپ اٹھتے ہیں۔ ماں باپ تو اولاد پر اپنی جان تک وارد دیتے ہیں، یہ تو پھر معافی تھی۔

شاہین آگے بڑھیں اور پیار سے شہلا کی پیشانی کو چوما۔

”بیٹا! اب بس سب کچھ بھول جاؤ اور جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ، تمہارا گھر تمہارے بچے احسن سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

”اور اماں آپ؟“ شہلا نے تڑپ کر پوچھا۔

جب انسان صحیح راہ پر واپس لوٹتا ہے تو سوچ کے جذبات کے نئے ادوار اس پر کھلتے ہیں وہ ایک نئی سی کیفیت سے گزرتا ہے۔ شہلا کا بھی یہی حال تھا۔

”ہاں مجھے بھی تمہارا انتظار ہے بیٹا! اب تم آرام کرو میں نوافل پڑھ کر آتی ہوں۔“ اماں نے مسکرا کر کہا اور وضو کے لیے ہاتھ روم میں چلی گئیں۔

احسن کرسی پر ڈھیلے سے انداز میں بیٹھ گیا اور شہلا نے پرسکون ہو کر آنکھیں موند لیں، جب دلوں پر سے گرد ہٹ جائے تو انسان خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں زندگی میں ہی اپنی غلطی سدھارنے کا موقع ملتا ہے۔

ماں باپ اللہ کی بڑی نعمت ہیں مگر افسوس آج کل لوگ خود اللہ کی نعمت سے منہ موڑے ہوئے ہیں، وہ غی احکامات اور تمام روایات کو بھولے مغربی طرز عمل پر چل پڑے ہیں۔ لوگوں کے لیے ماں بوجھ بن گئی ہے۔ آج کے مادی دور میں انسان نے سب سے پہلے کچھ کھویا ہے تو وہ احساس ہے ماں باپ جیسی تنظیم ہستیوں کو دکھ دے کر انسان خوشیوں اور سکون کی تلاش میں ہے، بے شک انسان اپنے اوپر خود ظلم کر رہا ہے، اس نے اپنی زندگی خود تک بنا رکھی ہے۔

## قمر بیدار کی گھوٹو

”اب اجازت دیجیے۔“ حنین آفریدی نے جھک کر جہاں آرام کو دیکھا تھا۔  
”ہاں بیٹا! خیر سے جاؤ مگر تم سے ایک ریکونٹ اور بھی کرنی تھی۔“

”جی کیسے۔“  
”میری لاروش سے اگر نادانستگی میں کوئی غلطی ہو جائے تو نادانی سمجھ کے معاف کر دینا، اس نے  
بیس سال تکلیفوں میں گزارے ہیں۔ دنیا کی سمجھ نہیں ہے صرف گھر کی چار دیواری میں اس نے اپنی زندگی  
گزاری ہے تم بہت خیال رکھنا میری لاروش کا۔“  
”جی بہتر۔ اللہ حافظ۔“

حنین آفریدی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور تیزی سے آگے بڑھائی تھی لاروش نے پیچھے مڑ کے دیکھا تھا  
جہاں آرام مولوی صاحب کو پیسے دے کر چوکیدار کے ساتھ رخصت کر رہی تھیں اور اب ان کی جاتی ہوئی  
گاڑی کو دیکھنے لگی تھیں۔ وہ لاروش انخولان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ لاروش انخولان نے چادر  
منہ پر رکھے بنا آواز کے ایک بار پھر سسک سسک کر رونا شروع کر دیا تھا۔



”آسیہ بھابی!“ نجر نے ہولے سے رکارا تھا۔

”نجر!“ آسیہ بھتیجی نجر کے گلے سے لگی تھیں۔

”نجر! میرا بچہ میرا زرمیل اندر آئی سی یو میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہے۔ سارے ڈاکٹرز ناامید ہو چکے ہیں۔ نجر اگر زرمیل کو کچھ ہو گیا تو میں بھی مر جاؤں گی زندہ نہیں رہوں گی۔“ ان کا پورا وجود ہچکیوں کی زد میں تھا۔ ان کا رواں رداں تڑپ رہا تھا۔ بلک رہا تھا۔

”اللہ نہ کرے آسیہ بھابی!“ نجر بھی تڑپ کے رہ گئی تھیں۔

”انشاء اللہ ہمارے زرمیل کو کچھ نہیں ہوگا۔ بہت سارے ہاتھ اللہ کی بارگاہ میں زرمیل کی زندگی مانگنے کے لیے اٹھے ہیں۔“ نجر تو خود بے انتہار رو رہی تھیں کہ ٹھیک سے تسلی بھی نہیں دی جا رہی تھی۔

اور زرمیل کو اس حال پر پہنچانے والا ارشد دیوار سے ٹیک لگائے سر کو شرمندگی سے جھکائے زمین میں ہی گڑا جا رہا تھا۔ زرمیل کی اس حالت کا ذمہ دار وہی تو تھا مگر اب تک کسی نے بھی اسے قصور وار نہیں سمجھا لیا تھا۔ ہجوم کے کٹہرے میں نہیں کھڑا کیا تھا جو اس کے لیے مزید شرمندگی کا باعث تھا۔ اتنی ہی ہمت نہیں کی کہ اس کی نظریں اٹھا کے اس تڑپتی بھتیجی روتی فریاد کرتی ماں کو دیکھ لیتا۔ ان سے اپنے کیے کی معافی ہی مانگ لیتا۔

”بس کریں آسیہ بھابی درنہ آپ کی اپنی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“

رابعہ تو خود بے بسی کے مارے رو دی تھیں مگر آسیہ کی حالت خود ان سے بھی نہیں دیکھی جا رہی تھی تو انہوں نے آسیہ کو خود سے لگا لیا تھا۔

”نہیں رابعہ مجھ سے صبر نہیں ہو رہا میرا بچہ اندر تکلیف میں ہے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔“ ان کا رونا بند ہی نہیں ہو رہا تھا۔ کسی پل سکون نہیں آ رہا تھا۔ دل عجیب دوسوں کا شکار تھا۔ ڈر و خوف اندر کنڈلی مار رہے تھے کچھ انہوں نے نہ ہو جائے زرمیل کو کچھ ہونہ جائے۔

”مٹی پلیز! سنبھالیں خود کو، زرمیل بھائی کو کچھ نہیں ہو گا وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔“ حرانے ڈری ڈری ہنسی دی تھی۔ ورنہ اندر سے وہ بھی تو بہت خوفزدہ تھی۔ دل رور رہا تھا۔ اپنے بھائی کی زندگی کی دعا مانگ رہا تھا۔ بارہ گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد آپریشن تھیٹر سے ڈاکٹرز نکلے تھے۔ سلیم احمر، فہیم احمر اور عارفین تیزی سے آگے بڑھے تھے۔

”کیسی طبیعت ہے ڈاکٹر زرمیل کی۔“ کس قدر بے صبری تھی ان کے لب و لہجے میں۔

”شکر ہے اس رب العزت کا جس نے آپ کے بیٹے کوئی زندگی دی ہے۔“ ڈاکٹر زرمیل نے اپنے کامیاب آپریشن سے بہت خوش تھے۔

”شکر ہے پروردگار کا۔“ تینوں نے اپنے رب کی بارگاہ میں سجدہ ادا کیا تھا۔ سلیم احمر اور فہیم احمر تو فوراً ہی مسجد چلے آئے تھے۔ نفل شکرانے کی نماز ادا کرنے صدقات و خیرات ادا کرنے، وہ اپنے رب کا جتنا شکر ادا کرتے کم تھا۔ غریبوں و مسکینوں کو خیرات تقسیم کی تھی۔ ایدھی میں کتنی ہی دیکھیں پہنچائی تھیں گوکہ اپنی تجویروں کے دل کھول کر منہ کھول دیئے تھے۔

سب نے اپنے اپنے طریقے سے اللہ کے حضور شکرانہ ادا کیا تھا۔ آسیہ تو سجدے میں گر کے ہچکیوں

سے رو دی تھیں۔ ان کا بیٹا زندگی کی جنگ جیت چکا تھا۔ رابعہ اور نجر نے بھی جائے نماز بچھائے شکرانے سے نفل ادا کیے تھے۔

اس سب کے دوران کسی کو بھی ڈالے کا کوئی خیال نہیں آیا تھا۔ جب معاملہ کچھ بہتر ہوا تو حرانے غور کیا ڈالے یہاں موجود کیوں نہیں ہے۔ اس کا تو اس وقت یہاں موجود ہونا ضروری تھا۔ حرا چونکہ کالج آئی تھی اس لیے گھر میں ارشد اور زرمیل کے درمیان ہونے والی تکرار سے بے خبر تھی۔

”مٹی! ڈالے کہاں ہے وہ اسپتال آئی نہیں ہے کیا؟“ حرا کو ڈالے کی غیر موجودگی پر بہت افسوس ہوا تھا۔ دکھ تو ثمرن پر بھی ہوا تھا۔ کیوں کہ زرمیل، ثمرن کو بہت چاہتا تھا۔ حرا اور ثمرن میں کوئی فرق نہیں رکھتا تھا پھر ان دونوں کی غیر موجودگی.....!

اس کے دماغ میں کسی گڑ بڑ کے ہونے کی گھنٹیاں ہی بجنے لگی تھیں۔

”ہاں نجر بھابی! ڈالے کو کیوں لے کر نہیں آئیں۔ حالات چاہے جو بھی رہے ہوں زرمیل ڈالے کا شوہر ہے۔ اس حقیقت کو ہم نہیں جھٹلا سکتے۔ ڈالے کا یہاں ہونا بہت ضروری ہے۔“ رابعہ کو بھی ڈالے کی کمی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

نجر نے شرمندگی سے آسیہ کو دیکھا تھا پھر رابعہ کو۔

”ڈالے کو جب زرمیل کے بارے میں پتہ چلا تو وہ اسی وقت بے ہوش ہو گئی تھی۔ ارشد نے فوراً ڈاکٹر سعدیہ کو بلوایا تو ڈالے کو شاک کی کیفیت میں بتایا اس کے دل و دماغ کو زبردست دھچکا لگا ہے اور دوسری بات کہ.....“ وہ خاموش ہو گئی تھی۔

”دوسری بات کیا نجر بھابی؟“ رابعہ نے بنور ان کا چہرہ دیکھا تھا۔

”دوسری بات یہ کہ ڈالے پھر سے امید سے ہے۔“

”کیا.....! مگر نجر.....!“ آسیہ اور رابعہ پر تو جیسے حیرانگی کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہ ٹھیک سے سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ یہ سب کیسے ہوا اور ان کی سوچ کو نجر نے پڑھ بھی لیا تھا۔

”اسلام آباد میں ڈالے اور زرمیل ایک ساتھ ایک ہوٹل اور ایک ہی کمرے میں دو دن ساتھ رہے تھے۔“ پھر نجر سے آگے کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ آسیہ نے نجر کو دیکھا ضرور تھا مگر سوچوں کے تانے بانے صرف اور صرف ایک ہی نقطے سے اٹھے ہوئے تھے کہ اگر ایسی بات تھی کہ بات یہاں تک پہنچی تو پھر ڈالے نے زرمیل کو چھوڑ کے ارشد کا ساتھ کیوں دیا؟

”پھر تو نجر بھابی آپ اس وقت گھر جائیں ڈالے کے پاس یہاں میں ہوں آسیہ بھابی ہیں اور پھر اللہ کا بہت بہت کرم ہے کہ زرمیل بھی خطرے سے باہر ہیں۔“ رابعہ نے سنجیدگی سے نجر کو دیکھا تھا۔

”ہاں ڈالے کے پاس مقسوم ہے وہ خیال رکھے گی اب نجر کی اذان بھی ہونے والی ہے میں نجر کی نماز ادا کر کے پھر زرمیل کو دیکھ کر چلی جاؤں گی۔“

”چلیں ٹھیک ہے۔“ رابعہ اور نجر دونوں ایک ساتھ وضو کرنے اندر بڑھیں۔

وہ صبح فجر کی نماز کے بعد کراچی کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ اس وقت حسین آفریدی کی اتنی بری



حالت تھی کسا سے نہیں یاد پڑتا کہ کبھی اس حال سے بھی گزرا ہو گا وہ۔

ایک تو نیندا پر سے شدید بھوک نے اسے بالکل جیسے توڑ کے رکھ دیا تھا۔ وہ تو ویسے بھی بھوک کا بہت کچا تھا اور جو مزید وہ کوفت اور بے زاری کا شکار تھا اس کی سب سے بڑی وجہ فرنیٹ سیٹ پر بیٹھی بڑی سی چادر میں لپٹی یہ لڑکی جسے وہ اب تک صرف روتے ہوئے ہی دیکھ اور سن رہا تھا، جسے چپ کرانے کی اس نے زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔

”پلیز خدا کے لیے آپ خاموش ہوں گی۔“ آخر کار وہ لاروش اغولان کے رونے سے بری طرح تھک چکا تھا۔ بیزار ہو چکا تھا۔ مگر لاروش اغولان نے تو جیسے نہ چپ ہونے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔ حسین آفریدی کی بھی برداشت اب ختم ہو گئی تھی اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

”قارگاڈ سکا! چپ ہو جائیے ورنہ یقیناً جاے میں آپ کو ابھی اور اسی وقت اس گاڑی سے نیچے اتار دوں گا۔“ بے حسی اور سختی کی ساری حدیں توڑ دیں تھیں اس وقت حسین آفریدی نے، لاروش اغولان اس کے یوں دباڑنے پر بری طرح سہم کر اس کی بلوریں آنکھوں میں ٹکنے لگی جہاں زمانے بھر کی بے زاری تھی۔

”آئی سویرا اگر اب آپ کی مجھے اتنی سی بھی آواز آئی تو میں کوئی لحاظ نہ کروں گا اور نہ ہی کوئی رعایت۔“ حسین آفریدی نے غصے سے کہتے ہوئے لاروش اغولان کی سبھی سبھی خوف زدہ ہر نی آنکھوں میں بنور دیکھا تھا اور پھر نگاہوں کا رخ پھیر کر نظریں وٹا سکرین پر بخاڑی تھیں۔

اس کا ذہن بری طرح تھک چکا تھا بلکہ اس کا ایک ایک اعضاء دکھ رہا تھا اور پیٹ میں الگ بھوک سے آنتیں قل حوالہ پڑھ رہی تھیں۔ اس سے اتنی بڑی غلطی ہو گئی تھی کہ اپنے کھانے پینے سے بھر اہیک گھر ہی بھول گیا تھا۔ جوانی جلد بازی کے نکاح کے پھر میں جہاں آراء کے بیڈروم سے اٹھانا ہی بھول گیا تھا۔ وہ سوچ بھی رہا تھا کہ کسی ہوٹل میں رک کے اچھا سا حلوہ پوری کا ناشتہ کر لے مگر دل شدت سے یہی چاہ رہا تھا کہ جلدی سے گھر آجائے اور وہ اپنے آرام دہ بڑے سے روم میں سکون سے بھر پور نیند کے مزے لے۔

لاروش اغولان، حسین آفریدی کے سختی سے ڈانٹنے پر چپ تو ہو گئی تھی مگر دل اندر سے پھر بھی خون کے آنسو رو رہا تھا۔ دل و دماغ صرف وہیں جہاں آراء کی طرف اٹکا ہوا تھا۔ گھر میں سب کو جب پتہ چلے گا وہ جانے ناموں ممانی کا برتاؤ کیسا ہو گا لالا لاکھ تو ان کو چھوڑے گی نہیں۔“ انہی دردناک سوچوں میں گھری رہی تھی وہ کہ پتہ بھی نہیں چلا گھر بھی آ گیا تھا۔ حسین آفریدی کی گاڑی گھر کے دروازے پر آرکی تھی۔ آٹو جیک دروازہ کھلا تھا۔ گاڑی اندر داخل ہو گئی تھی۔

لاروش اغولان نے نظر اٹھا کے دیکھا تھا۔ اس کی تو آنکھیں کھلی کی کھلی ہی رہ گئی تھیں وہ گھر نہیں کوئی شاعر اس کا محل تھا۔ اتنا بڑا ہرا بھرا سالان جہاں ہر قسم کے پھولوں کے چھوٹے بڑے گلے قرینے سے رکھے گئے تھے۔ پتہ نہیں کتنے قسم کے تو درخت بھی کھڑے تھے جس میں بہت سے قسم کے پھل بھی لگے ہوئے تھے۔ صبح صادق کے وقت کا یہ ہرا بھرا سا منظر آنکھوں کو تراوت بخش رہا تھا۔ ایک سکون سا اندر تک اتر رہا تھا۔ رنگ برسے گئے ہر قسم کے پھولوں اور پھلوں کا یہ بڑا سا باغ اس قدر حسین اور دلکش لگ رہا تھا کہ وہ اس سرسبز و ہریالی میں کھوسی گئی تھی اور اس قدر بڑے سے سرسبز لان کے بیچ وہ کانچ، اینٹوں اور ماربل سے

پانچسین ترین عالی شان محل اس سرسبز و شاداب ہریالی کی شان اس کی قدر بڑھا رہا تھا۔ اس محل کا پورچ ہی اتنا بڑا تھا کہ ہر ماڈل کی گاڑیاں وہاں لائن سے کھڑی تھیں۔ جہاں آراء نے بتایا تھا کہ یہ لوگ جدی پستی نہیں ہیں۔ یوں سمجھو دولت شہرت عزت یہ لوگ ادھر سے ہی لکھو کے لائے ہیں مگر اتنے امیر ہوں گے کہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ خود اس کو اپنی ذات برابر میں بیٹھے حسین آفریدی کے سامنے بہت چھوٹی لگ رہی تھی۔ کوئی دو منٹ تو لگے ہی ہوں گے انہیں مین گیٹ سے پورچ تک آنے میں۔

”یہ سب بعد میں تسلی اور سکون سے دیکھ لیجئے گا۔ کیوں کہ آپ کو اب یہیں زندگی بھر رہنا ہے۔ یہ سب آپ کا بھی ہے مگر فی الحال پلیز ابھی اندر چلیں کیوں کہ میرا اسلیمنٹ بالکل ختم ہو گیا ہے۔“ حسین آفریدی کی آواز پر اور اس کے لفظوں پر وہ جی بھر کے شرمندہ ہوئی تھی اور خود اپنے آپ کو ہی دل ہی دل میں برا بھلا بولنے لگی تھی۔

حسین آفریدی گاڑی سے نیچے اترتا تو لاروش اغولان بھی اپنی بڑی سی چادر سنبھالتی نیچے اتری تھی۔ کارڈور پار کرتے ہوئے وہ اس محل میں داخل ہوئے تھے۔ حسین آفریدی نے تو ایک سکون سے بھرا سانس لیا تھا کہ جانے کتنی کھٹن سے بھری مسافت طے کر کے آیا ہو۔ کچھ یاد آنے پر اس نے ایک نظر پلٹ کر اپنے سے کچھ فاصلے پر کھڑی کالی چادر میں لپٹے وجود پر ڈالی تھی۔

”ایک بات اور کہنی ہے ہمارا نکاح ہوا ہے فی الحال اس کا ذکر کسی سے بھی نہیں کریں گی آپ جب وقت آئے گا تو میں خود بات کر لوں گا۔“

اور پھر وہ رکنا نہیں تھا۔ تیزی سے چلتا ہوا اوپر کی سمت بڑھا تھا۔ لاروش اغولان تو صرف دیکھتی کی دیکھتی ہی رہی گئی تھی۔ اتنے بڑے سے خوب صورت ترین لاؤنج کے سینٹر میں وہ اسے اکیلا چھوڑ کے اوپر جانے کون سے کمرے میں غائب ہو گیا تھا۔ حسین آفریدی کی اس قدر بے حسی و بے مرونی پر اس کا دل بری طرح پھوٹ پھوٹ کے رونے کو کر رہا تھا۔ اب وہ کہاں جائے یہاں اس گھر میں کون اس کو پہچانے گا اور نہ ہی تو وہ کسی کو جانتی تھی۔ عجیب شش و پنج کا شکار وہ بے وقوفوں کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ وہ تو یہاں اندر آنے والا راستہ بھی نہیں جانتی تھی۔ جب کھڑے کھڑے پیرشل ہو گئے جسم کا ہر عضو تو پہلے ہی دکھ رہا تھا جب برداشت سے باہر ہو گیا تو وہ وہیں ایک صوفے پر ٹک گئی تھی۔

”نانو! آپ نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا ہے۔ کہیں میری زندگی میں ایک نئی آزمائش تو نہیں آ رہی ہے۔ اف میرے خدا میں کیا کروں تو ہی میری مدد فرما۔ مجھے یہاں لانے والا میری زندگی کا سائیکل شریک حیات میرا مجازی خدا تو بے خبر اپنی نیند کے مزے لوٹ رہا ہو گا۔ جسے یہ بھی احساس نہیں کہ میں یہاں نہ کسی کو جانتی ہوں نہ پہچانتی ہوں نہ ہی کوئی مجھے جانتا پہچانتا ہے۔ اگر مجھے کسی نے اس گھر سے نکال دیا تو؟“ اس سے آگے کی سوچ ہی نہایت تکلیف دہ اذیت ناک تھی۔ وہ تو بس اب رونے ہی والی تھی کہ کسی کی آہٹ پر اس نے سر اٹھا کے دیکھا تھا۔

آنے والی خاتون اس کی نانو کی عمر کی ہی خاتون تھیں۔ جو دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے نزدیک آنے لگی تھیں۔ لاروش اغولان ان کو دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کی دونوں ٹانگیں کپکپانے لگی تھیں اب وہ اس سے سخت لہجے میں پوچھیں گی۔

”کون ہو تم، یہاں کیا کر رہی ہو کس کی اجازت سے اندر آئیں۔ نکل جاؤ یہاں سے۔“ بہت سے ایسے سوالات اس کے دل و دماغ میں گردش کر رہے تھے۔

”کون ہو بیٹی تم؟“ اس قدر نرم و ملائم لب و لہجہ اتنا شیریں انداز کہ اسے اپنی فضول سوچوں پر شرمندگی سی محسوس ہوئی تھی۔

”جج..... جج.....“ زبان لڑکھڑا کے رہ گئی تھی۔

بی جان کی زیرک نگاہوں نے اس کی گھبراہٹ چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ اس کی غیر ہوتی حالت سے آہستہ آہستہ لگا جیسے وہ ابھی بسیں بے ہوش ہو جائے گی۔ بی جان ہولے سے مسکرائیں۔

”ایسا کرو پہلے آرام سے سکون سے بیٹھ جاؤ۔ شاباش۔“ بی جان صوفے پر بیٹھی تھیں تو لاروش اغولان بھی واپس اپنی جگہ پر ٹک گئی تھی نگاہیں بدستور جھکی ہوئی ہی تھیں۔

”اب یہ بتاؤ کون ہو تم اور کیا نام ہے تمہارا؟“

”لاروش..... لاروش اغولان۔“ لاروش اغولان نے ہچکچاتے ہوئے بی جان کو دیکھا تھا۔

”لاروش اغولان.....؟“ بی جان نے اس کا نام دہرایا تھا اور پھر بغور اس کا خوف زدہ چہرہ اس کی ڈری ڈری ہرنی آنکھیں دیکھیں۔

”تم جہاں آراء کی نو آبی ہو؟“ بی جان فوراً ہی پہچان گئی تھیں۔

”جج۔“ لاروش اغولان نے دھیرے سے گردن اثبات میں ہلا دی تھی۔

”جہاں آراء کیسی ہے وہ نہیں آئی تمہارے ساتھ اور تم یہاں کیسے آئی ہو؟“ ایک ساتھ اتنے سارے سوالات وہ توجیح معنوں میں گھبرا کے رہ گئی تھی۔

”جج وہ.....“ لاروش اغولان کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا کہ آیا ضنین آفریدی کا نام لینا بھی چاہیے یا نہیں مگر اس کی یہ مشکل بھی بی جان نے آسان کر دی تھی۔

”جج آفریدی تمہیں یہاں لایا ہے؟“

”جج۔“ اس نے اس طرح کہا جیسے اسے کسی گناہ کا اعتراف کر رہی ہو۔

”اور جہاں آراء وہ تم لوگوں کے ساتھ نہیں آئی؟“

”جج نہیں۔“

”کیوں جہاں آراء کیوں نہیں آئی؟ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ بی جان کے لہجے میں واضح فکر مندگی محسوس کی جاسکتی تھی۔

”نہیں نا تو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ ان کے ذکر پر لاروش اغولان کی ہرنی آنکھوں سے آنسو پھلکنے لگے تھے۔

”پریشان مت ہو، اللہ بہتر کرے گا۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں اس سے فون پر بات کر لوں گی۔ تم بہت لمبے سفر سے آئی ہو۔ کچھ دیر آرام کر لو پھر مل کر ناشتہ کریں گے اور یہ کہ اب سے تم سے ہی اپنا گھر سمجھنا۔ بہت آرام اور سکون سے رہنا تمہیں یہاں نہ تو کوئی تکلیف ہوگی اور نہ ہی تمہیں یہاں کوئی پریشان کرنے والا ہے۔ جہاں آراء تمہارے لیے بہت پریشان تھی فکر مند تھی اندر ہی اندر گھلتی رہتی تھی۔ میں ابھی

اسے فون کر کے کہہ دیتی ہوں کہ اب اسے تمہاری فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب سے تم میری ذمہ داری ہو تمہیں یہاں سب کچھ ملے گا۔ پیار، مان، محبت، جاہت، عزت سب کچھ اور تم بھی خود کو اکیلا اور نہایت سمجھنا جیسے جہاں آراء ہے ویسے ہی تمہارے لیے میں ہوں اب سے تم مجھے بی جان ہی پکارنا۔“ انہوں نے لاروش اغولان کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا تھا۔ لاروش اغولان کا دل بھر آیا تھا اس کے دل کو جیسے سکون سا ملا تھا۔ جیسے تپتی کڑھتی ہوئی دھوپ سے وہ ٹھنڈی میٹھی چھاؤں میں آ بیٹھی ہو۔

پہرنی آنکھیں اس جاٹا رہتی محبت پر بھرنے لگی تھیں۔ تو بی جان نے اس کو بڑھ کر خود سے لگا لیا تھا۔

”بس اب رونا مت۔ اب تمہارے رونے کے دن ختم ہو گئے ہیں۔ آج سے میں تمہاری ان پیاری پیاری سی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھوں، ہمیشہ خوشی دیکھوں ہنستا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھوں ٹھیک ہے؟“

لاروش اغولان نے ہولے سے سر ہلا دیا تھا۔ بی جان نے اس کی چمکتی پیشانی پر بوسہ لیا تھا اور اپنے ساتھ کھڑا کیا تھا۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ وہ اسے ایک کمرے میں لے گئیں۔ جو بہت بڑا کشادہ اور خوبصورت تھا۔

”اب سے یہ کمرہ تمہارا ہے تم یہاں سکون سے رہنا۔ کسی بھی شے کی ضرورت ہو بلا جھجک کہہ دینا۔ بالکل بھی نہ شرمانا نہ ہی گھبرانا۔“

”جج بی جان!“

”اب تم کچھ دیر سو جاؤ آرام کرو۔ باتیں پھر کریں گے۔ ابھی تم زو بار یہ سے ملو گی تو او خوش ہو جاؤ گی۔ اب جاؤ آرام کرو میں جب تک ناشتہ بنواتی ہوں پھر سب مل کر کریں گے۔“ انہوں نے ایک بار پھر بزرگانہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور چلی گئیں۔

جانے کتنا وقت گزر گیا تھا اسے نیند کی پرسکون وادی میں کھوئے ہوئے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے سلیکی ریشم جیسے نرم و ملائم بالوں میں کوئی دھیرے دھیرے انگلیاں پھیر رہا ہے اور ہولے ہولے سے شرمیلی آواز میں اسے پکار رہا ہے۔

”لاروش..... جان اٹھ جاؤ دیکھو دو پہر کے وونج گئے ہیں اٹھو شاباش! کچھ کھا لو۔ بھوکا لگی ہو گی تمہیں لاروش بیٹا۔“

مٹا سے بھری پر نور آواز میں جیسے وہ کھوسی گئی تھی۔ اس نے کبھی اپنی سگی ماں کو دیکھا تو نہیں تھا مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جنت میں ہے اور اس کی ماں بالکل اس کے قریب ہی اسے پیار سے سہلا رہی ہے۔

اسے پکار رہی ہے وہی خوشبو وہی سکون وہی راحت جو کبھی دنیا میں اسے میسر نہیں تھی۔ وہ اس پل خود کو بہت پرسکون محفوظ سمجھ رہی تھی۔ زمانے کی تلکیوں، اذیتوں سے آزاد سمجھ رہی تھی اس کے ہونٹوں پر اطمینان بھری خوشنما سی مسکراہٹ تھی اگر یہ خواب ہے تو یہ خواب کبھی نہ ٹوٹے وہ تمام عمر اس خوشبو بھرے حصار میں رہنا چاہتی تھی۔ اس ایک لمحے نے اس کے سارے دکھوں، ساری تلکیوں کا مہاوا کر دیا تھا۔

اس کی روح پر جسم پر لگے زخموں سے رستے لہو کو بھلا دیا تھا۔ زو بار یہ آہستگی سے مسکرائیں وہ سمجھ گئی تھیں مٹا سے محروم یہ پیاری سی معصوم بھولی بھالی لڑکی خوابوں و خیالوں کی واویلوں میں اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کے گھٹلے مار رہی ہے۔ خوش ہو رہی ہے وہ چاہتی نہیں تھیں کہ لاروش اغولان کا خواب توڑیں مگر وہ صبح سات

بچے سے بھوک پیاسی سو رہی تھی۔ انہیں لاروش اغولان کی بھوک کی بھی فکر لاحق تھی۔ انہیں بے ساختہ اس کی محسوسیت پر پیار آیا تھا۔

زوباریہ جھکیں اور دیر سے اس کی روشن پیشانی پر پیار بھرا شفقت سے بھرا بوسہ لیا تھا۔ ان کے پیار بھرے لمس پر لاروش اغولان کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس کی نیند ٹوٹی تھی۔ اس کا خواب ٹوٹا تھا خود پر جھکے اس چہرے سے وہ خوف زدہ ہو گئی تھی اور ایک جھکے سے اٹھ کے بیٹھی تھی۔ ان ہرنی آنکھوں میں خوف و ہراس واضح طور پر زوباریہ دیکھ رہی تھیں۔ ابھی بھی لاروش اغولان کا ہاتھ زوباریہ کے ہاتھوں میں ڈبا ہوا تھا۔ لاروش اغولان نے اپنا ہاتھ ان ہاتھوں میں مقید دیکھا تو ہرنی آنکھوں کا خوف مزید دو چند بڑھا تھا۔

”ڈرو نہیں بیٹا!“ زوباریہ نے نرم مسکراہٹ سے اس کو دیکھا تھا۔  
 ”..... آپ..... کون؟“ لاروش اغولان کی گھبراہٹ کسی طور بھی کم نہیں ہو رہی تھی۔  
 ”میں حنین کی ماما ہوں اور اب سے تم بھی مجھے ماما سمجھ سکتی ہو بلکہ کہہ بھی سکتی ہو۔ میرے صرف دو ہی بیٹے ہیں ایک پیاری سی چاندنی بیٹی کی کئی تھی وہ تم نے آکر پوری کر دی ہے میرے رب نے میرے آنکھ میں بھی چاندنی بکھیر دی ہے۔“ زوباریہ نے اس کے پھولے پھولے سرخ و سفید گالوں پر ہاتھ پھیرا تھا۔ لاروش اغولان ان کو کھڑکھڑا دیکھ رہی تھی۔

”کچھ بولو گی نہیں، کیا میں بہت بری ہوں؟“ زوباریہ نے اس کی ہرنی آنکھوں میں جھانکا تھا۔  
 ”نہیں..... نہیں..... تو۔“ وہ زوباریہ کے اس قدر پیار پر شرمندگی سے سر جھکا گئی تھی۔ زوباریہ نے بغور اس کا چہرہ دیکھا تھا۔  
 ”بی جان کہہ رہی تھیں کہ تم بہت محسوس ہی بھولی بھالی ہو مگر میں کہتی ہوں تم بہت زیادہ پیاری اور خوب صورت ہو۔“ لاروش اغولان اپنی اس تعریف پر بری طرح جھینپ کر رہ گئی تھی۔ زوباریہ دیر سے سے مسکرائیں۔

”اچھا یہ بتاؤ تمہیں بھوک نہیں لگ رہی ہے؟“  
 ”جی۔“ اس نے حیران ہو کر زوباریہ کو دیکھا تھا۔  
 ”جانتی ہو کیا نام ہو رہا ہے، دوپہر کے ڈھائی بج رہے ہیں۔“  
 ”ڈھائی بج گئے۔ میں اتنی دیر تک سوئی رہی۔“ وہ شرمندگی سے آہستہ آواز میں خود سے بولی تھی مگر اس کی آہستہ آواز زوباریہ نے سن لی تھی۔

”تم بہت عرصے بعد شاید سکون کی گہری نیند سوئی ہو۔ میں کوئی تین بار تمہیں دیکھنے آ چکی ہوں مگر تم اتنی بے خبر اور پرسکون بیٹھی نیند سو رہی تھیں کہ دل ہی نہیں چاہا تمہیں اٹھا دوں۔ مگر مجھے تمہاری بھوک کی بھی فکر ہو رہی تھی۔ اس لیے تمہیں اٹھا دیا بی جان کو بھی تمہاری بہت فکر ہو رہی ہے۔“ زوباریہ نے نرمی سے دیکھتے ہوئے اس کے رخسار پر ہاتھ رکھا تھا۔  
 انہوں نے تو پیار و چاہت سے جیسے اس کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ماں تو اس نے کبھی دیکھی نہیں تھی مگر شاید اگر آج اس کی اپنی سگی ماں زندہ ہوتی تو یقیناً وہ بھی ایسے ہی اس کی فکر کر رہی ہوتی۔  
 ”کیا سوچتے لگی ہو بیٹی؟“

”جی.....!“ وہ چونک کر زوباریہ کو دیکھنے لگی تھی۔

”چلو خیر سب باتوں کو چھوڑو ہم ہاتھوں بعد میں ڈھیر ساری کریں گے۔ پہلے تم اٹھو جلدی سے فریش ہو جاؤ۔ پھر مل کر ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں ابھی تک میں نے بھی کھانا نہیں کھایا ہے۔ کیوں کہ آج کا دوپہر کا کھانا میں اپنی پیاری سی بیٹی کے ساتھ کھاؤں گی۔“ لاروش اغولان کو مزید شرمندگیوں نے اپنے حصار میں لے لیا کہ وہ اس کی وجہ سے بھوک بیٹھی ہیں۔

”اٹھو شاباش!“ زوباریہ نے لاروش اغولان کا ہاتھ پکڑ کے بیڈ سے نیچے اتارا تھا۔ لاروش اغولان آدھے گھنٹے بعد زوباریہ کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی تھی۔ ٹیبل پر تین چار ڈشز رکھی ہوئی تھیں۔ بریانی، شامی کباب، سالن میں اچار گوشت اور حلیم بھی تھا۔ بیٹھے میں کھیر اور سویاں تھیں۔ اس کے علاوہ ہاٹ پاٹ میں تندور کی اور گھر کی بنی روٹیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ اب پتا نہیں یہ اس کے لیے اتنا اہتمام تھا یا روز کا معمول تھا۔

”چلو بیٹا! لاروش بسم اللہ کرو۔“ لاروش اغولان تو جیسے شرم و جھجک سے زمین میں ہی گڑی جا رہی تھی۔ وہ تو پہلے بھی اتنی کھانے کی شوقین نہیں تھی مگر زوباریہ کی زیرک نگاہوں نے اس کی شرم و حیا پڑھ لی تھی اس لیے انہوں نے خود اس کی پلیٹ میں مٹن بریانی اور کباب رکھ دیا تھا۔

”آئیے! یہ بہت زیادہ ہے۔“ زوباریہ نے تقریباً اس کی پلیٹ بریانی سے بھر ہی دی تھی۔  
 ”پہلی بات تو یہ کہ تم مجھے آئی نہیں کہو گی اور دوسرا کہ تم صبح کی بھوک ہو اور میں جانتی ہوں تم شرماری ہو۔ اس لیے تم یوں سمجھ لو آج سے کہ بیٹی اپنی ماں کے پاس آ گئی ہے اور اس کے ساتھ کھانا کھا رہی ہے۔ اس لیے ہر شرم و حیا ایک طرف رکھو اور بلا جھجک کھانا پیٹ بھر کے کھاؤ۔“ زوباریہ کی اتنی محبت بھری متا پر وہ جیسے نہال ہو گئی ہو اس کا دل بھر آیا تھا۔ ہرنی آنکھوں میں نمی سی آنکھری تھی جس میں سے چند مٹی ٹوٹ کر رخسار پر بکھرتے چلے گئے تھے۔

”میری بات ہے روتے نہیں ہیں۔ کسی بھی ماں کو اپنی بیٹی کی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے ہیں۔“ زوباریہ نے اس کے آنسو صاف کیے تو لاروش اغولان کا دل بھر آیا بے ساختہ ہی اس نے زوباریہ کا ہاتھ نعام لیا اور عقیدت سے ہونٹوں سے چوم لیا تھا۔  
 ”میں اتنی محبت کے قابل نہیں ہوں۔“

”یہ تو تم میرے دل سے پوچھو کہ تم کس قابل ہو اور تمہاری میرے دل میں کتنی قدر ہے۔ میں تو اپنے رب کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ بیٹی کے لیے ترسی ہوئی ماں کو ایک پلی پلائی بیٹی مل گئی ہے۔“ زوباریہ نے اس کا مان بڑھا دیا تھا۔ متا کے پیار کی خوشبو کو ترسی لاروش اغولان کو ایک ماں اس کی متا بھری خوشبو مل گئی تھی۔

”اب شاباش ردنا بند کرو۔ یوں رو کر تم میرا بہت دل دکھا رہی ہو۔“  
 ”سوری۔“ لاروش اغولان روتے روتے مسکرا دی تھی۔  
 زوباریہ نے اسے ٹیبل پر رکھی ہر ڈش کھلائی تھی۔ لاروش اغولان نے اب تک کی اپنی زندگی میں یوں پہلی بار کھل کر بلا خوف بلا جھجک پیٹ بھر کے کھانا کھایا ہو گا۔ ورنہ وہاں ممانی تو اس کے سر پر کسی تلوار

کی طرح لنگی رہتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ نانو اور ممانی کی کبھی بھی نہیں بنتی تھی اور جیت ہمیشہ نانو کی ہی ہوتی تھی۔ مگر ممانی کے عتاب کا نشانہ لاروش اغولان ہی بنتی تھی۔ اتنا کچھ نانو سے سننے کے بعد بھی وہ لاروش اغولان کو ستانے سے باز نہیں آتی تھی۔ وہ ظلم ڈھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں گنواتی تھیں اور لاروش اغولان وہ بے چاری تو بس ان کی کڑوی کیسی باتیں خاموشی سے ہی سنتی تھی۔ ان کی زہریلی نگاہیں حتیٰ کہ کبھی کبھی ان کی مار بھی بزواشت کرتی تھی۔ مگر نانو تو کبھی کبھی نہیں بتاتی تھی کہ لڑائی جھگڑا مزید بڑھے گا۔ اس لیے چپ چاپ رات کو جہاں آراء کے برابر میں آ کر لیٹ جاتی تھی۔ مگر جہاں آراء بھی ایک جہاندیدہ زیرک نظریں رکھنے والی خاتون تھیں۔ فوراً پہچان جاتی تھیں۔

لاروش اغولان کو یہاں آئے تین دن ہو گئے تھے اور تین دن میں جتنی محبت اسے زو بار یہ اور بی جان سے ملی تھی اس کا اس نے تصور بھی نہیں تھا مگر ہاں اسے یہاں لانے والا حسین آفریدی جس کی شکل بھی اس نے ابھی تک نہیں دیکھی تھی اور ان کے مابین جو رشتہ زبردستی مجبوری کے تحت جوڑا گیا تھا وہ رشتہ بھی شاید حسین آفریدی بھول چکا تھا۔ اس لیے بی خان یا زور ہا یہ نے اب تک اس سے اس بارے میں کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔ وہ انہی سب سوچوں میں گھری صوفے پر اکیلی بیٹھی تھی۔ سامنے فل سائز کالی ڈی ضرور چل رہا تھا مگر اس کی نگاہیں اسکرین پر نہیں تھیں۔ اس کے دھیان کے سارے اچھے دھاگے حسین آفریدی میں ہی اچھے ہوئے تھے جانے آگے کا مقدر اس کا کیسا تھا کیا نصیب میں لکھا تھا اس کی اس مجبوری کے رشتے کی زندگی کتنی تھی۔

”ماں..... ماما..... موم.....“ ایسے بہت سے ناموں سے پکارتا ہوا حسین آفریدی اوپر رینگ سے پھسلتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔ آواز اتنی اونچی اور بلند تھی کہ خود لاروش اغولان بھی اپنی سوچوں کو سوچتی بری طرح چوکی تھی اور اس سمت دیکھنے لگی۔

”ہنی۔“ پیچھے سے زو بار یہ نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔  
”یہ کیا حرکت ہے ہنی! اگر کہیں چوٹ لگ جائے پر پچھتا بالکل نہیں جائے گا تمہارا۔“ حسین آفریدی کی زوردار پکار سے ہی زو بار یہ کچن سے باہر نکل کر آئی تھیں۔

”موم! مائی سویٹ اینڈ کیوٹ بے بی آپ کا بیٹا بہت اسٹرونگ اور ڈھیٹ ہے۔“ وہ فوراً ہی مسکراتا ہوا زو بار یہ کے گلے کا ہار بنا تھا۔ ایسا ہی تھا وہ سب سے یونہی اپنے لاڈلے اٹھواتا تھا۔

”فضول کی باتیں ہوا تو تم سے صرف۔“ انہوں نے حسین آفریدی کو خود سے الگ کیا تھا۔  
”یہ بتاؤ کیوں اتنی زور زور سے چیخ رہے تھے؟“  
”پہلے آپ یہ بتائیے میرے روم میں کب آئی تھیں؟“  
”میرا خیال ہے تین دن پہلے، کیوں؟“

”جیسی یہ حال ہے میرے روم کا۔“ زو بار یہ اس کا اشارہ اچھی طرح سے سمجھ گئی تھیں۔  
”اس گھر میں اتنے ملازم رکھے ہیں مگر کسی کو زحمت نہیں کہ میرے روم کی صفائی ستھرائی کر دے خوب سر پر چڑھایا ہوا ہے آپ نے ان لوگوں کو۔“ حسین آفریدی باقاعدہ ناراض ہو رہا تھا۔  
”ملازموں کو چھوڑو سب سے زیادہ تو میں نے تمہیں سر پر چڑھایا ہوا ہے۔ تمہارے کمرے کی صفائی

کرنے کی ہمت نہ تو مجھ میں ہے اور نہ ہی گھر کے ملازموں میں بقول ان کے جتنی محنت اور جتنا ٹائم وہ اس گھر کی صفائی ستھرائی میں لگا دیتے ہیں اس سے زیادہ ڈبل وقت حسین صاحب کے کمرے کی صفائی میں لگتا ہے اب میں اتنی ظالم اور بے رحم نہیں ہوں کہ ان بے چاروں کو جان کر ستاؤں۔ اس لیے میں نے خود ہی ان لوگوں کو منع کر دیا ہے کہ آج سے وہ صرف یہاں کی صفائی ستھرائی کریں گے کوئی بھی حسین کے کمرے میں نہیں جائے گا۔“  
”موم! ازناٹ فیئر۔“

”نومانی سوئٹ چائلڈ اٹ از فیئر۔ اب سزا یہ ہے تمہاری کہ خود ہی اپنا پھیلا بکھرا کمرہ سمیٹو اسے صاف کرو۔ جب خود کرو گے صفائی تو پتا چلے گا کہ کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔“ زو بار یہ نے پچکارتے ہوئے اس کے سبے سنورے بال بگاڑ دیے تھے۔  
”موم!“ وہ زور سے ہوتے ہوئے چیخا تھا۔

اور یونہی اس کی نظر سامنے اٹھی تھی۔ جہاں لاروش اغولان بیٹھی انہی دونوں کی گفتگو سن رہی تھی اور دیکھ رہی تھی۔

حسین آفریدی نے چند لمحے بغور اسے دیکھا تھا اور پھر جیسے جھموکے سے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا تھا۔  
”آل رائٹ موم! آپ نے تو مجھے ہری جھنڈی دکھا دی مگر میں بھی بہت چالاک ہوں۔“ اس نے زو بار یہ کے گال پر انگلی بجائی تھی۔

”کیا مطلب؟“ زو بار یہ نے نا سمجھی کی کیفیت میں حسین آفریدی کو نکا تھا جو ایک سر و سانس کھینچتا ہوا پلٹا ہوا لاروش اغولان سے چند قدم کے فاصلے پر آٹھرا تھا۔ لاروش اغولان جو حسین آفریدی کو بغور تک رہی تھی، بری طرح جھینپ کے رہ گئی اور اپنی ہرٹی آنکھیں نیچے مار بل کے بنے فرش پر ٹکا دیں۔

”موم! ہمارے گھر میں چونکہ ملازموں کی کمی تو نہیں ہے۔ اس لیے یقیناً لاروش گھر کا کوئی کام نہیں کرتی ہوگی اور نہ ہی آپ اس سے کوئی کام کرواتی ہوں گی۔“ حسین آفریدی پر سوچ انداز میں اس کی جھکی نگاہوں کو تکتے لگا تھا۔

”بالکل درست کہا تم نے اور میں لاروش سے اس گھر کا کوئی کام کراؤں گی بھی نہیں۔“ زو بار یہ، حسین آفریدی کی سوچ بڑھ چکی تھیں وہ تیزی سے چلتی ہوئی ان دونوں کے پاس آ کر رک گئیں۔

”تو ٹھیک ہے آج سے لاروش ہی میرے بیڈ روم کی ساری صفائی کرے گی۔“ بلا جھجک بنا شہوم کے حسین آفریدی نے اس سے پوچھا نہیں تھا بلکہ اپنا حق سمجھ کر حکم صادر کیا تھا۔  
”نہیں ہنی! یہ بہت غلط بات ہے لاروش اس گھر کا کوئی کام نہیں کرے گی۔ لاروش میری بیٹی ہے اور میں اپنی بیٹی سے کوئی کام نہیں کرواؤں گی۔“ زو بار یہ نے سختی سے حسین آفریدی کو کہا تھا۔

”اور جو تمہارے کمرے کی حالت ہوتی ہے اس سے تو مجھے وحشت ہوتی ہے۔ لاروش ٹھہری دھان میں ہی چھوٹی سی ننھی جان تمہارے کمرے کی صفائی کروا کے مجھے اپنی بیٹی کو بیمار نہیں کرنا ہے۔“ زو بار یہ کو حسین آفریدی کی بات بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ وہ بھرپور اس وقت لاروش اغولان کی ہی وکالت کر رہی تھیں۔

”موم! آپ کی یہ چھوٹی سی منھی سی جان نے وہاں کوسٹہ میں اپنے بہت بڑے گھر کو خوب اچھی طرح چمکایا ہوا تھا۔ وہ بھی جتن سمیت مگر یہاں لاروش صرف میرے کمرے کی صفائی کر لے گی آج سے یہ اس کی ذمہ داری ہے۔“

”نہیں ہنی! میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ ٹھیک ہے میں ایک ملازمہ صرف تمہارے کمرے کے لیے رکھوادوں گی۔“

”نوموم! میں کسی پر بھی بھروسہ نہیں کروں گا۔ میرے کمرے کی صفائی اگر کرے گی تو صرف اور صرف لاروش ہی کرے گی۔ بس اب یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ اگر مسئلہ لاروش کی سیلری کا ہی ہے تو میں اسے اپنی پاکٹ منی سے دوں گا۔“

”ہنی۔“ زوباریہ کو حسین آفریدی کا یوں کہنا سخت ناگوار گزارا تھا۔ اور یہاں لاروش اغولان جو حسین آفریدی کے یہاں آنے پر اس سے بات کرنے پر خوش فہمیوں کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ آسمانوں پر اڑنے لگی تھی کہ حسین آفریدی نے اسے یاد رکھا ہوا ہے اس کا نام یاد ہے مگر حسین آفریدی کی آخری بات نے اسے عرش سے فرش پر لانا چاہا تھا اس کے منہ پر زور دار طمانچہ مارا ہوا۔

”آپ مجھے سیلری مت دیجیے گا۔ میں آپ کے کمرے کی صفائی کر دیا کروں گی۔“ لاروش اغولان نے نہایت افسردگی سے کہا تھا۔ زوباریہ نے لاروش اغولان کی افسردگی کو گہرائی سے نوٹ کیا تھا۔

”بس ڈن تو پھر ابھی جائے اور میرے کمرے کی صفائی کر دیں جو بہت زیادہ پھیلا اور بھرا ہوا ہے۔“ حسین.....! زوباریہ نے کچھ کہا چاہا تھا۔

”موم پلیز! لاروش کو کوئی اعتراض نہیں ہے آپ بھی کچھ نہیں کہیں گی اور اب مجھے ذرا ہوری ہے سمیہ زیدی میرا ویٹ کر رہی ہوگی۔ ہم آج ساتھ لچ کرنے والے ہیں۔“

اس کا کام ہو گیا تھا اب اس کا یہاں ٹھہرنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے یہ جاوہ جا کر پیچھے سے زوباریہ آداز ہی دیتی رہ گئی تھیں۔

”موم! بعد میں بات کریں گے۔“ حسین آفریدی تیزی سے باہر نکلا تھا۔

”لاروش! حسین نے جو کچھ کہا ہے اس کی ایک ٹیس سننا اور نہ ماننا تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے حسین کے کمرے کی صفائی کرنے کی۔“ زوباریہ نے لاروش اغولان کو تہیہ کی تھی۔

”ماما! کوئی بات نہیں اور پھر میں سارا وقت فارغ ہی تو بیٹھی رہتی ہوں۔ اچھا ہے کچھ ٹائم ہی کٹ جائے گا۔“ لاروش اغولان نے نرمی سے زوباریہ کے ہاتھ تھامے تھے۔

”میری جان! اگر تم اس کا کمرہ دیکھو گی تو پریشان ہو جاؤ گی۔ حسین بہت پھیلا تا ہے اپنا کمرہ۔ وحشت ہوتی ہے دیکھنے سے ہی۔“ زوباریہ ہر طرح سے اسے منع کرنا چاہ رہی تھیں۔

”ماما! مجھے عادت ہے کام کرنے کی میں کر لوں گی آپ فکر مت کریں۔“ زوباریہ کی مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجائی تھی ورنہ دل تو حسین آفریدی کی باتوں پر بہت دکھا تھا۔

”زوباریہ.....!“ اسی اثناء میں وہاں اپنے کمرے سے بی جان نکل کر آئی تھیں۔

”جی بی جان! کہیے۔“ زوباریہ نے پلٹ کر دیکھا بی جان وہیں آ رہی تھیں۔

”بیٹا! وہ بچہ ہے نا کیا نام ہے اس کا۔ جس کا ایک سیڈنٹ ہوا ہے جو اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔“

”بی جان! میرا خیال ہے آپ زرسل کی بات کر رہی ہیں۔“

”ہاں وہی بچہ صمد بتا رہے تھے اس بچے کو بہت چوٹیں آئی ہیں۔ میں سوچ رہی تھی تم اسپتال چلی جاؤ ابھی ڈرائیور کے ساتھ۔ پھر جب وہ گھر آجائے گا تو میں گھر چلی جاؤں گی اس بچے کو دیکھنے۔“

”جی بہتر بی جان جیسے آپ کا حکم۔“

”ہاں بیٹا! ہمارے نبی کا فرمان ہے کہ مریض کی عیادت کرنے ضرور جانا چاہیے۔“

”جی درست کہا آپ نے بی جان! میں یوں کرتی ہوں ابھی کچھ ہی دیر میں نکلتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے مگر ساتھ فروٹس اور جوس وغیرہ ضرور لیتی جانا۔ یوں خالی ہاتھ جانا کچھ مناسب نہیں لگے گا۔“

”بی جان! آپ نہ بھی کہتیں تو میں یہ سب لازمی لے کر جاتی۔“

”مجھے تم پر یقین ہے زوباریہ۔“ بی جان ہولے سے مسکرائیں۔

”اچھا ایک ضروری کام اور بھی کرنی جانا راستے میں ایڈمی پڑھتا ہے۔ وہاں دینے کے لیے میں نے کچھ کپڑے وغیرہ نکالے ہیں اور ایک دس ہزار کا چیک بھی ہے۔ یہ سب وہاں دیتی ہوئی چلی جانا یہ ہمارا فرض ہے اللہ رب العزت نے ہمیں اتنا نوازا ہے تو ہمیں غریبوں، بے سہارا، یتیموں کا خیال رکھنا چاہیے اللہ بھی خوش اس کا نبی بھی خوش۔“

”ٹھیک ہے بی جان! آپ دے دیجیے میں یہ کام کرتی ہوئی چلی جاؤں گی۔“ زوباریہ نے عقیدت سے بی جان کو دیکھا تھا۔

جب سے وہ شادی ہو کر آئی تھیں انہیں نہیں یاد پڑتا تھا تا کہ بی جان ہر ماہ ایک خطیر رقم اور بہت سے کپڑے وغیرہ دینا بھولی ہوں گی۔ وہ ہر ضرورت مند کی مدد کیا کرتی تھیں۔ ان سے جو ہو سکا وہ کرتی تھیں۔ کسی غریب یتیم لڑکی کی شادی کا سن لیتی تھیں تو پوری شادی کا انتظام یہاں تک کہ اس کا جینز بھی خود ہی دیا کرتی تھیں اور یہی عادت خود زوباریہ نے بھی اپنائی تھی۔ وہ بھی جنکے سے ایسے بہت سے نیک کام کرتی رہتی تھیں۔ جس سے انہیں خوشی ملتی۔ راحت و سکون ملتا تھا اور یہی نہیں اللہ رب العزت نے ان پر ان کے گھر، ان کی اولاد پر بھی بہت کرم کیا تھا۔ بہت کچھ نوازا تھا انہیں اللہ نے جس کا وہ جتنا شکر ادا کرتیں کم تھا۔

زوباریہ بی جان کے کہنے پر ڈرائیور کے ہمراہ زرسل کو دیکھنے اسپتال کے لیے نکل گئی تھیں۔

ادھر لاروش اغولان اٹھی گی۔ حسین آفریدی کے حکم پر آج سے اس کے بیڈروم کی صفائی سہرائی اس کی ذمہ داری تھی۔ جیسے وہ باخوشی قبول کر چکی تھی۔ لاروش اغولان، حسین آفریدی کے کمرے میں داخل ہوئی وہاں کے منظر نے ایک لمحے کے لیے اسے چکرا کے رکھ دیا تھا۔

اف میرے خدا اس قدر گندا کمرہ اس کا، اس قدر پھیلے ہوئے کمرے میں۔ یقیناً اس کا دم گھٹتا ہوگا جب ہی تو اس نے جلدی سے لاروش اغولان کو اپنے کمرے کی صفائی کا حکم دیا اور یہ جاوہ جا۔

(جاری ہے)

## میری کہانی



”تم دونوں کو اور کوئی کام نہیں جب دیکھو ناہیوں  
ڈائجسٹوں میں سر دیئے بیٹھی رہتی ہو۔“ اماں کو غلطی  
پسند نہ تھا لیکن ابا انہیں نہ رد کرتے اور جب جب ماہ نور  
نتاشہ کہتیں وہ لے آتے۔

”نہ گھر کا ہوش رہتا ہے، نہ دنیا کا بس گھسی رہتا  
تم دونوں ان کتابوں میں، ارے میں کہتی ہوں  
جو بسے میں ڈالوان ڈائجسٹوں کو کیا رکھا ہے ان میں  
گھر داری سیکھو۔“

”اماں! اس سے بھی کافی اچھی باتیں سیکھتے ہیں،  
ہم۔“ نتاشہ نے کہا۔

”ارے چپ کر دو کون سی اچھی باتیں اماں کے  
آگے زبانی چلائی ہے بس، یہ لو چائے جا کر ابا کو دے  
آؤ، اور آج رات تک تم دونوں کو میں نے اس  
ڈائجسٹ میں گھسا بیٹھا دیکھا تو میں نے تمہارے ابا  
سے فائنل بات کر لینی ہے اور بند کر دیتا ہے، تم ماہ  
نور جاؤ جا کر ہانڈی چڑھاؤ۔“

ماہ نور کچن میں چلی گئی اور نتاشہ ابا کے پاس۔  
”آؤ، آؤ بچے اور سناؤ اس دفعہ کیا پڑھا؟“ ابا  
نے اس سے چائے کی پیالی لی اور پوچھا نتاشہ سے۔

”ارے ابا! اس دفعہ تو اسنے مزے مزے کے  
انسانے اور ناول آئے مزا آگیا پڑھ کر جیسے کوئی  
”ہلسی نمبر“ ہو اور وہ جو دوسرا ڈائجسٹ تھا اس میں  
صرف آنسو رونا دھونا۔“

ابا ہنستے ہوئے ”اچھا اچھا، تمہاری اماں بڑی  
شکایتیں لگا رہی ہیں تم دونوں کی۔“

”اوہو ابا! کیا آپ اماں حضور کو جاننے نہیں کام  
کر کے بھی کیڑے نکالتی ہیں، گویا ہماری سانس ہوں  
اور ہم ان کی بہو ہیں۔“

دونوں باپ بیٹی ہلسی مذاق میں لگے رہے اور  
ماہ نور کچن میں تجربوں میں لگی رہی اور اماں کے طعنے  
سنتی گئی۔

— x — x —

”ارے نتاشہ! دیکھ اس لمبو کو، اس کی ناک  
طوطے کی چونچ جیسی اور بالوں سے چمپو لگ رہا ہے۔  
ہائے ہمارے دو بے بھائی ہونے والے۔“ وہ لڑکا  
اتنا بھی بُرا نہ تھا جیسا اس کے بارے میں ماہ نور نے  
بیان کیا۔

”ہاں، ہاں سب کیڑے میرے لئے نکالنا، کچھ  
اسنے ہونے والے کے لئے بھی بچا کے رکھو۔“ نتاشہ  
نے بھی جواب دیا۔

”میرے لئے تو خاص بندہ آئے گا۔“ ماہ نور  
نے اتر کر جواب دیا۔

”ہاں واقعی خاص ہو گا کالا سا موٹا سا پہلوان نما  
اور چشمے بھی موٹے موٹے۔“ نتاشہ نے بھی بدلہ لے  
لیا۔

”لا حول ولا قوتہ۔“ میرے ہونے والے کا اتنا  
خوف ناک نقشہ کھینچ ڈالا، دماغ ہو جاؤ اور یہ لوازمات  
لے جاؤ، وہاں سوالات کی پٹاری کھلنے والی ہے۔“  
نتاشہ بھی ڈھیر ساری شرم چہرے پر لے آئی آنکھوں  
کو پٹیٹایا اور ہاتھوں کو لڑکھڑاتے ہوئے ٹرائی باہر لے  
آئی۔

”لڑکا دکھنے میں اتنا برا تو نہیں یہ ماہی بھی نہ اُف  
.....“

”خیر خیر بت سے نتاشہ کا تو رشتہ ہو گیا، اب ماہ  
نور کا کیا کرنا چاہیے۔“ ماہ نور کی اماں جان بولیں۔

”ہاں بیگم! اس کا بھی ہو جائے گا فکر نہ کرو۔“  
اماں ابا ماہ نور کا سوچنے لگے۔

”کیسے نہ فکر کروں، گھر کے کاموں کو تو ہاتھ بھی  
نہیں لگاتیں پتا نہیں کیا بھرا رہتا ہے ان کے دماغ  
میں۔“

”اوہو بیگم صاحبہ! کیوں پریشان ہوتی ہیں آپ،  
ہو جائے گا ان شاء اللہ اس کا بھی۔“ ابا نے تسلی دی۔

کچھ دن بعد ماہ نور کا بھی رشتہ آ گیا، وہ تو  
شکرانے کے نفل پڑھنے لگ گئی کہ جو نقشہ نتاشہ نے

کھینچتا تھا ایسا نہ ہو اور وہ تو چڑا بھی رہی تھی اسے کہ میرا خوبصورت تمہارا چہرہ۔“

— x — x —

دونوں کی شادیاں ایک ساتھ ہوئیں۔ اچھے دن گزرے تھے لیکن ڈائجسٹ کے بناء اوھورے، سرال بھی ایسا ملا جیسا کہ ناولز میں پڑھتی تھیں سخت کیڑے نکالنے والی، نشاہ کی ساس ایسی تھیں پر ماہ نور کی اچھی تھیں سخت وہ بھی تھیں پر طعنے وغیرہ نہیں۔ ماہ نور کی کوئی نندہ نہ تھی، جبکہ ایک چھوٹا دیور تھا، نشاہ بھرے سرال والی تھی، احسن اور ماہ نور اپنی اپنی پسند تقریباً روز ایک دوسرے کو بتاتے تھے جس میں سے ماہ نور کا ڈائجسٹ کا بتانا اور احسن کا چڑنا۔

”کیا ہر وقت ڈائجسٹ ناولوں کی باتیں کرتی رہتی ہو؟ ان کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے میڈم!“ اور ماہ نور چپ ہو جاتی۔ نشاہ یاد آتی گھر یا آتا، کہاں تو ہر وقت وہ ڈائجسٹ میں گھری رہتی تھی اور ادھر تو احسن کو یہ موضوع پسند ہی نہ تھا۔ دوسری جانب نشاہ اور اس کا شوہر حسنین کی ساتھ میں خوب مزے سے گزر رہی تھی۔ ہم مزاج جو تھے، خاص کر ناولوں کے شیدائی دونوں ہر وقت کہانی پر بات کرتے تھے۔

— x — x —

”السلام وعلیکم ماہی! کیسی ہو؟ تم نے تو بھلا دیا ہے یا سرال میں تم ہوتے ہیں؟“ نشاہ نے فون کیا تھا ماہ نور کو۔

”مت پوچھ یار! حال عجیب ہے میرا تم اپنا سناؤ حسنین بھائی کیسے ہیں؟“ ماہ نور نے بے زاری سے جواب دیا۔

”میں تو بڑے مزے میں ہوں حسنین اتنے اچھے ہیں، ارے پتا ہے وہ ہماری پسندیدہ رائٹر ہیں ناں نورین حسنین تو بھی ان کے بڑے مداح لکھے، ان سے تو بس کسی بھی وقت ڈائجسٹ ناولوں کی بات کر لو

وہ تیار ہیں۔“

”کیا بات ہے بھئی اور ادھر تو موصوف کو یہ سب پسند ہی نہیں۔“ ماہ نور نے احسن کا بتایا۔

”کوئی نہیں کچھ ٹائم دو کیا پتا، بعد میں سب ٹھیک ہو جائے۔“

”ہاں یار! چلو میں فون رکھتی ہوں ورنہ سانس نے آکر سناؤنی ہیں۔“

”چلو پھر اللہ حافظ۔“ دونوں نے فون بند کر دیا۔

— x — x —

”کیا لکھ رہے ہیں آپ؟“ ماہ نور نے احسن سے پوچھا۔ احسن نے ایک دم رجسٹر بند کیا۔

”نہیں کچھ خاص نہیں کچھ آفس کا کام تھا۔“

”اچھا میں باہر جا رہا ہوں کام سے۔“ یہ کہہ کر احسن نے رجسٹر بریف کیس میں رکھا اور کمرے سے نکل گیا۔

احسن اکثر یوں لکھتے ہوئے پایا جاتا، جب ماہ نور پوچھتی وہ کام کا بہانہ کر دیتا۔

اس دن اس نے رجسٹر سے صفحے نکالے لفافے میں ڈالنے کے لئے اور درواز میں لفافہ رکھ دیا، ماہ نور کمرے کی صفائی کر رہی تھی اور احسن کی سرگرمیاں بھی دیکھ رہی تھی، احسن حسب معمول باہر نکل گیا، ماہ نور بھی اس کے ڈیک پر آئی اور صفائی کرنے لگی نجمانے اس کے دماغ میں کیا آیا اس نے دراز کھولا اور لفافہ اٹھا کر صفحے نکالے، مارے حیرت کے اس کی آنکھیں پھیل گئیں، اسے تو یقین ہی نہیں آیا اس نے لفافے کے اندر واپس بیچہ زر کے پڑھ لینے کے بعد اور دراز میں رکھ دیئے۔

احسن رات دیر سے آئے جب آئے ماہ نور کو جاگا دیکھا۔

”ارے تم سوئی نہیں؟“  
”آپ کا انتظار کر رہی تھی“  
”اچھا جی خیر ہے ناں! آج کام نہیں کیا تھا

کیا؟ ورنہ تو جلدی سو جاتی ہو۔“

”ہاں کام تھا آپ سے“ ماہ نور نے دوپٹے سے کھینچتے ہوئے کہا۔

”کام تھا خیر اور ایسا کیا تھا؟“ احسن نے بھی حیران ہوتے پوچھا۔

”خیر مت ہی ہے بس اجازت لینی تھی۔“ ماہ نور نے کہہ دیا۔

”اجازت..... کل بھی لے سکتی تھیں اچھا بولو کیا چاہیے؟“ احسن نے ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کی۔

”مجھے نہ آپ ڈائجسٹ لگوادیں، یا لے ہی آئیں دیکھیں میری پسندیدہ رائٹر کی کہانی آنے والی ہے اور مجھے پڑھنا ہے اُسے۔“ ماہ نور نے کہا تو احسن نے منہ لگا ڈوایا۔

”تمہیں منع کیا ہے ناں تم لڑکیوں کو ان کے علاوہ کام نہیں۔“ احسن اٹھ کھڑا ہوا۔

”اور آپ کو کوئی کام نہیں تھا جو ڈائجسٹ میں لڑکی بن کر لکھنے لگ گئے۔“

”ماہ نور.....“ احسن نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”مجھے تو یقین نہیں آ رہا جس رائٹر کی میں اتنی بڑی فین تھی وہ کوئی اور نہیں آپ تھے۔“

”کہاں تو آپ روز اول سے سنا دیتے تھے بلکہ ابھی بھی یہی کیا اور خود؟“ احسن خاموش رہا۔

”اگر لکھنے کا شوق تھا ہی تو کم از کم اپنے نام سے لکھتے اور کہیں اور یہ کیا لڑکیوں والے ڈائجسٹ میں آگے موصوف وہ بھی لڑکی بن کے۔“

”اب کچھ بولیں گے یا نہیں؟“

احسن بیٹھ گیا بستر پر اور گردن جھکا لی۔ ”ماہی! ہاں میں ہی لکھتا ہوں جھوٹ نہیں بولوں گا، لیکن اس کے پیچھے وجہ ہے، میں نے منع کیا تھا کہ گھر والے پسند نہیں کرتے اس کی اصل وجہ مہرین ہے۔“

”مہرین وہ آپ کی کزن؟ پر وہ تو..... اس کا

تو.....“ ماہ نور ہلکی سی۔

”ہاں وہ لکھتی تھی، گھر والوں کو یہ بات پسند نہ تھی تو اس نے چھوڑ دیا۔“

”پھر؟“ ماہ نور نے پوچھا۔

”پھر کیا؟ میں اس کا دوست تھا چھوٹے بھائیوں جیسا اچھے سے جانتا تھا اس کی ہر کہانی کا پلاٹ میرے پاس موجود ہے۔“

”وہ کیسے؟“ ماہ نور نے تجسس سے پوچھا

”اس کا سلسلہ دار ناول چل رہا تھا وہ مجھے ہر بات بتاتی تھی لکھنے سے پہلے پھر بعد میں پڑھتا۔ مجھے بھی شوق ہوتا تھا۔ گھر والوں کے منع کرنے کے بعد اس نے فلمی نام سے لکھنا شروع کیا یعنی ”نورین“ کے نام سے۔ آخری قسط آنے سے پہلے اس کا حادثے میں.....“

”اسی لئے میں نے اس کا کام اسی کے نام سے جاری رکھا تم بتاؤ میں نے غلط کیا؟ اس کی ہر کہانی کا اینڈ میں جانتا تھا۔“

”نہیں آپ نے صحیح کیا پر میرے خیال سے اب آپ کو روک دینا چاہئے آپ نے غلط طریقہ اپنایا۔ وہ مر چکی ہے ادارے والوں کو نہیں پتا پر آپ تو جانتے ہیں اور میں بھی۔“ ماہ نور نے ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔

”ٹھیک ہے یہ آخری ناول ہوگا اس کا یعنی میرا اب خوش؟“ احسن نے کہا۔

”ہاں اور اب مجھے بھی لاویں گے ناں!“ ماہ نور نے بچوں کی طرح کہا۔

”چلو ٹھیک ہے! پر یہ سچ صرف میرے اور تمہارے سچ رہنا چاہئے۔“

دونوں نے اس ناول پر گفتگو کی اور ماہ نور کو یقین نہ آیا کہ اس کا شوہر ڈائجسٹ میں لکھتا ہے۔

”تمہیں کیا پتا ماہی میں نے کیوں لکھنا شروع کیا صرف اور صرف ماہین کے لئے۔“

احسن نے دل میں سوچا اور ماہ نور سے مسکرا کر باتیں کرتا رہا۔☆☆☆

# محببت لہری صواری

”السلام وعلیکم نانوا اینڈ دادا جان“۔ لاؤنج میں  
آکر اس نے سلام کیا تھا۔

”ای کہاں ہیں؟“۔  
”علیکم السلام جیتے رہو مگر یہاں مت بیٹھو میں

جاننا ہوں، تم اپنے دادا کا ساتھ دو گے چیونگک میں،  
کے بڑے میں جو ہو۔ ”انزک حسین“ اُسے صونے  
سے اٹھاتے عظیم صاحب (نانا) نے کہا تھا۔  
”بس انزک فیر،“ میں آپ کا بھی ساتھ دیتا  
ہوں اور یہ صرف میرے دادا نہیں آپ کے بڑے  
بھائی بھی ہیں۔ شاید مصنوعی شکل سے انہیں دیکھا  
تھا۔  
”یار! اصل میں یہ مجھ سے ہارنے سے زیادہ  
تمہاری چیونگک سے ڈرتا ہے۔“ عظیم حسین (دادا  
جان) نے اُسے ہنسی دی تھی۔ تینوں ہنس پڑے  
تھے۔  
”چاہیہ اور جا تم کہاں ہیں؟“ اس نے اپنے بھتیجے  
اور بھتیجی کو ڈھونڈا تھا۔  
”بیٹا تمہاری امی کے پاس سو رہے ہیں، گھر میں  
بنا ہوا پیزا کھانا تھا، جو ملازمہ کو نہیں آتا ضد میں ایسے  
ہی سو گئے۔ تم نے بہت ضدی کر دیا ہے انہیں۔“  
عظیم حسین نے افسردگی سے کہا تھا اور وہ تڑپ کر  
رہ گیا تھا۔





”میری کمزوری ہیں وہ جانتے ہیں آپ، بھائی بھابھی نہیں ہیں، میں تو ہوں۔“ سنجیدگی سے کہتا ان کے کمرے میں گیا تھا۔ پیچھے ان دونوں نے اس کا ڈکھ محسوس کیا تھا کہ یہ مشترکہ دکھ تھا۔

”چائے، چائے، اٹھو ورنہ چاچو ناراض ہو جائیں گے۔“ اس کی دھمکی پر دونوں اٹھ گئے تھے۔

”یار pizza میں کل خود بنا دوں گا، پراس، ابھی ایک گلاس ملک ویتنی لے لو میں بھی بھوکا ہوں پلیز۔“

”مگر آپ بھی پیئیں گے“ چائے نے ایک گلاس اُسے بھی دیا تھا۔

انزک حسین جو بچپن سے دودھ سے الرجک تھا کجا کہ شہد جیسا میٹھا دودھ آج مزے سے پی رہا تھا، انہیں سلا کروہ روم میں آیا تو شدید متلی ہو رہی تھی، بمشکل ٹھنڈے پانی سے کنٹرول کیا کہ اُس کے دوست حارث کی کال آگئی۔

☆.....☆.....☆

”بابا! میں جارہی ہوں آپ زیادہ دیر بیٹھے نہیں رہنے گا، ریٹ سبجے گا در نہیں ہوگی ساتھ ڈنر کریں میں بنا چکی ہوں۔“ ابراہیم نے ان کے سامنے چائے رکھتے ہوئے کہا تھا۔

”ابراہیم کوئی ٹف جاب مت کرنا ابھی اتنا ہے کہ تمہارا گزارا ہو جائے۔“ بہزاد خان نے وہیل چیئر اس کے ساتھ چلائی تھی۔

”مگر کب تک ایک دن تو کرنی ہے نا بابا۔“

”مگر بیٹا تمہاری شادی۔“

”پلیز بابا! وہ نہیں ہوگی آپ جانتے ہیں پہلے تو شاید ہو بھی جاتی مگر اب جو حالات ہیں، پھر ایک رشتہ ٹوٹ جانا سب سے بڑھ کر میرا نقص پلیز مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ سختی سے انہیں ٹوکتی وہ باہر نکل گئی تھی۔

بہزاد خان سوچنے پر مجبور تھے کہ ماں باپ کے مکافات عمل میں اولاد بھی آجاتی ہے۔

☆.....☆.....☆  
”انزک ایک خبر ہے محترمہ ابراہیم خان ولد بہزاد خان جاب کی تلاش میں اس وقت میرے آفس میں، کیا کرنا ہے؟“ حارث نے اسے فون پر مطلع کیا تھا۔

”کرنا کیا ہے پندرہ منٹ ویٹ کروا پھر دل گاڑی لے کر آتا ہے پھر باہر نکلنے دینا آسانی سے میرے پاس ہوگی۔“

اس کی بات پر حارث پریشان ہوا تھا ”انزک دیکھ تصویر تو اُس کے باپ کا ہے تو اُسے کیوں.....“

”تصویر تو ہم میں سے کسی کا بھی نہیں تھا نہ ان کا جو مر گئے نہ ان کا جو مر جانے والوں کی یاد میں زندہ ہیں پھر اُس کے باپ نے کیوں کیا سب“ دکھ غرائی آواز میں کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد شیردل ایک لڑکی کو گن پوائنٹ پر کمرے میں لایا تھا اُسے باہر جانے کا اشارہ دے کر اُس لڑکی کو دکھایا تھا۔

”کون ہیں آپ اس طرح کیوں لایا گیا ہے مجھے؟“ خوف کے باوجود اُس نے ہمت کر کے پوچھا تھا۔

”انزک حسین نام ہے میرا محترمہ! آج سے آپ میری اہمائی ہیں مگر کام آفس میں نہیں گھر میں کرنا ہے، آپ کا ورک ٹائم ابھی سے شروع ہوتا ہے، بخواہ مل جائے گی آپ کی باپ کی اوقات سے بڑھ کر۔“ اس طرح بتا رہا تھا کہ جیسے اس نے جاب کے لئے اپلائی کیا ہو۔

”آپ..... آپ ہیں کون کیسی جاب میں جانتی نہیں ہوں آپ کو اور آپ.....“ جھنجھلاہٹ میں وہ کچھ کہنے سے قاصر تھی۔

”محترمہ! بہزاد خان جانتے ہیں مجھے میں بھی انہیں جانتا ہوں، جو اس وقت اپنے کمرے میں بلیک سوٹ پہنے موجود ہیں آپ بھی جان جائیں گی، فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔“

ابراہیم اس کی ”مطلوبات“ پر سشدر تھی۔ ”میں آفر نہیں دے رہا بتا رہا ہوں تمہیں وگرنہ جو گن میں تمہیں یہاں لاسکتا ہے، وہ بہزاد خان تک بھی جاسکتا ہے۔“

اُس کے مزید قریب ہونے پر وہ پیچھے ہٹی تھی۔ ”اگر آپ کی کوئی دشمنی بابا سے ہے تو مجھ پر اتنا بھروسہ کر کے اپنا گھر اور دو بچوں کو میرے حوالے کیوں کر رہے ہیں۔“ اپنے تئیں اُس نے اس کو ڈرایا تھا اور وہ ہنس پڑا تھا۔

”اپنے باپ کی طرح عیار نہیں ہوتی کسی اور پر بھروسہ کرنے سے بہتر تم ہو کہ تم مرکز بھی کچھ غلط نہیں کر سکتیں۔ اپنے بابا کے لئے۔ بہت ہوگی تفصیل تم چل رہی ہو میرے ساتھ۔“ اسے حکم دیا تھا مگر وہ جگہ سے اُٹھی نہیں تھی۔

”میں ڈرتی نہیں ہوں آپ سے پولیس کو انفارم کروں گی۔“ وہ شدت سے چی پڑی تھی۔

”شیور میرا سیل یوز کر لو سب کے نمبرز ہیں بڑے باپ کی بیٹی ہو، جانتی ہو یہاں کے قانون کو جو صرف امیر کا ہے، ہو گیا ڈرامہ اب چلو، اُسے کچھ کہنے کا موقع دینے بغیر ہاتھ پکڑ کر گاڑی تک لایا تھا، اس قدر تیزی سے آنے پر ابراہیم کی سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔ مگر انزک نے دھیان نہیں دیا تھا گھر تک پہنچنے میں ایک بار بھی اُس کی بہتی آنکھوں کو خاطر میں نہیں لایا تھا۔ گھر میں اسے اہمائی کم گورنس کی حیثیت سے متعارف کروایا تھا۔ چائے اور چائیر تو نہ دیا ہو گئے تھے اپنی نازک سی آنٹی پر بمشکل دن گزار کر رات کو گھر جانے کو تھی کہ لان میں انزک مل گیا۔ محترمہ کل صبح 6 بجے گاڑی آپ کو پک کرے گی، جو کہ دینے کی کوشش شوق سے کرنا مگر پھر اُس کے ہر کسی دھوکے کے لئے کچھ بچے گا نہیں، تمہارے پاس آزمائینا۔“ اُسے وارن کرنا اندر بڑھ گیا تھا۔ اور وہ صرف اپنے ناکردہ گناہ اور بھی نہ بنائے

جانے والے دشمن کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ بابا کو اپنی جاب کی طوالت پر بمشکل راضی کیا تھا ان دنوں زعمی بہت کڑی تھی۔ بابا کی بیماری گھر کا کام سر پر مسلط وہ شخص، بچوں کے کام اپنے ہاتھ سے کرنے ہوتے تھے، اس سب میں وہ اپنی صحت بھول چکی تھی۔ صد شکر کہ ایجوکیشن کے ساتھ شوقیہ کوکنگ کورس کر لیے تھے جو آج کام آ رہے تھے۔ وہ بچوں کے ساتھ کچن میں مصروف تھی۔ انزک اور حارث کو اندر آتا دیکھ کر باہر نکل گئی تھی، وہ ویسے بھی اپنے کام اُس سے نہیں کرواتا تھا۔

”انکل پلیز!“ چائے نے معصومیت سے نکلش حارث کو آفر کئے تھے اس کی ادا پر حارث ہنس دیا تھا۔

”انزک بچوں کے لئے تو بہت کیئرنگ ہے یہ۔“ اس کی بات پر انزک ہنس پڑا تھا۔

”وہ جانتی ہے اگر اس کی جان اپنے بابا میں ہے، تو میری ان دونوں میں، اس لیے تم سمجھ سکتے ہو۔“ اس کی ادھوری بات کا مفہوم حارث کچھ چکا تھا۔

”بیٹا ابراہیم! طبیعت خراب ہے کچھ دنوں کی چھٹی لے لو“ بہزاد خان نے اس کے نیلے پڑتے ہونٹ دیکھ کر کہا تھا کہ اوائل سردی کے دن اُسے ہمیشہ بھاری پڑتے تھے۔

”نہیں کر سکتی بابا! کام کالوڈ بہت ہے، ایک بات پوچھوں؟“ وہ جاتے جاتے رک گئی تھی۔

”آخر 2 سال میں اچانک یہ اتنا بڑا بزنس کیسے کریش کر گیا، سب کیسے اچانک.....“

”کچھ نہیں نصیب بھی کہ سکتی ہو مکافات عمل بھی۔“ وہ افسردگی سے بولے تھے۔

”مکافات عمل مگر ہم نے کسی کے ساتھ برائیاں نہیں کیا پھر.....“

”تمہیں دیر ہو رہی ہے جاؤ خدا حافظ۔“ اُسے سختی سے ٹوکتے وہیل چیئر اندر لے گئے تھے

کسا اگر وجہ بتاتے تو ان کی بیٹی ان سے نفرت کرتی، جو وہ برداشت نہیں کر پاتے۔

آفس سے واپسی پر لان کا منظر دیکھ کر انزک مسکرا اٹھا تھا، نانو اور دادا جان جیسے کھیل رہے تھے ای جاٹم کا سوئیٹر بن رہی تھیں، جبکہ دونوں بچے طوطے کا پتھر پکڑے ابریشیم سے مندر کر رہے تھے کہ اُسے پتھر پر لٹکا دو۔

”انزک! چائے پی لو اور ان کو منع کرو، بچی گر گرا نہ جائے۔“ امی نے اس کو چائے دیتے ہوئے کہا تھا۔

”اتنے پیار سے نہ بلایا کریں ہر ماہ پے کرتا ہوں یہ ان کا کام ہے۔“ اُسے نظروں کے حصار میں لیے بول رہا تھا۔

”بے کرتے ہو تو خرید تو نہیں لیا ناں انسان ہے وہ بھی، کس انداز میں سوچ رہے ہو آج کل۔“ دادا نے اچھی خاصی جھاڑ پلا دی تھی اور وہ سب اتنی دور نہیں تھے کہ وہ سن نہ رہی ہو، پہلے ہی اسٹول پر چڑھنے سے ڈر رہی تھی۔ اب تو مکمل اس کی حسیلی نظروں کے حصار میں تھی، سونے پہ سہاگہ جاٹم نے شدت جذبات میں آکر اسٹول ہلا دیا تھا، زبردست جھج کے ساتھ نیچے آ رہی تھی، مگر انزک اُسے تمام چکا تھا، ابریشیم کی جان سوکھے پتے کی طرح لرز گئی تھی، باقاعدہ اپنا ہاتھ دل پر رکھا تھا، انزک نے اسے کھڑا کر کے ہاتھ چھوڑ دیا تھا، ای کی تو جان نکل گئی تھی اُسے کچھ ہو جاتا تو انہوں نے بچوں کو ڈانٹ دیا تھا۔

”کیا مسئلہ ہے ایک جگہ رکھا تو تھا یہ طوطا، مگر سکون نہیں ہے تم دونوں کو۔“

”ای پلیز!“ انزک نے روکا تھا۔

”سوری آئی۔“ دونوں نے کہا تھا۔

”اِس اِد کے بیٹا! میں ابھی لٹکا دیتی ہوں۔“ وہ پھر سے تیار تھی۔

”رہنے دیجئے محترمہ! میں خود کر لوں گا۔“ اس کی

سانسوں کی بے ترتیبی اسے رحم دلا گئی تھی۔

”اُف تو بہ! کیا ہو گیا ہے لوگوں کو حرص وہوس میں اندھے ہو گئے ہیں اتنا فریب کسی کا بھروسہ نہیں ہے۔“ نانو نے ابریشیم سے اظہار خیال کیا تھا۔ باہر بارش کے باعث سب لاؤنج میں موجود تھے۔

”جی! ٹھیک کہا آپ نے ارے اتنا مختصر سا جواب۔“ انزک نے اس کے جی کہنے پر طنز یہ کہا تھا۔

”حالانکہ آپ کو تو مفصل جواب دینا چاہیے، دھوکہ دینے والوں پر آخر تجربہ بھی کوئی چیز ہے، اور پھر جس کا باپ خود دھوکہ اور فریب.....“

”خبردار.....“ ابریشیم کی برداشت جواب دے گئی تھی۔

”خبردار اگر میرے بابا کو کچھ کہا، میں نے بہت سن لیا اب نہیں دھوکے باز میرے بابا نہیں آپ ہیں۔“

اونچی آواز میں بولنے کے باعث اُس کی سانس اکڑ چکی تھی۔

”جسٹ شٹ اپ تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟“ انزک جارحانہ انداز میں آگے بڑھا تھا۔

مگر دادا جان نے اسے سچ میں روک لیا تھا۔

”کیا بد تمیزی ہے انزک! کسی عورت سے اس طرح بات کی جانی ہے شرم آنی چاہیے تمہیں، اور وہ بچی جو دن رات ہماری خدمت کر رہی ہے، یہ تربیت تو نہیں کی میں نے۔“

دادا جان اور ای نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا اور وہ اُسے سننے سے پہلے ہی باہر لان میں نکل چکی تھی۔

”مجھے یاد ہے سب کچھ، وہ بھی جو آپ نے سکھایا وہ بھی جو اُس کے باپ نے کیا ہے۔“ لہو پشیمانی نظروں سے اُس نے دروازے کو گھورا تھا، جیسے وہ ابھی بھی وہاں موجود ہو۔

”کیا کیا ہے اُس کے باپ نے، کیا کہہ رہے ہو تم؟“ نانو نے حیرت سے پوچھا تھا۔

”یہ بہزاد خان کی بیٹی ہے جانتے ہیں نا آپ کیسے بھول سکتے ہیں ہم سب اُسے۔“

”تم جانتے ہو پھر بھی اُس لڑکی کو جاٹم اور جاٹہ کی ذمہ داری دی، کیا سوچ کے؟“ دادا جان نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

”وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتی بہت کچھ دھندلا ہے، اس کے سامنے، نہ میں نے کچھ بتایا ہے اور اس کا باپ تو مر کر بھی نہیں بتا سکتا۔“ اُس کے جواب پر ای تڑپ اٹھی تھیں۔

”انزک! پھر ابریشیم کا کیا قصور ہے، وہ معصوم سزا کیوں بھگت رہی ہے؟“

”ای! قصور تو کسی کا بھی نہیں ہے، مگر پھر بھی گھر سے تین جنازے میں نے اٹھائے ہیں، پلیز یہ سب میرا ہینڈل ہے۔“ ان سب کو خاموش کروانا وہ باہر نکل گیا، ارادہ باہر جانے کا تھا، مگر لان میں آکر ٹھٹھک گیا تھا۔ شدید بارش میں ابریشیم کی گھاس پر بے سدھ پڑی تھی، وہ نا چاہتے ہوئے بھی اُس تک آیا تھا، قریب آکر اُس کے ٹھنڈے وجود اور نیلے ہونٹوں نے اسے ڈرایا تھا۔ فوراً اٹھا کوزا اندر لایا تھا اور اپنے جیلی ڈاکٹر کو کال کیا تھا۔

”اُسے کچھ ہو تو تم ذمہ دار ہوں گے۔“ ای نے وارن کیا تھا۔

”اوہ پلیز! کچھ نہیں ہوگا بے وقوف لڑکی سردی کی بارش میں بھیک رہی تھی۔“ اس کی حالت دیکھ کر پریشانی میں اچھا خلاصہ جھنجھلا گیا تھا۔ اُسے اٹھا کر لانے میں اس کے اپنے کپڑے بھی بھنگ چکے تھے۔

”مسٹر انزک! اتنی لاپرواہی انیس شدید ایک ہو سکتا تھا، ان کی ہارٹ بیٹ بند ہو سکتی تھی، ان کے لیے تو گرمی کی بارش نقصان دہ ہے کجا ہے یہ سردی تو ان کی جان لے سکتی تھی۔“ ڈاکٹر کی بات پر وہ سب

حیران ہوئے تھے۔

”کیا بیماری ہے اسے؟“ انزک نے حیرت سے پوچھا تھا۔

”یہ آپ کے گھر میں ہیں اور آپ کو نہیں پتا، یہ ہارٹ پیسٹ ہیں، ان کے دل کا والو بند ہے۔“ ان کی بات پر انزک کے قدموں سے زمین نکل گئی تھی۔

”آپ کیسے جانتے ہیں ڈاکٹر صاحب؟“

”میں بہزاد خان کا جیلی ڈاکٹر بھی ہوں، کافی عرصے سے ان کا کنسلٹنٹ ہوں، وہ تو ابریشیم کو زیادہ چلنے بھی نہیں دیتے، بہر حال آپ لوگ احتیاط کریں، میں میڈیسن لکھ دیتا ہوں شام تک تجھے انفارم کر دیجئے گا۔“

ای باقاعدہ رو رہی تھیں۔

”انزک! کیوں کیا تم نے ایک معصوم کے ساتھ آخر یہ سب کیا ہے میرا ذہن ماؤف ہو گیا ہے۔“ اسی اثناء میں ابریشیم نے سکاری بھری تھی۔

”بابا.....“

”ابریشیم بیٹا! آنکھیں کھولو، اب کیسی ہو تم؟“ امی نے اس کا ہاتھ چوما تھا۔

ابریشیم کی نظر انزک پر پڑی تھی، فوراً ہی اٹھ کر چادر ہٹا کر دوپٹہ درست کیا اور باہر جانے کو کھڑی ہو گئی تھی۔

”بیٹا! کچھ دیر آرام کر لو، میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گا۔“ دادا جان نے اُسے روکا تھا۔

”نہیں بابا! میرا ویٹ کر رہے ہوں گے۔ آپ کی اجازت ہو تو میں جا سکتی ہوں۔“ اُس کے رو برد چھٹنا ہوا سوال کیا تھا، جو اُسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا، جس کی سانسیں ابھی تک ناہموار تھیں، خوبصورت ہونٹ سخت نیلے تھے، اُن پر موجود گل بھی آج افسردہ تھا۔

”چلو، ہم سب ساتھ چلتے ہیں، تاکہ تمہارے بابا کی تکلیف اور ہمارے دکھ تمہاری الجھن ختم ہو سکے۔“ نانو نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا جلدی میں ای نے

اُسے انزک کی مثال ہی دے دی تھی، جسے وہ پہچان گیا تھا۔ مگر بولا کچھ نہیں کہ ابھی کچھ بعید نہ تھی وہ سخت سردی میں اتار دے۔

ایریشیم کو عجیب لگا تھا جانے کیوں سکر رہے ہیں سب کچھ کر کے بھی؟ دادا جان ڈانٹ کر انزک کو اندر لے آئے تھے۔ مجبوراً وہ آیا تھا بہنر ادخان ڈر گئے تھے، ایریشیم کی حالت دیکھ کر۔

”عظیم صاحب آپ یہاں کیسے؟“  
حیرت کا مقام تو تھا۔ دادا جان اور نانوں نے مختصر انہیں ایریشیم کی جانب اور انزک کے رویے کا بتا دیا تھا۔  
”بابا اب آپ بتائیے اپنا وہ گناہ جس کی لپیٹ میں میں بھی آگئی۔“

”بیٹا! انزک کے بڑے بھائی ازان میرے پرنس پارٹنر تھے، میں نے انہیں دھوکا دیا اور وہ اتنے غلط اور سادہ تھے کہ مجھے محنت نہ کرنی پڑی، اُن کا پرنس تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اسی ڈپریشن میں ایک ایکسڈنٹ میں وہ انتقال کر گئے، بخدا میں ایسا نہیں چاہتا تھا مجھے بعد میں افسوس ہوا مگر.....“

”مگر آپ کے افسوس سے ہمارا نقصان پورا نہیں ہوتا بہنر ادخان! کیونکہ اس گاڑی میں میری بھابھی بھی موجود تھیں، اس صدمے سے بابا، ہمیں چھوڑ گئے، ہم تو پھر بھی جی لیں گے مگر ان دو معصوم بچوں کا کیا کریں، جو بے تحاشہ محبتوں کے باوجود دن یا رات کے کسی بھی پہر اپنے ماں باپ کو ڈھونڈتے ہیں، اس سب کے ذمہ دار آپ ہیں، میں آپ کو قطعاً معاف نہیں کروں گا۔“

سرخ چہرے کے ساتھ بہنر ادخان کے ساتھ وہ ایریشیم کو بھی وارن کر رہا تھا۔

”جواب میں تم بھی بہت کچھ کر چکے ہو انزک!“  
”میں نے کیا کیا ہے امی؟“ معصومیت کی انتہا کی۔

”ہاں آپ نے ابھی کیا کیا ہے، بس اپنے بھائی

کے پرنس کو سنبھالا اور میرے بابا کو برباد کر دیا، میرے باپ کے دیوالیہ ہونے کی خبر میری شادی سے تین دن پہلے آپ نے میرے سرال پہنچائی، میری شادی ختم میں مایوں کے زرد سوٹ میں بابا کے ساتھ ہاسپٹل میں تھی، بابا پیرالائزڈ ہو گئے اور پھر میرے ساتھ جو کچھ کیا آپ نے پھر بھی آپ.....“  
مستل بولنے سے وہ ٹھک گئی تھی۔ وہ صونے پر ڈھکی تھی۔

”انزک! انتقام میں امدھائیں ہونا چاہیے۔“  
نانوں نے اسے تھام کر کہا تھا۔

”انزک میں تم سے اور آپ سب سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں۔“

”ہم کون ہوتے ہیں مزادینے والے یہ اللہ کا کام ہے ہم نے معاف کیا اللہ بھی کرے گا۔“ دادا جان نے ان کے ہاتھ تھام لیے تھے کچھ ہی دیر میں بہنر ادخان اور دادا جان کا اعلان اُن دونوں کو ہلا گیا تھا۔

”پلیز یہ نہ کریں میرے ساتھ دادا جان پلیز۔“ انزک سے پہلے ہی ایریشیم بول اٹھی تھی۔

”ایر! کیا ہماری اتنی بھی عزت نہیں ہے کہ جو فیصلہ تم سے پوچھے بغیر لیا اس کا مان رکھ لو۔“

بہنر ادخان کی جگہ دادا جان نے اُسے منایا تھا کہ خدشہ تھا باپ بیٹی کے آنسو برداشت نہیں کر پائے گا۔  
نانوں نے انزک کو کندھوں سے تھاما تھا۔

”نانو پلیز!“ اس کا لہجہ بہت بے بس تھا۔

”انزک کیا ثابت کرنا چاہتے ہو خود مختار ہو، ہمارا کوئی حق نہیں تم پر تو ٹھیک ہے ہم دست بردار ہوتے ہیں۔“

وہ دادا جان اور امی کی بلیک میلنگ میں آ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایک ہفتے بعد وہ انزک کے بیڈروم میں موجود تھی، زور تو کیا ہونا تھا عجیب بے بسی کی حالت تھی۔ اس کا انتظار کیے بغیر چھینچ کر چکی تھی، امی نے لان میں اپنے

ہندسہ ڈھنگ بیٹے کو دیکھا تھا، جو خفا خفا بہت پیارا لگ رہا تھا۔

”میری جان! ازان کے بعد میرا گل سرمایہ تم ہو، جو کچھ ہوا بھول جاؤ، اب بہت معصوم بے قصور ہے۔“ اس کا چہرہ اٹھوں میں بھرا تھا۔

”وہ بہنر ادخان کی بیٹی ہے۔“

”تم میرے بیٹے ہو میں یہ جانتی ہوں، تم دیے بھی اس کا بہت نقصان کر چکے ہو، وہ خطرناک بیماری میں ”سفر“ کر رہی ہے۔ اس کا خیال کرنا، میرا بیٹا نفرت نہیں محبتوں سے بنا ہے اسے محبت دو، وہ غصے میں ہے حق پر بھی ہے، نادان مگر میچور ہے کبھی دیکھا ہے بھولی سی صورت ہے۔“

”اجھا امی! بس کچھ نہیں کر رہا آپ کی بھولی معصوم بچی کو آپ آرام کریں، اب میں جنکس ہو رہا ہوں۔“ وہ ہلکے سے ہنس دیا تھا۔

”ایریشیم“ وہ جو موہاگل سرچ کر رہی تھی، پہلے ہی اس کے سامنے بیٹھنے سے زور نہ لیا اب محترمہ یا طنز کے بغیر نام سن کے عجیب ہی ہو گئی تھی۔

”ہم سب کچھ بھلا کر ایک نیا سفر شروع کر سکتے ہیں کیا خیال ہے؟“ نرمی سے اسے اختیار دیا تھا۔

”کچھ شروع نہیں ہوا بابا کی وجہ سے سب کیا ہے میں نے، پہلے آپ سے اپنا پرنس واپس لوں گی، جس کے لیے بینک سے لون بھی آپ اپر دو کر دالیں گے، میں آپ کا قرضہ واپس کر دوں گی، تب ہی کچھ ہو سکتا ہے۔“

وہ حیرت سے اُسے بن رہا تھا، دنیا کا آٹھواں عجوبہ شادی کی پہلی رات پرنس ڈیل کر رہی تھی۔

”اگر میں ایسا کچھ نہ کروں تو۔“ انزک کی تیوری پڑھ گئی تھی۔

”تو ایک کمرے میں رہتے ہوئے بھی آپ کبھی مجھے حاصل نہیں کر سکیں گے۔“ اسے جتنی اسٹڈی روم میں چلی گئی تھی، کچھ دیر تک تو وہ کھولتا رہا مگر پھر

ہنس پڑا۔  
”آئی ٹھیک کہتی ہیں معصوم تو ہو اور عقل سے پیدل بھی۔“

کچھ ماہ گزرے کہ امی نے ٹوک دیا ”انزک آج اب کو باہر لے جاؤ کہیں نہیں جاتے تم لوگ۔“

”میں تو کہتا ہوں آپ کی بہن نہیں جاتی۔“ مزے سے اُسے تپایا تھا۔

”ایر فوراً اٹھو تیار ہو جا کر“ امی اچھی طرح سب سمجھ رہی تھیں۔

”جائٹ اور جائیہ کو بھی تیار کر لوں؟“ اس نے معصومیت سے کہا تھا۔

”زیادہ چالاک مت بنو ایر“ امی نے سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔

سب کے سامنے اس کی سرزنش انزک کا ڈھیروں خون بڑھا گئی تھی۔ سلیتے سے سر پر دوپٹہ اوڑھے ڈریسنگ سے اٹھی تھی کہ انزک پیچھے آکھڑا ہوا تھا، اس کا اس قدر قریب ہونا ایریشیم کو ڈرا گیا تھا، ایک ہاتھ سے اس کا راستہ بند کر کے دوسرے سے پر فوم اٹھایا تھا، وہ کھل اس کے حصار میں بمشکل اپنا آپ سنبھال رہی تھی، اس کی حالت کو

انجوائے کرتا اپنے ساتھ اُس پر بھی اسپرے کیا تھا اور اُسے بغور دیکھا تھا، جس کی پلٹس لرز رہی تھیں، ہلکے سے ہنس کر ہاتھ کے اشارے سے باہر جانے کی اجازت دی تھی۔ ایریشیم میں جیسے جان آگئی تھی سر پیٹ باہر نکلی تھی۔ مگر انزک کی حرکت اسے بھاری پڑی تھی اور وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے باہر نہ گئی تھی اور وہ صرف لان میں بیٹھ کر ہنستا رہا تھا۔

جانی سردی اپنا اثر دکھا رہی تھی اُس کے لیے سب پریشان تھے۔

”چی! آئی پراس میں آپ کو تنگ نہیں کروں گا، جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔“ اُن دونوں کی تو جان تھی اپنی چچی میں۔

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویب سائٹ

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم کوالٹی، نارل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✧ ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرف نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں، ہر ای بک سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں [www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر مستعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)

”نہیں ہوں میں، دیکھو کہ باز نقرت ہے مجھے اس لفظ سے، آپ خود کو سب سے بہتر سمجھتے ہیں، لگتا ہے محبت صرف آپ کر سکتے ہیں میں نہیں آخر کیوں میں نے بھی کی ہے محبت انزک“ بے اختیار آنسوؤں کے ساتھ چہرہ ہاتھوں میں چسپائے اس کے کندھے سے لگ گئی تھی۔

انزک کے لیے اس کا اظہار ہی آپ حیات تھا، کجا کہ اس کے آنسو جھٹکے سے اُسے سانسے کیا تھا۔

”کس سے کیا ہے مجھے بھی بتاؤ“ انتہائی سنجیدگی سے پوچھا تھا، نگاہوں کی شوخی اور تشویش کو پزل کر گئی تھی۔

”تنگ مت کریں مجھے۔“

”کیوں نہ کروں حق رکھتا ہوں اور ابھی کچھ کیا ہی نہیں ہے۔“ آنکھوں میں جھانکتا بہت ٹھنڈا نم دے رہا تھا۔

”میں چلی ہی جاتی ہوں بابا کے پاس۔“ وہ گھبرا گئی تھی۔

”خبردار، خبردار تم میری ذمہ داری ہو، ذرا ٹھیک ہو جاؤ بہت سے بدلے لینے ہیں۔“

ایک ماہ کے طویل انتظار کے بعد کامیاب آپریشن کروا کے گھر آگئی تھی وہ۔

”محترمہ! بہت آرام کر لیا اب اٹھ جائیں۔“ انزک نے اس کے بیڈ ریٹ پر چوٹ کی تھی۔

”امی! دیکھیں۔“

”کیا دیکھیں میری امی ہیں محترمہ۔“

”مت تنگ کرو انزک! میں سوپ بیچ رہی ہوں اس کے لیے ابھی۔“ اُسے ڈانٹتی وہ باہر نکل گئی تھی۔

”میں تو پہلے کچھ کرتا بھی نہیں تھا صرف کہتا تھا، تو تم بھاگ جاتی تھیں اب کیا ہوگا تمہارا میرے قبضے میں ہو۔“ اس کے قریب بیٹھ کر اُس کو ڈرایا تھا، اُس کی ہوائیاں اڑ گئی تھیں مکمل سر سے پاؤں تک تان لیا تھا، اُس کی حرکت پر انزک قہقہہ نہ روک سکا تھا۔

☆.....

”ٹھیک ہوں میری جان! آپ پریشان نہ ہوں۔“ اس نے تسلی دی تھی۔

”ڈاکٹر شاہ سے میری تفصیلاً بات ہو چکی ہے جلد از جلد آپریشن ہونا ہے۔“ انزک نے امی کو بتایا تھا۔

”نہیں میں نے پہلے بھی کہا تھا میں خود.....“

(سٹ اپ) انزک نے خاموش کروا دیا تھا، جسے ضد تھی کہ انزک کا احسان نہیں لینا۔

”اپنا علاج خود کروانا ہے بہت سن لی ہے تمہاری بکواس، امی! آپ اسے سمجھا دیں کلن تک، ورنہ آپ مجھے جانتی ہیں۔“ غصے سے دروازہ بند کر کے نکل گیا تھا۔

رات گئے گئے میں آیا تھا اور اس کی نرمانش بے یقینی سے سن رہا تھا۔

”کیا کہا تم نے؟“

”میں نے کہا آپ مجھے چھوڑ دیں، میں نے بابا کا بزنس کافی حد تک اسٹیبلش کر لیا ہے، اب کوئی وجہ نہیں ہے آپ کے ساتھ رہنے کی ایک انتقام آپ نے لیا، یہ میرا انتقام ہے میں بابا کے پاس جا رہی ہوں۔“

چند قدم اٹھے بڑھی تھی کہ انزک نے سچ کر بیڈ پر بٹھایا تھا، بیڈ کراؤن پر ہاتھ رکھ کر اسے مجبور کر دیا تھا۔

بہت مشکل تھا اس کی لہو چھلکانی آنکھوں میں دیکھنا۔

”کیا ہو تم تین مہینے میں بزنس مل گیا تو تمہارا کمال ہے، میں خود اپنے کنٹریکٹ دیے ہیں تمہیں ورنہ پوچھنا اپنے باپ سے کتنا مشکل ہے، ابھی میں نے کچھ کیا ہی کہاں تھا وہ تو شروعات تھی جہاں میں رک گیا اور تم کس خوش فہمی میں ہو، بڑا زعم ہے اپنی ذہانت پر چاہتا تو کیا نہیں کر سکتا تھا تمہارے ساتھ، ایک جھٹکے میں کل سیدھی کر سکتا ہوں میری دسترس میں ہو، میری ملکیت ہو تم، اگر جانا ہے تو جاؤ ارے تمہاری سرشت میں دھوکا ہے، کہ محبت کرنا جانتی ہی نہیں ہو ڈیم اٹ۔“

اپنا غصہ سائیزڈ ٹیبل پر اتارا تھا وہ جو پہلے ہی حقیقت حیثیت اپنی ناکام گو کشمیں جان کر سکتے تھے چھنا کے کی آواز پر دہل گئی تھی۔



مریم ماہ میر

افسانہ

## پہلی شہینہ

وہ گہری نیند میں تھی کہ موبائل پر بیل سے اس کے سوتے وجود میں جنبش ہوئی۔ اس نے کروٹ بدلی اور سر ہانے کی دوسری جانب پڑے موبائل پر اندازے سے بند آنکھوں سے ہاتھ مارا۔ اگلے ہی لمحے موبائل



اس کے ہاتھ میں تھا۔  
بمشکل نیند سے بوجھل پلکیں کھولیں۔ ادھ کھلی  
آنکھوں سے اس نے موبائل اسکرین پر نظر ڈالی۔  
روشن اسکرین پر فراز Calling لکھا آ رہا تھا۔  
Yes کا بٹن دباتے ہی اس نے موبائل کان سے  
لگایا۔

”ہوں۔“

”سورہی ہو۔“

”نہیں..... سورہی تھی۔“ ابھی ابھی ہی آواز میں  
وہ بولی۔  
اس کی بات کے جواب میں اسے ہلکے سے ہنسنے کی  
آواز سنائی دی۔

”کیسے ہیں آپ؟“ نیند سے بوجھل آواز میں اس  
نے پوچھا۔  
”ٹھیک ہوں۔“

”خیریت ہے..... فون کیا آپ نے؟“  
”ہوں، کیا تو خیریت سے ہی تھا۔ بلکہ as a  
reminder تمہیں کال کی ہے۔“  
”reminder؟“ ابھی اس کے حواس گہری  
نیند سے پوری طرح نہیں جاگے تھے اس کے باوجود وہ  
چونکی۔

”فرازہ بھول گئی نا؟“  
”کیا؟“ اس نے حواسوں پر زور دیا۔  
”مجھے معلوم تھا کہ تم بھول جاؤ گی۔“  
”او..... ہاں وہ بس بھولی نہیں تھی لیکن آنکھ لگ گئی  
تھی۔“ ذہن پر زور دیتے اسے یاد آ ہی گیا۔  
”جلدی سے تیار ہو جاؤ میں ایک گھنٹے میں آ رہا  
ہوں۔“

”پلیز فراز! آپ ہی چلے جائیں نا۔“  
”یار! میرے دوست کی شادی ہے اور تمہیں اس  
نے Specially انوایٹ کیا ہے۔“  
”اور دوستوں کی بھی شادیاں ہوئی ہیں لیکن آپ

نے کبھی اسے ضد نہیں باندھی۔“ فراز کے ساتھ ہنسنے  
نے اس کی پلکوں سے نیند بھگادی تھی۔  
”اچھا ہے تمہارا سوڈ بھی اچھا ہو جائے گا۔“

”میرا سوڈ ابھی بھی اچھا ہے۔“  
”اور زیادہ اچھا ہو جائے گا۔“  
”اب میں تنگ ہو رہی ہوں۔“ فراز کو بھرتے کے  
سوڈ میں دیکھ کر وہ جھنجھلائی۔

”میں خود ہی تنگ کر رہا ہوں۔“ دوبدو جواب آیا  
تھا اور ساتھ میں فراز کی خوشگوازی بھی اس کے کان  
کے پردے سے ٹکرائی تھی۔ جواب میں وہ خاموش  
رہی۔

”اچھا جلدی سے اٹھو، تیار ہو بس میں پہنچ ہی رہا  
ہوں۔“

”اب اٹھ بھی جاؤ۔“  
”اٹھ تو گئی ہوں اور کیسے اٹھوں؟“  
”ابھی کہاں ہیں آپ؟“  
”دوپہر کے ساڑھے تین ہو رہے ہیں ظاہر ہے  
اس وقت آفس میں ہوں گا۔“

”ابھی ساڑھے تین ہی ہوئے ہیں۔“ یہ کہنے کے  
ساتھ ہی اس کی بیڈ کے ساتھ ٹیبل پر بڑی کلاک پر نظر  
گئی۔ ساڑھے بارہ کے قریب وہ بچن سے نکلی تھی۔  
کام والی ماسی سے اس نے بچن کے Cabinet کی  
صفائی کروائی تھی اس لیے وہ خاصی تھک گئی تھی، ماسی کو  
بھیج کر وہ کمرے میں آ کر تھکن اتارنے کی غرض سے  
بیڈ پر لیٹی تو اس کی آنکھ لگ گئی جواب فراز کی فون کال  
سے نکلی تھی۔

”اچھا میں اب فون رکھتا ہوں۔ آفس کا کام بھی  
ختم کرنا ہے، پھر گھر آ کر بات کرتا ہوں؟“  
”جی اوکے۔“ یہ کہنے کے ساتھ ہی کال کٹ گئی۔  
وہ بیڈ پر پیر لٹا کر بیٹھ گئی۔  
فراز کے قریبی دوست ثاقب کی شادی تھی۔

ثاقب کا گھر آنا جانا تھا۔ اس لحاظ سے اس کی فائزہ  
سے بھی اچھی خاصی سلام دعا بھی۔ تبھی جب ثاقب کی  
شادی کا ذکر آیا تو بطور خاص اس نے فائزہ کو بھی اپنی  
شادی کی تیاریوں میں شامل کیا۔

فراز کو اچھی طرح سے فائزہ کی فطرت کا علم تھا کہ  
وہ زیادہ gathering میں جا اavid کرتی  
ہے اس لیے اس نے کبھی بھی اسے فنکشن پر جانے پر  
اصرار نہیں کیا تھا لیکن اس مرتبہ فائزہ کے بقول وہ ضد  
پر اتر آیا تھا کہ ثاقب کی شادی کے تمام فنکشنز اٹینڈ  
کرنے ہیں۔

خود فائزہ کی فراز سے شادی ایک اتفاق تھی۔ وہ  
مٹائی کالج میں اردو کی ٹیچر تھی کہ اسے سال بعد ہی  
اس جاب سے ریٹائرمنٹ کرنا پڑا۔

ان دنوں اسے جاب کی ضرورت تھی تو وقتی طور پر  
اسے ایک آفس میں اسٹنٹ سیکریٹری کی جاب کی  
آفر آئی تو اس نے قبول کر لی۔ وہیں پر اس کی  
ملاقات فراز سے ہوئی جو کبھی کے مالک کا بیٹا اور  
سیکرٹری کے طور پر کام کر رہا تھا۔ کچھ ہی ماہ بعد اعجاز  
صاحب جو فراز کے والد تھے انہوں نے اس کے  
سامنے فراز کا پروپوزل رکھا۔ فائزہ نے سب کچھ  
اپنے والدین پر چھوڑ دیا اور مزید چند ماہ بعد وہ فراز کی  
بیوی کی حیثیت سے اعجاز صاحب کے گھر ان کی بیوی  
بن کر چلی آئی۔

☆.....☆

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑے  
اپنے بالوں کو برش کر رہی تھی کہ اسے مین گیٹ کھلنے  
اور گاڑی گیراج میں داخل ہونے کی آواز سنائی  
دی۔ کچھ ہی دیر میں اس نے ہارن کی آواز سنی گویا  
فراز اسے اپنے آنے کی اطلاع دے رہا تھا۔ فائزہ  
نے برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا۔ آئینے میں ایک نظر  
اپنے سر اے پر ڈالی اور دائیں کندھے پر جھولتے  
کامدانی دوپٹے کو دونوں ہاتھوں سے ٹھیک سے

کندھے پر شرٹ سے پن اپ کیا۔ ابھی وہ مڑنے  
ہی لگی تھی کہ بیڈروم کا دروازہ کھول کر فراز کمرے  
میں داخل ہوا۔ شیشے میں فراز کا سراپا دیکھ کر وہ مسکرائی  
تھی اور پلٹ کر بولی۔

”کیسے ہیں؟ میں آپ ہی کا ویٹ کر رہی تھی۔“  
جواب میں فراز خاموش نظروں سے ہونٹوں پر  
مسکراہٹ سجائے اسے دیکھتا رہا۔

اس کی نظروں میں اپنے لیے سٹائش پا کر وہ پلکیں  
جھکا گئی اور تیزی سے اپنی جگہ سے مڑی۔  
اس کا گریز سمجھ کر فراز کے ہونٹوں کی مسکراہٹ

گہری ہوئی تھی اور وہ شرارتی انداز میں اس پر نگاہ  
ڈال کر وائش روم میں گھستے ہوئے بولا۔  
”ابھی جانے کی جلدی نہ ہوتی تو کچھ تفصیل سے  
باتیں ہوتیں۔“ انداز میں والہانہ پن تھا۔

”اچھی بات ہے۔ میں ہال میں آپ کا ویٹ  
کر رہی ہوں جلدی آجائے گا۔“ دوبدو شرارتی انداز  
میں فائزہ نے جواب دیا۔

”جلدی کیوں بھئی میں تو آرام سے آؤں گا۔  
ویسے بھی ابھی کہاں ٹائم ہوا ہے۔“  
”جلدی جائیں گے تو دائیں بھی جلدی آئیں  
گے نا۔“

”خدا کا نام ہے فائزہ! ابھی گئے بھی نہیں اور  
تمہیں واپس آنے کی جلدی ہے۔“

”آپ کو پتہ تو ہے میرا۔“  
”ہوں جانتا ہوں تمہیں، کتنی آدم بیزار ہو۔“  
”آدم بیزار.....!“ وہ کھٹکتی سے زیر لب مسکرائی  
تھی اور دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ دھرے ہلکے  
سے دبا کر دروازہ کھولا۔

”آجائے گا جلدی۔“  
”ہوں اچھا۔“  
اس کا جواب سنتے ہی وہ دروازہ بند کیے کمرے  
سے باہر نکل گئی۔ اگلے ایک گھنٹے میں ہی وہ دونوں

ثاقب کے گھر موجود تھے۔ گھر کے مین پلاٹ میں سیٹنگ ارنج منٹ کیا گیا تھا جہاں سب مہمانوں کے اکٹھے ہونے کا انتظار تھا کہ بارات چل پڑتی۔ فراز، ثاقب کے ساتھ موجود تھا۔ وہ آہستہ قدم اٹھاتی پلاٹ میں دھری کرسیوں کی جانب چلی آئی جہاں مہمان خواتین کے بیٹھنے کے لیے انتظام کیا گیا تھا۔ اگلے آدھ گھنٹے میں ہی بارات چلنے کو تیار تھی۔ وہ بھی فراز کی جانب چلی آئی۔ فراز نے اسے اپنی جانب آتے دیکھا اور پھر اس کے قریب آنے پر بولا۔

”چلیں ہم بھی۔“

”جی۔“ اس نے کہتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور وہ دونوں ساتھ قدم اٹھاتے پارکنگ لائٹ میں کھڑی گاڑی کی جانب چلے آئے۔

”سب ٹھیک رہا؟“

”ہوں..... جی۔“ فرنیٹ اسکرین سے باہر کے منظر پر نگاہ جماتے فائزہ نے جواب دیا۔

”اور مہمانوں سے ملیں؟“ فراز نے گاڑی دوسرے گیت میں ڈالی۔

”کوئی خاص نہیں۔“ فائزہ کا لہجہ سرسری سا تھا۔

جواب میں وہ بھی خاموش ہو گیا۔

ثاقب کا رشتہ اپنی ناموں زاد کے ساتھ ہو رہا تھا۔ لڑکی والوں کا گھر گاڑی سے تقریباً پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔

رسم درواج کے مطابق لڑکی والوں نے بارات کا بہت ہی خوش اسلوبی سے استقبال کیا۔ نکاح کے بعد کھانے کا انتظام بھی گھر کے لان میں ہی کیا گیا تھا۔ اس کا زیادہ کھانے کو من نہیں تھا۔ دوپہر میں بھی خاصا پیٹ بھر کے کھایا تھا ابھی تک وہی ٹھیک طرح سے ہضم نہیں ہو پایا، ہلکا سا سلا دلینے کے بعد وہ کولڈ ڈرنک لیے واپس اپنی جگہ پر آگئی اور کولڈ ڈرنک کے بلکے سب لینے کے ساتھ ساتھ وہ ارد گرد آئے مہمانوں کو دیکھنے لگی۔

”فائزہ!“ اسے کسی کی پکار اپنے کان میں سنائی دی۔

اپنی دائیں جانب مڑ کر دیکھا اور اگلے ہی لمحے دائیں جانب کھڑے وجود پر اس کی نگاہیں اٹک گئیں۔

”فائزہ.....! کیسی ہو؟“

جواب میں وہ ساکت تھی۔ یقین اور بے یقینی کے درمیان سفر کرتی سوچیں اور تصور لیے وہ اس وجود پر نگاہیں ٹکائے ہوئے تھی۔ زندگی میں وہ پانچ سال پہلے اپنے سامنے کھڑے وجود سے ملی تھی۔ پانچ سال کا سفر دونوں نے ہی طے کیا تھا لیکن اس کے سامنے کھڑے وجود کے چہرے پر اداسی اور غم کی پرچھائیاں تھیں تو اس کے چہرے پر خوش حالی کا ڈیرہ تھم چھوڑے تھے لیکن سامنے کھڑے وجود کے چہرے پر اداسی کی جھریاں تھیں تو اس کے چہرے پر ہنستے ہوئے لکیروں نے ڈیرا بجایا تھا۔

”میں سنا ہوں..... بچانا؟“

شاید اس کی اسی نگاہ کا اندازہ لگاتے ہوئے سامنے کھڑے وجود نے کہا تھا۔

”حانا انوار تمہارے ساتھ سینئر لیچرار۔“

”ہوں..... یاد ہے سب کچھ بھی تو نہیں بھولی۔“

زیر لب کہتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کیسی گزر رہی ہے؟“ کرسی اٹھا کر اس نے اس کی کرسی کے سامنے کچھ فاصلے پر دھری۔

”شکر ہے مالک کا۔“

”پوچھو گی نہیں میرے بارے میں؟“ کرسی پر بیٹھے ہوئے قدرے ہونٹوں پر مسکراہٹ جمائے حانا انوار بولی۔

”کیا پوچھوں؟“

”کچھ جی۔“

حانا انوار نے اپنے طور پر اسے کھلی اجازت دی۔

”تم خود ہی بتا دو۔“ سرسری سے انداز میں فائزہ بولی۔

”میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا۔ موبائل نمبر تو تم نے شاید بدل دیا تھا۔ کالج سے ریزائن کرنے کے بعد۔“

”ریزائن میں نے نہیں کیا۔ مجھ سے لیا گیا تھا۔“

اس مرتبہ فائزہ کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”ہاں مجھ سے غلطی ہوئی۔ ہم نے غلط کیا تھا۔“

”اب کیا فائدہ؟“

”میں نے تمہارے گھر بھی کال کی تھی لیکن پی ٹی سی ایل تو بند جا رہا تھا۔“

”ہوں آج کل سب کے پاس موبائل ہوتے ہیں۔“

”مجھے تم سے معافی مانگنا تھی۔“

”کس لیے؟“ بے ساختہ ہی اس کے لبوں سے پھسلا، لہجے میں ہلکے سے طنز کی آمیزش تھی۔ جسے اس کے سامنے بیٹھے وجود نے محسوس کیا تھا۔

”میں جانتی ہوں تم دل سے بھلا ہو۔“

”میں نے کب کہا ایسا۔“

”میں سمجھ سکتی ہوں تم نے کس اذیت سے وہ وقت کاٹا، آسان نہیں ہوتا یہ سب تم نہیں سمجھ سکتیں وہ اذیت وہ کرب۔“

”میں سمجھ سکتی ہوں فائزہ تم سے ریزائن لینے کے بعد ایک ماہ کے اندر اندر میری جاب Terminate کر دی گئی۔“

جواب میں بے ساختہ ہی اس نے نظر اٹھا کر اس کے چہرے پر ڈالی۔

”میں نے تم سے تمہاری جاب چھینی تھی، خدا نے مجھے میرے غرور پر جاب ختم کر دیا۔ کالی عرصے بعد میں نے سنا تھا کہ تم نے کسی انٹرنیشنل کمپنی کو کمپیوٹر گرافکس کے طور پر سنبھال لیا ہے اور پھر کچھ ہی

عرصے بعد تمہاری شادی کی خبر سنی تھی۔“

”تمہاری جاب؟“ وہ کچھ حیرانگی سے بولی۔

”ہاں میں نے غرور کیا تھا تو سزا تو ملنی تھی۔“

”اچھا ہوا کہ تم پہلے چلی گئیں۔ میرے ساتھ رہتیں تو جاب ٹرمیٹ ہوتی بہت عرصے تک مجھے پھر جاب نہیں ملی، اسی ٹرمینیشن لیٹر کی وجہ سے پھر ایک پرائیویٹ کالج نے جاب دیا۔ جو سیر لیچرار۔“

فائزہ نے اس سے نہیں پوچھا تھا لیکن وہ خود ہی بول رہی تھی۔

”میں تم سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔ تمہاری اہلیت سے جل گئی تھی۔ کبھی تھی کہ تم میرے ساتھ کام کرو گی تو کہیں میری برابری پر جاب نہ چھین لو۔ تمہیں راستے سے ہٹانا چاہا لیکن خدا نے تمہارے لیے کامیابی کا راستہ الگ رکھا تھا۔ اس نے تمہیں میرے دہلیے سے راستے پر ڈال دیا اور میں وہیں کھلت کھا گئی۔“ فائزہ نے بے ساختہ ہی نظر اٹھا کر اس کے پڑمردہ چہرے پر ڈالی۔

”ہوں میں نہیں چاہتی تھی کہ تم اسٹوڈنٹس میں زیادہ پاپولر ہو، اسٹوڈنٹس تم سے پڑھنے پر خوش رہتے تھے جو مجھے برداشت نہیں تھا۔“

فائزہ ہنوز ایسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر نظریں جمائے تھی جہاں پچھتاوا تھا۔ زندگی میں ایک مقام ایسا بھی آیا تھا کہ وہ سوچتی تھی کہ اگر کبھی حانا انوار اس کی نظروں کے سامنے آئی تو وہ اسے کھری کھری سنائے گی۔ نفرت سے اس کے منہ پر تھو کے گی لیکن زندگی میں قسمت نے جب اس کے جھم سے یہ پل ڈالے تو وہ کچھ بھی اسے ملامت نہ کر سکی۔ اپنے ساتھ کی زیادتی اسے یاد نہ ولا سکی جیت کے نشے میں دھت خود قسمت کے ہاتھوں کھست حانا انوار کے جھم سے آئی تھی تو وہ اسے کس ہار کا احساس دلاتی کسا سے خود ہی اپنی ہار کا اعتراف تھا۔ جو الفاظ



# انسیا

”احسن بیٹا! سارہ کی ماں آئیں تھیں، وہ سارہ کو پیشہ کے لیے اپنے ساتھ واپس لے گئی ہیں۔“ فاخرہ بیگم نے احسن کے آفس سے آتے ہی دھماکا کیا۔ شوز اتارتے ہوئے احسن کے ہاتھ رک گئے۔

”لیکن کیوں امی! کیا بات ہوئی تھی؟“ احسن نے پریشان سا چہرہ لیے دہی آواز میں سوال کیا۔

”ارے مت پوچھو، میں نے صرف اتنا کہا کہ



تہماری باتیں سن کر وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔“ اور کچھ نہیں کہو گی۔“

”میں تمہارے حق میں دعا کروں گی۔“ یہ کہنے کے ساتھ ہی وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی فراز کی جانب چلی آئی۔ جو مین گیٹ کے قریب مہمانوں میں گھرے ناقب سے الوداعی سلام لے رہا تھا۔

پارکنگ لاٹ میں کھڑی گاڑی تک دونوں خاموشی سے ہمقدم آئے تھے۔ گاڑی کے فرنٹ ڈور کا لاک کھولتے ہوئے فراز نے پوچھا۔

”سب ٹھیک ہے نا؟“ وہ چونکی تھی اور پھر اس کی جانب دیکھے بنا فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”سب ٹھیک رہا فراز۔ وہ سب کچھ بھی جو آپ پوچھنا چاہ رہے ہیں۔“

فراز نے گاڑی کا کیریجینج کرتے ہوئے اس کی آواز سنی تھی اور پھر ایک سکراہٹ اس کے ہونٹوں پر در آئی تھی۔

فازہ کو معلوم تھا کہ وہ اب کچھ پوچھنا چاہتا ہے لیکن خاموش رہے گا اس لیے اس نے فراز کو زیادہ انتظار نہیں کروایا تھا اور خود ہی بول پڑی تھی۔

”مجھے یقین آ گیا فراز کہ خدا کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ آپ ٹھیک کہتے تھے لیکن کبھی بھی زندگی میں خدا کے کچھ فیصلوں کے ٹھیک ہونے کا اعتبار وقت کے ساتھ ہی آتا ہے۔ کیوں کہ انسان کی فطرت میں ناشکر اور بے صبر اپن ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی کہ فراز کی آواز گاڑی میں گونجی۔ ”اور کچھ جو کہتا ہوں۔“

”ہوں، آئندہ کوشش کروں گی خدا کی رضا میں راضی رہنے کی۔“ یہ کہہ کر اس نے گاڑی کی سیٹ کی پشت سے طمانیت سے سر نکا دیا۔

☆.....

ملاست وہ اس سے کہنا چاہتی تھی وہ اپنی زبان سے خود ہی بول رہی تھی۔

وہ خاموش تھی کہ اس کے موبائل پر Miss Call آئی۔ اس نے اسکرین کا رخ اپنی جانب موڑا۔ فراز نے مس نکل کی تھی وہ یقیناً اسے واپسی کے لیے بلا رہا تھا۔ موبائل اسکرین پر اس کا نام جگمگاتا دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جاری ہو؟“ حنا انوار اس سے پوچھ رہی تھی۔

”ہاں، میرے husband مجھے بلا رہے ہیں۔“

”میں نے سنا ہے تم اپنے شوہر کے ساتھ ان کا بزنس بھی ہینڈل کرتی ہو۔“ بے ساختہ ہی فازہ نے اس کی جانب دیکھا۔

”میں تمہیں بہت عرصے سے تلاش کر رہی تھی۔ میں ناقب کی خالہ کی بیٹی ہوں۔ مجھے تمہارے بارے میں علم ہوا تو میں تمہارے husband کے پاس گئی تھی۔ تم سے ملنا چاہتی تھی ڈرتا تھا کہ تم مجھے پہچاننے سے انکار نہ کرو لیکن تمہارے شوہر کا کہنا تھا کہ تم بہت بڑے ظرف والی ہو۔ ایسا کبھی نہیں کرو گی۔“

فازہ کے ذہن میں آنا سوال پڑھ کر حنا انوار بولی تھی۔

”میں نے ہی ناقب سے بولا تھا کہ تمہیں ضرور بلوائیں۔ مجھے تم سے ملنا تھا۔“

”خدا حافظ۔“

”تم نے مجھے معاف کر دیا؟“ حنا بولی۔

”میں تم سے خفا نہیں تھی تو پھر معافی کیسی؟“ وہ پلٹ کر اس کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے مسکرائی انداز میں تسلی تھی۔ ولاسہ تھا۔

”سچ کہہ رہی ہو؟“

”ہوں بس تھوڑا سا ٹکڑے تھا تم سے نہیں خدا سے کہ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ جب میں نے کوئی خطا نہیں کی نہ ہی کسی کا حق مارا تھا لیکن آج



تمہیں کڑا ہی ڈھنگ سے بنانی نہیں آتی، صرف پیسہ برباد کرتی ہو کوئی اور چیز بنا لو، اپنی ماں کے لیے تو بس یہ بات ان کی ماں نے سن لی اور کھڑی ہو گئیں کہ بس سارہ بہت ہو گئی، اب میں مزید تمہاری یہ ذلت برداشت نہیں کروں گی، اب بیک ریڈی کرو اور میرے ساتھ چلو، بس بھی بس بی بی کا یہ سننا تھا اور وہ بیک ریڈی کرنے پہنچ گئیں اور یہ جا اور وہ جا۔“

”جہیں بھی بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور چل پڑی اپنا گھر تباہ کرنے۔“

یہ سب سن کر احسن کو بھی غصہ آیا کہ اگر کوئی بات ای کی بری لگی تھی، تو کم از کم مجھے ایک کال کر کے جانے کا تو بتا دیتی۔

احسن غصہ کی کیفیت میں وہیں صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، فاخرہ بیگم نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ کی۔

”ارے غضب کی لڑکیاں ہیں آج کل کی، ذرا بھی سسرال، ساس اور شوہر کا لحاظ نہیں ایسے ناک پہ پیاز کاٹتے ہیں بھلا ذرا ذرا سی بات پر مچکے جا کر بیٹھ جاتے ہیں، انہیں یہ خوف نہیں کہ اگر ان کے شوہر منانے نہیں آئے تو ساری زندگی میکے میں بیٹھی رہ جائیں گی، میں تو کہتی ہوں پہلی دفعہ میں ہی سبق دے دو، ورنہ ساری زندگی روٹھنا منانا رہے گا۔“

”ہمارے زمانے میں تو ساس کے حکم کے بغیر اپنے کمرے میں نہیں جاسکتے تھے، ان کی آواز پر کھانا چھوڑ کر ان کا کام کرنے دوڑ جاتے تھے۔“ بس فاخرہ بیگم اپنے زمانے میں پہنچ گئیں۔

فاخرہ بیگم ایک روایتی ساس تھیں، لیکن ان کا سب سے بڑا مسئلہ سارہ کا وجود ہی تھا، چونکہ احسن ان کا اکلوتا بیٹا تھا اس لیے فاخرہ بیگم اس کی شادی اپنی بھانجی نمرہ سے کرنا چاہتی تھیں لیکن احسن کو سارہ پسند تھی، احسن کی دونوں چھوٹی بہنیں بھی نمرہ کو بھابھی بنانا چاہتی تھیں۔

احسن جس راستے سے آفس جاتا اسی راستے سے سارہ اپنے کالج جاتی تھی، یوں احسن کو سارہ کی سادگی نے اڑیک کیا اور اس نے ایک دن آفس سے جلدی کر آ کر سارہ کا پیچھا کیا اور اس کے گھر کا پتہ لگا لیا۔ دوسرے دن فاخرہ بیگم کے پیچھے لگا ہوا تھا کہ وہ سارہ کے گھر جا کر رشتہ مانگیں، لیکن فاخرہ بیگم کا ذہن شروع سے نمرہ کے لیے تھا اس لیے وہ راضی نہیں ہوئیں۔

احسن نے بہت جتن کئے لیکن وہ نہ مانیں آخر کار احسن نے گھر چھوڑنے کی دھمکی دے دی، جس سے فاخرہ بیگم کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ان کی اکلوتی کائنات انہیں چھوڑ دے یہ سوچ سوچ کر ان کی جان نکل رہی تھی۔

آخر کار احسن کی ضد کی وجہ سے انہوں نے سارہ کے ہاں جانے کی حالی بھری اور دوسرے دن اپنی دونوں بیٹیوں کو لے کر سارہ کے ہاں پہنچ گئیں سارہ کو دیکھ کر حنا اور صبا (احسن کی بہنیں) کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، وہ نمرہ سے کئی گنا پیاری تھی، فاخرہ بیگم بھی اُسے دیکھ کر سمجھ گئیں کہ ان کا بیٹا کیوں اتنا فدا ہوا کہ گھر چھوڑنے کی دھمکی دے ڈالی، خیر وہ بھی اس کی خوبصورتی کی دل میں تعریف کیے بناؤ نہ رہ سکیں، لیکن وہ اپنی بھانجی کی محبت میں سارہ کی خوبصورتی کو بھی خاطر میں نہ لائیں اور منی سوچ کے زیر اثر اس سے بیرکھ لیا، ان کی سوچ یہ بھی کہ اس لڑکی کی وجہ سے احسن نے ماں اور گھر سے بغاوت کی لہذا وہ ان کی سوچ اور معیار کے مطابق ان کا دل نہیں جیت سکی۔

خیر جھوٹے منہ اور دکھاوے کی محبت دکھا کر انہوں نے رشتہ دے ڈالا، احسن پڑھا لکھا تھا خوش شکل تھا اور سب سے بڑھ کر PIA میں اچھی جاب کرتا تھا، اس لیے سارہ کے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ ہوا، انہوں نے حالی دے دی اور تاریخ طے ہو گئی، سارہ رخصت ہو کے احسن کے گھر آ گئی،

جس دن سے سارہ رخصت ہو کر آئی اسی دن سے فاخرہ بیگم نے اس کی ہر بات اور ہر کام میں کپڑے نکالنا شروع کر دیئے۔ شروع میں سارہ ان کے مزاج سے بہت گھبرائی، لیکن احسن کے سمجھانے پر آہستہ آہستہ انہیں سمجھنے لگی۔ لیکن جب سارہ کے گھر والے اور خاص کر اس کی والدہ گھر پر آئیں تو وہ ان کی خامیوں کی لمبی لسٹ بننے کر بیٹھ جائیں اور بات بے بات ان کی تربیت کو نشانہ بناتیں۔

انہیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ سارہ اس تھکن زدہ ماحول میں کس طرح رہ رہی ہے، کبھی کبھی وہ سارہ کے اس گھر میں رشتہ ہونے پر پچھتاہیں اور کبھی اُسے سمجھاتیں۔

آج جب انہوں نے سارہ کو ان کے سامنے لگا کر اڑاتے سمجھاتے دیکھا، تو ان سے بی بی کی یہ بے پارگی دیکھی نہیں گئی اور وہ طیش میں آ گئیں، وہ سارہ کو اپنے ساتھ صرف اس لئے لائیں تھیں کہ اب وہ اس معاملے میں احسن سے بات کرنا چاہتی تھیں۔

ادھر فاخرہ بیگم نے اصل داستان چھپا کر اور بات کو گول مول پیش کر کے احسن کا دل سارہ کی طرف سے بڑا کر دیا، بلکہ بڑا ہی نہیں اتنا پکا کر دیا کہ احسن سارہ کو لینے اور نہ ہی اصل حقیقت جاننے گیا۔ وہ اپنی ماں کے آگے اس لئے خاموش تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ وہ اس کی خاطر سارہ کو خوشی بیاہ کر لے آئیں اور اپنی پسند کی قربانی دی ہے۔

☆ ☆ ☆

دن آہستہ آہستہ گزرتے جا رہے تھے احسن کبھی تنہا ہوتا، تو گھبرا کر سارہ کو لانے کا سوچتا، لیکن پھر ماں کے الفاظ اس کے کان میں گونجنے لگتے۔

ادھر سارہ کا رورہ کرنا برا حال ہو گیا، اُسے اپنی جلد بازی پر افسوس ہوا کہ میں اس دن اگر امی کا کہنا نہیں مانتی تو آج میں اپنے گھر میں ہوتی۔

سارہ کی والدہ نے کئی بار احسن سے بات کرنے کے لیے رابطہ کیا، لیکن احسن نے غصے سے کال اٹینڈ نہیں کی۔ دن گزرتے جا رہے تھے، معاملہ اتنا ہی بڑھتا جا رہا تھا اب آہستہ آہستہ سارہ کے گھر والے احسن کے رویہ سے نالاں ہو رہے تھے، ان کا خیال تھا کم از کم احسن کو اصل حقیقت کا پتہ لگانے کے لیے سارہ سے بات کرنے آنا چاہیے تھا، جو کہ احسن نے نہیں کیا۔

فاخرہ بیگم اپنے غرور اور مزاج کے مطابق بیٹے کو ایک بڑی پریشانی دے کر خوش تھیں۔

”صبا! بھائی سے کہو نا کہ بھابی کو لے آئیں، میں تو گھر کا کام کر کے تھک گئی ہوں، یہ بھابی کی ہمت بھی کہ جو گھر کے کام کے ساتھ امی کی کڑوی کسلی ہاتھیں برداشت کرتی تھیں۔“

حنانے صبا سے کہا۔

صبانے حنا کی بات کی تائید کی، حالانکہ صبا جانتی تھی کہ اس کی امی غلط ہیں، وہ سارہ بھابی کے ساتھ زیادتی کرتی ہیں، لیکن یہ بات امی کے منہ پر کہے کون؟

”حنا! اب بھابی کا معاملہ سیریس ہوتا جا رہا ہے، اب ہمیں ہی کچھ کرنا چاہیے۔“

”ہاں یہ بات تو ہے مجھے یہی تو فکر کھا رہی ہے کہ اتوار کو سب میری فرینڈز آرہی ہیں شام کی چائے پر بھابی نہیں ہوں گی تو کتنا امپریشن خراب پڑے گا۔“

میں چاہتی ہوں سب بھابی سے ملیں تو سب کتنا امپریشن ہوں ان سے مل کر۔“

صبانے فکر مندی سے حنا سے کہا اور کچھ سوچ کر اٹھی کہ آج میں بھابی سے بات کر کے رہوں گی۔

احسن آفس سے گھر آیا تو صبانے امی سے نظر بچا کر احسن کا دروازہ ٹوک کیا۔

صبانے صبا کو پا کر احسن نے حیرت سے کہا۔

## لہو لہنیں مسافر

مسافت طویل تھی تو مسافر لہنیں مابین تعلق مضبوط ترین تھا تو جذبات تلاطم انگیز تھے مگر فضا مبہم کیوں تھی؟ لیوں کا سکون جان لیا کیوں تھا؟

کار میں موجود دونوں نفوس مگر انداز نشست میں اتنے قریب تھے تو پھر دونوں میں فصیل کیوں تھی ہورہی تھی؟ کوئی جواب نہ تھا ان سوالوں کا خود ان

پڑتے سورج کی خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں تو دوسری طرف یسری امین چاند کی مانند سرخ و سفید ٹھنڈک پہنچاتی روشنی کی مانند تھی اس لیے یہ تشبیہ ظاہر اباطناً ہر طرح سے فٹ آتی تھی۔

”اہلیہ“ کا لفظ کتنے مخفی اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایسی ہستی جو آپ کے جان و مال کی مالک اور شراکت دار ٹھہر جائے مگر کیا اسے اہلیہ کہنا مناسب تھا جو اس لفظ کے مفہوم سے عی نہیں مابین رشتے کی جزئیات تک۔ سے نا آشنا تھی۔

سوچتے سوچتے کب باہر امین نے گردن موڑتے ہوئے اسے ٹیکھی نگاہ سے دیکھا تھا کہ

کے پاس بھی جو قفل زدہ لیوں اور بیجان اٹھاتی خواہشات کے ساتھ بظاہر ایک دوسرے سے بے نیاز نظر آتے تھے۔

لاہور سے اسلام آباد بذریعہ موٹر وے سفر میں آخر وہ کس اقتاد کے تحت مانند اجنبی ہمسفر ہوئے تھے۔

باہر امین اور اس کی اہلیہ یسری امین کتنا مکمل جوڑ تھا۔ پہلی نگاہ پڑتے عی چاند سورج کی تشبیہ رخ میں آتی تھی اور انہیں قریب سے جاننے والے بھی اس رائے سے انکار نہیں کرتے تھے کیونکہ باہر امین روشن کبھی گرم کبھی حاکم تو کبھی مدہم



جو آبادہ بھی شعلہ برساتی نگاہوں سے اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ آدھے گھنٹے کے سفر میں یہ پہلی بار تھا جب ان کی نگاہیں آپس میں ٹکرائی تھیں ورنہ اب تک تو تو کون اور میں کون کے مصداق اپنی نشستوں پر براجمان تھے۔

”ویورجی شادی کے بعد پہلی بارش اور پہلا سفر یادگار ہوتے نہیں بنائے جاتے ہیں۔“ بانو بھابی کی کہی بات کا دماغ میں آنا تھا جذبات میں مد و جزا ٹھننے لگے۔ جذبات سے گندھی دل میں کتنی خواہشات تھیں جو اب حسرت بننے لگی تھیں۔ اس کا ہمسفر اس کے حال دل سے انجان کیوں تھا اس کی نگاہوں کی چمکتی خواہشات اس کو دکھائی کیوں نہیں دیتی تھیں۔

بابر امین سوچ سوچ کے گڑھ رہا تھا۔ اس کی اندرونی خلنشار کا اندازہ اسٹیئرنگ پر اس کے ہیکٹے ہاتھوں اور کار کی کبھی غیر ضروری تیز رفتاری تو کبھی حد سے زیادہ ست رفتاری سے بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔

”من سوچی بندہ ہے کبھی بارش بن کر برستا ہے تو کبھی آسمانی بجلی بن کر گرتا بھی ہے۔“

یہ سیرنی امین جو اپنے ہمسفر کی حرکات کن آنکھیوں سے دیکھتی پہلے ہی خائف تھی بانو ایسا کے بابر کی بابت کے گئے انکشاف کو یاد کرتے ہی وہل سی گئی۔ پیار کی بارش میں بھیگنے سے قتل ہی بجلی گرنے کے خوف نے اسے ایک خول میں بند کر دیا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس خول سے ٹکرائی اس کی بیجانی چاہت کو اپنے دل و وجود میں سامنے نہیں دینا چاہتی تھی۔

اتفاق تھا کہ دونوں کی ایک ساتھ سیل فون پر بپ ہوئی تھی۔ فون اینڈ کے دونوں ایک دوسرے سے تغافل کا حسین مظاہرہ کر رہے تھے مگر ان کے مارے دونوں سے کوئی بھی اپنی آواز مدہم کرنے کو

تیار نہ تھا۔ بلند آواز ایک دوسرے کی گفتگو میں مغل ہو رہی تھی اور بات سمجھنا اور سمجھانا دشوار سے دشوار تر ہوتا چلا جا رہا تھا مگر پہل کون کرے، یہ دونوں میں سے کسی کو گوارا نہ تھا۔

”نہیں یار ابھی تک تو حیدرآباد کر اس بنیما ہے۔“

”لاہور اور اسلام آباد کے بیچ میں یہ کب سے آنے لگا؟“

احمد کے استفسار پر کہ کہاں تک سفر گزارا ہے وہ بھیرہ کہنے لگا۔ بجائے حیدرآباد کہہ اٹھا، کیونکہ یسریٰ اپنی کزن سے حیدرآبادی کہے سے متعلق کچھ ڈسکس کر رہی تھی۔ آواز سے آواز ٹکرائی تو بات بھی کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ احمد کے ریکارڈ لگانے پر اس نے فون بند کر دیا اور سرعت سے یسریٰ کی طرف متوجہ ہوا۔

”اگر آپ کار میں سفر کر رہے ہوں تو بات کرنے کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔“

وہ اپنی جھینپ کو طنز میں لپیٹ کر پہلی مرتبہ اس سے مخاطب ہوا جو شریک سفر ہی نہیں شریک زندگی بھی تھی اور یہ بھی نہیں کہ زبردستی اس کی زندگی میں شامل کی گئی ہو یہ رشتہ سراسر اس کی ایما اور ضد پر ہوا تھا۔

”اچھا اگر یہ اصول آپ نے سیکھے ہوں تو مجھے بھی سکھا دیجئے۔“

کیا پھول جھڑے تھے۔ تین ماہ کی دلہن کے منہ سے جو آج تک اس کے سامنے غیر ضروری تو کیا ضروری ترین بات بھی نہیں کر پائی تھی پھر آج کیا توپ مار دی وہ حیرت کے سوانیرے پر تھا۔

”محترمہ بات بند جگہ پر ہو یا کھلی فضا میں اس کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔“

اس کی زہریلی بات پر جواب حسب نتیجہ تھا۔ اس جیسی سبک خرام ہستی اگر چہ سکتی تھی تو مقابل تو

تھا ہی ہوا کا جھونکا۔

”جی میں نے وہی عرض کیا کہ پہلے سیکھ لیجئے پھر سکھا دیجئے۔“

وہ اب بھی اپنے لہجے اور اعزاز سے بٹنے کو تیار نہیں تھی دو بدبو بوٹی گئی وہ کھول تو رہا تھا مگر ایک بات اس پر ضرور عیاں ہو گئی تھی کہ یسریٰ امین کے بارے میں بتائی گئی ایک بات تو غلط ثابت ہوئی تھی کہ وہ کبھی کی حد تک کم گوئی۔

”آپ ہمارے سیکھنے پر اتنی ہی بضد ہیں تو اپنی شاگردی میں لے لیجئے۔“

بابر امین نے اب خلاف توقع بمباری کے بجائے میٹھی چھری کا سا انداز اپنایا، جو آبادہ بھنوس اپکانی خود کو بے نیاز ترین ظاہر کرنے کے لیے سر سے اسکارف اتارے بال سینٹے لگی۔

”ہماری صحبت میں رہیں گے تو سب سیکھ لیں گے۔“

بنا ہڈی کی زبان کب پھسل جائے کوئی نہیں جانتا۔ اپنی دانست میں ایک معقول جواب دیتی وہ کیا پیشکش کر گئی تھی اس نے اسے سر تا پا غرق آب کر دیا تھا۔ خود بابر امین کے لیے کھن زدہ سفر کون سا روزن کھلا تھا کہ مسام جاں کھل اٹھے تھے بند کار کے تناؤ میں نہ تو اسے سی کی کولنگ نے وہ کام دکھایا تھا نہ تازہ ہوا کے لیے کھولی گئی کھڑکیوں نے مگر جو تازگی اس کے غیر ارادی لفظوں نے اور روشن چہرے پر بکھری سنہری لٹوں سے اسے میسر آئی تھی وہ کہاں ان کے لائق تھی ایک اور خاموشی کا آغاز ہوا تھا مگر اب کہ کہیں شرارت تو کہیں حیا یوں پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔

☆.....☆

نور بانو نے والد کے انتقال کے بعد ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کر لی تھی تاکہ ماں اور یسریٰ پر مشتمل اپنی چھوٹی سی فیملی کو فنانسلی سپورٹ کر

سکے۔ کمپنی آزا کبر علی سے کب علیک سلیک بڑھ کر انٹرنٹ بندھن میں تبدیل ہو گئی وہ ایک روایتی کہانی ہے، ہاں اکبر کے بھائی بابر امین سے ان کی ذہنی مطابقت کمال کی تھی۔ وہ رشتوں کا احترام کرنے والا انسان اسے بھابھی سے ماں بنا کر مقدس چاہتیں اس پر لٹانے لگا وہ بھی شوہر، اس کے والدین، ایک بھائی بابر اور ایک ہی بہن تانیہ کے لیے چھتار ثابت ہوئیں۔ ان کی چاہتوں کے گرویدہ ان کے سرال نے بابر امین کی یسریٰ کے لیے پیش کی گئی چاہت کا دل سے خیر مقدم کیا۔ اور وہ یسریٰ امین بن کر اس کی زندگی میں شامل ہوئی مگر ان کے طمن کی راہ میں جانے کون سے پتھر حائل ہوئے؟ کیا سبب ہوا؟ کیا غضب ہوا کہ وہ ایک دوسرے سے بے نیاز اور متنفر ہونے لگے کیا بیان کریں کہ بیان کرنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔

”ہم تو بے تاب ہیں آپ ہی دیوار اٹھائے بیٹھی ہیں۔“

اس کی بے دھیانی میں کہی بات نے بابر امین کو کس رنگ میں نہلا دیا تھا کہ اب بات کرنے کا ڈھنگ ہی جدا تھا۔ وہ سرخ چہرے اور جھکی نگاہوں کے ساتھ جواب دینے سے قاصر تھی۔ کم گوئی کی صفت اب سامنے آئی تھی۔

”اس دیوار کے پار رنگوں کا جہاں آباد ہے ہمیں اس طرف صحرا میں کیوں چھوڑ دیا؟“ بابر کون سی حکایت بیان کر رہا تھا وہ متعجب تھی۔ شادی سے قبل اس سے جب بھی سامنا ہوا وہ ایک پر لطف تعارف سے آگے نہ بڑھا اور شادی کے بعد پہلی ملاقات اس کی پہل کے انتظار میں گزر گئی جو بات اس بندکار میں اس نے کہی تھی وہ آج تک بند کمرے میں ادا کیوں نہ ہوئی۔

”کسی بزرگ چھاپ شاعر کا کلام لگتا ہے آپ



یسری امین کے خوبصورت لبوں نے کیا گل افشانی کی اگر وہ ڈرائیو نہ کر رہا ہوتا تو چند منٹ ضرور اچھلتا۔

”ایلیسکیوزی میم! مجھے سڑک چھاپ تو کیا شعراء آفاق شعراء سے بھی قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے اور پلیز میرے احساسات پر مٹس پاس مت کرو۔“

ابراہیم کی بیشرقت رائیگاں گئی تھی۔ یہ بات اس کے لیے تازیانی سے کم نہ تھی۔ یہی رد عمل وہ خوف تھا جس نے پہلی ملاقات سے آج تک پہل کرنے سے منع کر رکھا تھا، کیونکہ اسے حد درجہ یقین تھا کہ یہ کھڑی ناک والی نازک لڑکی سیدھے سبھاؤ بات کرنے کی عادی نہیں ہے۔

یسری امین اپنے تکلم پر خود بھی حیران تھی۔ وہ کبھی بھی طنز یہ گفتگو کی مرتکب نہیں ہوئی تھی اور پھر اپنے شریک حیات کے ساتھ ایسے برتاؤ کے متعلق تو اس نے خواب میں بھی سوچا تھا۔ پتی ورتا ناسپ لڑکی کی زندگی میں وہ کونسا جبراً داخل ہوا تھا یسری کی رضامندی سے ہی یہ رشتہ استوار کیا گیا تھا۔

”معدرت کے ساتھ میں تو بس مبالغہ آرائی کے حوالے سے کہہ رہی تھی۔ شاعری کا لازمی جزو ہے یہ۔“ وہ اپنی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے ذرا تفصیل سے گویا ہوئی شاعری سے خصوصی شغف بھی اس کا ایک سبب تھا اور باہر کی شاعری سے اگر جی سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھی۔

”زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے ذرا سی مبالغہ آرائی کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔“ وہ بھی بات کو طول دینے کے بجائے سیز فائر کرتے ہوئے بولا۔ یہ اس کے مزاج کی متوازن اداسی جو یسری کے دل میں اتر کر مسکراہٹ بن کر لبوں پر آ گئی۔

ابراہیم نے کتنی بے اختیار نگاہ اٹھائی تھی اس کی جانب توجہ کا ہٹنا تھا کہ کار غیر متوازن ہوئی تھی اور وہ بھی غیر محسوس طریقے سے اس کا بازو تھام گئی تھی۔

پہلے سفر کی پہلی حسین واردات ابراہیم نے رائیگاں نہ جانے دی اور اپنے بازو کو پکڑے اس کے نازک ہاتھ کو دبا کر خاموش سبق پڑھا دیا۔

”یسری تجھے ڈیپٹیٹ کی عادت ہے جبکہ باہر بحث و مباحثہ سے الگ ہے اس عادت سے پرہیز تیری زندگی سنوار سکتا ہے۔“

بانو ایسا نے سرخ شرارے میں رواں تھی ہتھیاروں سے لیس چاند چہرہ دلہن کو متوازن زندگی میں پاس ہونے کے لیے پہلا سبق رٹا یا تھا جس کا خاطر خواہ اثر لیتے ہوئے وہ بحث و مباحثہ کی عادت ترک کرنے کی بجائے بولنا ہی فراموش کر گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ابراہیم کے پہلے پر جوش سلام پر کوئی رد عمل تو کیا ہی دکھائی بے نیازی کا عظیم مظاہرہ کرنے لگی۔ مقابلے کے دماغ میں بھی بانو ایسا کے الفاظ سن دینے جھکڑ چلائے ہوئے تھے۔

”ابراہیم یسری کی خاموشی بے معنی نہیں ہوتی، دل صاف ہو تو خوب بولتی ہے دل میں ابھن ہوتو خاموشی کی چادر اوڑھ لیتی ہے۔“

تو کیا یہ خاموشی بھی کسی ابھن کا پیش خیمہ ہے، وسوسوں کے بے موقع انٹری مارتے ناگ نے اسے آگے کی بات کہنے ہی نہ دی وہ چاہتے ہوئے بھی اسے بتا نہ سکا کہ وہ سرخ گلاب بنی اس کی زندگی کو مہر کا رہی تھی وہ اس کی مہکتی ہستی کو اپنے سینے میں اتارنا چاہتا تھا، مگر جانے کیوں قدم پیچھے ہٹ گئے وہ خاموشی سے چیخ کرتا کروٹ بدل کر لیٹ گیا تھا۔ دلہن بنی یسری امین اس خوف کی وجہ تفاعل دریافت بھی نہ کر سکی کہ کہیں بحث و مباحثہ کرنے کی عادت بد بقیہ زندگی کے لیے عیب نہ بن

جائے یوں بے معنی سوچ کا قلعہ تعمیر کیے دونوں اس میں محصور ہو گئے۔

☆.....☆

”اسلام آباد آنے میں کتنا وقت باقی ہے؟“ یہ پہلی مرتبہ تھا جب اس نے گفتگو کا آغاز کرنے کے لیے سوال داغا تھا۔ ابراہیم کہنا چاہتا تھا کہ آدھ گھنٹہ اور ہے مگر کہنے کی بجائے اس نے یسری کا بڑی آنکھوں سے مزین چہرہ ہاتھ کے کٹورے میں لیا تھا۔ یسری کے لیے شریک سفر کا لمس نیا نہیں تھا مگر حدت کچھ الگ سی تھی، کار چلاتے باہر کے دل میں کیا خواہشیں چل رہی تھیں اور آیا ان جذبات کا پڑاؤ کب تک آنے والا تھا یسری کا سینے سے شرابور جسم سمجھنے سے قاصر تھا۔

”تمہیں نہیں لگتا یہ سفر ختم نہیں ہونا چاہیے، فاصلے طویل ہو جائیں، راستے پر سچ ہو جائیں بس منزل نہ آئے۔“ ابراہیم کے اندر یکا یک طوفان سر اٹھانے لگے تھے۔ یسری کی حیران آنکھوں کے ساتھ وہ خود بھی متوجہ تھا، کتنا عجیب تھا شادی کے تین ماہ تک جو باتیں دل میں دن رہیں آج کیا غضب ہوا کہ خواہشیں اٹھائیں لے کر بیدار ہو گئیں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ پہلی بار ایک دوسرے کے ساتھ تہاٹھے بنا کسی کی نصیحتوں کو سر پر سوار کیے، محض اپنی اپنی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے مشاہدہ مختلف ہوا تو نتیجہ بھی حسب منشا ہی ہونا تھا۔

”اس سفر کی ابتداء میں آپ کے خیالات کافی مختلف تھے۔“

یسری امین ایک بار پھر پٹری سے اتر چکی تھیں۔ آخروہ کیسے فراموش کر دیتی کہ یہ سفر سراسر بانو ایسا کے اصرار پر طے ہوا تھا۔ اسلام آباد میں کسی عزیز کی شادی کی تقریبات کے سلسلے میں تمام فیملی پہلے ہی روانہ ہو چکی تھی۔ ایک بزنس میٹنگ

کے سلسلے میں ابراہیم کو عین وقت پر پہنچنا تھا۔ بانو بھابھی کی ایما پر وہ بھی باہر کے ساتھ رُک گئی تھی اس بلاوجہ کی ذمہ داری پر باہر نے کافی ناک بھوں چڑھائے تھے اور باتوں کے دوران دو مرتبہ مصیبت کا لفظ بھی استعمال ہوا تھا۔

”سفر سے خوش تو آپ جناہ بھی نہیں تھیں، اسی لیے آدھا گھنٹہ ہارن دیا تھا تب آپ کی سواری باد بہاری کا رنگ تشریف لائی تھی۔“ اب کے وہ بھی خوش گفتاری کا چولا اتار چکا تھا۔ بات آگے بڑھتی کیسے جب بدگمانی کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔

”ہاں تو کیسے فوراً آ جاتی آپ نے میرے اس قدر تیار ہونے پر ایک نگاہ ڈالنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ اٹا سفر پر ایزی ڈر۔ سو کے پہننے کے فوائد گنوانے لگے تھے۔ چیخ کرنے میں دیر تو ہونا ہی تھی۔“ کتنا بے سرو پا الزام تھا، جو وہ دھر رہی تھی وہ کمال حیرت سے کار کو بریک لگا گیا تھا۔ نتیجاً وہ جو اپنے دھیان میں تھی ڈیش بورڈ سے جا ٹکرائی۔

ابراہیم نے سرعت سے اسے اپنی طرف کھینچ کر اس کے سر کو سہلایا تھا۔ یسری کے لیے اس کی قربت خود فراموش کر دینے والی تھی۔ تین ماہ کی رفاقت میں ایک ہی روم اور بستر نشین ہونے کے باوجود اجنبیت کے کون سے وظیفے تھے جن کا وہ چلہ کاٹ رہے تھے۔ یسری نے اپنے ماتھے پر رکھے بھاری ہاتھ مہربان کو اپنے نازک ہاتھ میں تھام لیا۔ انتہائی قریب سے دیکھنے پر اسے یوں لگ رہا تھا کہ اب تک وہ جس ہمسفر کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتے رہے تھے وہ کوئی اور ہی تھا۔

”تمہیں کیوں لگا کہ میں نے تمہیں نگاہ بھر کر نہیں دیکھا، میں نے تو تمہارے ذرے ذرے کو نگاہ کے راستے دل میں اتار لیا تھا، بلکہ مجھے تو تم سے شکوہ تھا کہ تم نے میری پسندیدگی کو جانتے ہی

راڈاڈائجسٹ 171 جنوری 2015ء

## سکرادی اور چکے

وہ سکرادی اور چکے سے ایک کنگزنگ تالاب میں پھینک دیا۔  
غراب کی آواز کے ساتھ ہی تالاب میں بھنور بن گیا تھا۔ وہ بچوں کی طرح لطف لیتی دیر تک سکرادی

رہی۔ وہ کنگزنگ وقتے وقتے سے پھینکتی رہی۔ وہاں کی تنہائی میں کنگزنگ کی آواز دور تک پھیلتی تو اسے بہت اچھا لگتا۔  
افراہیم درخت کی اوٹ سے اسے دیکھتا رہا۔ بچوں کی سیاہ لہانہ و مصوم سکرادہٹ وہ بہت انمول لڑکی  
تھی۔

”پر یوں کی ملکہ۔“ دھیما لہجہ و بھاری مردانہ آواز۔ اس تنہائی میں اس کی سماعتوں تک پہنچا تو وہ چونک  
گئی۔ اس نے اپنے ہاتھیں طرف ایک دراز قد و امٹ شرٹ و بلیک پینٹ میں بلبوس و جیہہ سے جس کو کھڑے  
دیکھا۔ جس کے گلے میں کیمرا لنگ رہا تھا۔  
بالکل مناسب کتنا اچھا نام دیا ہے میرے ذہن نے آپ کو دیکھ کر۔“ وہ سامنے جھیل پر نظریں جمائے  
بے خودی میں بولا تھا۔

زمرد حیران تھی۔ ایک اجنبی شخص اس سے یوں مخاطب تھا گویا ان کے درمیان برسوں کی آشنائی ہو۔



”بعض اوقات ہمیں من چاہا مل جاتا ہے۔ مکمل بغیر کسی کی بیشی کے مگر صد افسوس کے دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ اس دن باغیچے میں آپ کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ میں تو بہر حال محبتوں کا اسیر شخص ہوں، کوئی بھی محبت سے منکر شخص آپ کو دیکھ لے تو پہلی نظر میں محبت کر بیٹھے گا۔ میری کونین آف ہارٹ مجھے ملی بھی تو بدر نامی خوش قسمت شخص کی ہو چکی۔ بہت سی لڑکیوں سے میری دوستی ہے۔ کچھ بہ یک وقت کئی سو کے گرل فرینڈ ہیں میں بھی ان سے فلرٹ کر لیتا ہوں مگر مجھے ایک ایسی لڑکی کی تلاش تھی جسے دیکھ کر میرا دل کہے ہاں یہ مکمل ہے۔ حسن..... پاکیزگی..... معصومیت..... بزم اکت جس میں یہ تمام گر پائے جاتے ہوں، وہی میرے دل کی ملکہ (کونین آف ہارٹ) ہوگی۔ قسمت کو شاید آپ سے ملوانا تھا۔ اسی لیے میرا یہاں کام بڑھتا چلا گیا۔ جس دن سے آپ کو دیکھا ہے کئی بار حویلی کے آس پاس چکر لگا چکا ہوں کہ شاید آپ کی ایک جھلک نظر آجائے اور آج آپ سے ملاقات ہوگی۔ لیکن سچی ہو تو راستے خود ہی ہموار ہو جاتے ہیں۔“ کانی باتوں کی شخص تھا اس کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا۔

آپ بھی کیا سوچ رہی ہوں گی کیسا سر پھر شخص ہے۔ پہلی ملاقات میں ہی دل کی باتیں کہہ گیا۔ مجھے افرایم کہتے ہیں اور آپ؟“ اس نے مسکرا کر اپنا تعارف کرایا اور چہرہ اٹھا کر خود سے ذرا فاصلے پر اونچے پتھر پر بیٹھی حسین سی نازک لڑکی کو دیکھا۔

زمر و عجب کشمکش میں مبتلا تھی اس کی طبیعت اس قسم کی تھی کہ وہ اجنبیوں سے عموماً جلد بے تکلف نہیں ہوتی تھی۔ ”گھبرائے نہیں، آپ کو بدر صاحب سے چھینے نہیں آیا، بے ضرر سا شخص ہوں، سوائے باتوں کے کچھ نہیں کر سکتا۔ میری طبیعت بہت سادہ ہے آپ سے دوستی کر کے مجھے اچھا لگے گا۔“ اس کا ساڈھ لہجہ اس کی سچائی کا غماز تھا۔

”زمر..... زمر ذلیل احمد۔“ اس نے اپنا تعارف کروایا اور اپنی جگہ سے اٹھی۔

”ارے، آپ تو جانے لگیں، ابھی تو میں نے جی بھر کے باتیں کرنی تھیں آپ سے۔“ افرایم حیرت سے کہتا کھڑا ہو گیا۔

”سوری مجھے جانا ہوگا۔ کانی دیر ہوگئی ہے۔“ وہ جانے کے لیے مڑی۔

”اتنا تو بتانی جائیں! اگلی ملاقات کب ہوگی۔ میں منتظر رہوں گا؟“ افرایم نے خود سے دور ہوتی زمر کی پشت کو جھکتے اونچی آواز سے ہانک لگائی۔ زمر کے قدموں کی رفتار میں کمی نہیں آئی تھی۔

اس کی طرف سے جواب نہ پا کر افرایم نے سر پر ہاتھ مارا تھا۔

☆.....☆

لکڑیاں ساری کٹ چکی تھیں۔

”اب ان کا کیا کریں گی یہ عورتیں؟“ زمر نے زہرہ سے پوچھا جو ان سب کو پانی پلا رہی تھی۔

”ان کو باندھ کر گھنٹوں کی صورت کمر پر لا کر سرخ محل لے کر جائیں گی۔“ زہرہ اس کو جواب دے کر اپنے کام پر لگ گئی۔

کچھ ہی دیر میں ساری عورتیں اپنا کام مکمل کر کے چلی گئیں۔ زہرہ اور زمر نے بھی قدم آگے بڑھائے۔

”بی بی جی! زہرہ جلتے جلتے رک گئی۔“

”لگتا ہے صاحب آگے۔“ زہرہ کی بات پر اس نے سامنے دیکھا۔ درختوں کی اوٹ سے نظر آتی تھی سڑک پر سیاہ پراڈور کی تھی۔

سوئڈ بوٹڈ شادار سا بدر آنکھوں پر سیاہ گاگڑ چڑھائے گاڑی سے اتر کر تیز قدموں سے ان کی طرف آ رہا تھا۔

”بدر.....!“ زمر دزیر لب بڑبڑائی۔ دل کی دھڑکنیں رکتی محسوس ہوئی تھیں۔

”سلام صاحب جی۔“ زہرہ ہاتھ باندھے باادب کھڑی تھی۔ وہ کچھ فاصلے پر تھا کہ اس نے سلام جھاڑا۔

”میرے دل کے چین میرے دل کے مالک میرے دل کے دھڑکنے کے سبب خوش آمدید۔ تمہاری راہ جھکتے جھکتے میری آنکھوں کی روشنی ختم ہونے لگی تھی۔ تمہیں دیکھ کر پھر سے جی اٹھی ہوں۔ اے میرے چین و سکون، میرے دل کے شہزادے خوش آمدید۔“ زمر کی پیاسی نگاہیں اسے تکتی دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھیں۔ اس کا سنجیدہ چہرہ، پتھر بلے تاثرات اور چال کی تیزی نے زہرہ کو ٹھنکا دیا۔

”یا اللہ خیر!“ اس نے خشک حلق کو تھوک نکل کر تر کیا۔ جب کہ زمر و ہر بات ہر احساس سے عاری، بے نیازی اس شادار سے شخص کو اپنی طرف آتا دیکھتی رہی۔

زمر نے کچھ کہنے کو لب وا کیے ہی تھے کہ بدر کے مضبوط ہاتھ کا تھپڑ اس کا چہرہ چھلسا گیا۔ وہ لڑکھڑا کر اچانک اس افتاد پر اپنے پیچھے ایسا دہ مضبوط درخت کے تنے سے لگرائی تھی۔

زہرہ نے خوف زدہ انداز میں بدر کی سمت دیکھا۔

”یہ کچھ سننا، دیکھنا نہیں چاہتی، اپنی آنکھ اور کان بند کر رکھے ہیں مگر تم تو کھلے رک سکتی ہو، چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ چپکی رہتی ہو مگر اس کو یہاں کے طور طریقے نہیں سمجھا سکتی تم سب کے سب نمک حرام ہو، کسی کام کے نہیں۔“ اس کا لہجہ اہانت آمیز اور زبان انگارے پر ساری تھی۔

زہرہ کی ساری شوخی و طراری غائب ہو چکی تھی وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سر اٹھا کر بدر کی سمت دیکھنے کی طاقت تک نہ تھی اس میں۔

”تم.....“ اب کے وہ درخت کے تنے سے لپٹی پتھریوں سے روتی زمر کی سمت مڑا، وہ بے چاری اپنا تصور تک نہیں جانتی تھی۔

”چلو میرے ساتھ، بے حیا لڑکی۔“ اس کی پیشانی کے زخم سے بے نیاز وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے گاڑی تک لایا تھا۔

زہرہ کی آنسوؤں سے بھری لبالب آنکھیں، اس اذیت سہتی نرم و نازک سی لڑکی پر جمی تھیں۔

☆.....☆

ماں جی..... ماں جی.....“ وہ اسے اپنے ساتھ تھمیتے ہوئے حویلی کے کشادہ صحن تک لایا تھا اور دھاڑتے ہوئے ساجدہ جہاں کو پکار رہا تھا۔

”الٹی خیر!“ ساجدہ جہاں افتاں و خیزہ میٹھییاں اتر کر نیچے آئیں تھیں۔ حویلی کی ساری ملازمتیں، کھونوں کھدروں سے جھانکتی تھر تھر کانپتی، بدر غفار کا خونخوار انداز اور نئی نویلی نازک سی دلہن کی ابتر حالت

دیکھ رہی تھیں۔

”سنہالیے اس بے حیا لڑک کو، اسے آوارہ گردی کی لت ہوگی مگر یہ شہر نہیں گاؤں ہے۔ ہم ابھی اتنے بے غیرت نہیں ہوئے نا ہی چوڑیاں پہن رکھی ہیں کہ جو اس کا دل چاہے یہ کرتی پھرے اور ہم خاموش تماشا کی بنے رہیں۔“ اس نے زمر کو ساجدہ جہاں کے قدموں میں پٹچا تھا۔

وہ زمین پر گری پھکیوں کے ساتھ زار و قطار رو رہی تھی۔ اس میں سر اٹھا کر اپنا تماشا دیکھنے کی بھی ہمت نہ تھی۔

ساجدہ جہاں کا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا مگر بیٹے کی موجودگی سے سنجیدہ در پریشان ہی صورت لیے کھڑی رہیں۔

زہرہ پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ حیرت زدہ سی سرخ عمل پہنچی تھی۔ اس نے جو یہ منظر دیکھا تو ساکت رہ گئی۔

حویلی کی خواتین کا آج تک کسی نے ایک بال تک نہیں دیکھا۔ یہ آج اس حلیے میں بغیر چادر کے گھر سے نکلی ہے اور اسے کوئی یہ بتانے والا نہیں تھا کہ یہاں ایسی باتوں پر قہر ہو جاتے ہیں۔ خاندان کے خاندان آپس میں لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ آج کتنے لوگوں کی بے باک نظریں اس کی سمت اٹھی ہوں گی۔

ملک غفار کے خاندان کی عورتوں کے لیے باعث شرم بات ہے بلکہ مرنے کا مقام، ماں جی یہ آپ کے حکم پر گھر سے نکلی تھی۔ کم از کم ایک چادر ہی اسے آپ مہیا کر دیتیں۔ آج کے بعد اگر یہ اس حلیے میں گھر سے نکلی تو جتنی بھی گولیاں میرے رپو لور میں ہیں، وہ تمام اس کے سینے میں اتار دوں گا۔“ اس کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔ آگ برسا کر دھپ دھپ کرنا مضبوط قدموں سے بیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔

”ساری عمر اس کی ماں نے میری زندگی عزاب کیے رکھی، اب یہ میرے بیٹے کی زندگی جہنم بنانے آگئی ہے۔“ ساجدہ جہاں نے حقارت سے کہہ کر ایک سلگتی نگاہ اس پر ڈالی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

”بی بی جی!“ زہرہ بھاگ کر اس کے پاس آئی اور اس کے سامنے دوڑا تو بیٹھی تھی۔

”زہرہ! اتنی تذلیل! میں مریوں نہیں گئی۔ بدر نے مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا۔“ اس کا درد کی زیادتی سے پھٹا لہجہ زہرہ کا دل چھیر گیا۔

”ہمت سے کام لیں بی بی جی!“ اس نے آگے بڑھ کر روتی ہوئی زمر کو سینے سے بھینچ لیا تھا۔

کتنی اکیلی اور خوف زدہ لگ رہی تھی۔“ اسے بی بی جی پر بہت رحم آیا تھا۔

”جاؤ اپنا کام کرو تم لوگ۔ یہاں کوئی تماشا نہیں لگا جس کا تم لوگ نظارہ کر رہی ہو۔“ زہرہ کی ڈانٹ پر وہ سب اپنی اپنی جگہ روانہ ہو گئی تھیں۔

”رو میں نہیں۔ میں آپ کا زخم صاف کرتی ہوں۔ کافی خون جم گیا ہے۔ دودھ میں ہلدی ملا کر پلاؤں گی تو سار اور دور ہو جائے گا انھیں۔“ زہرہ نے اسے تسلی دے کر سہارا دیا اور اٹھنے میں مدد دی۔

”کون کون سے درد دور کرو گی میرے۔“ اس نے اذیت سے سوچا تھا۔

زہرہ کو اپنی جس بی بی جی پر رشک آتا تھا۔ اس لمحے بے پناہ ترس آرہا تھا۔

☆.....☆

چاکلیٹی کلر کا شب خوابی کا لباس زیب تن کیے وہ سینے پر ہاتھ بائیں کھڑکی میں کھڑکی کسی ساکت مجھے

رداؤ انجسٹ [178] جنوری 2015ء

کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

پیشانی پر زخم کا نشان، لبوں پر چب کا قفل لگائے، متورم کانچ سی نیلی روئی روئی آنکھیں، اس کی حالت قابل رحم تھی۔ غسل سے فارغ ہو کر سر رگڑتے بدر کی نگاہ اس پر پڑی تو ایک پل کو ٹھٹھک گیا تھا۔

”چھوٹی سے چھوٹی بات پر میری ماں کو روئی کی طرح دھتک کر رکھنے والا میرا شاعر اور پڑھا لکھا باپ، نمک کم یا تیز ہو جانے جیسی ادنیٰ سی بات پر میری ماں پر گرفت کرنا مگر ماں جی نے کبھی اف تک نہ کیا۔ ان کے ماتھے پر بھی بابا کے لیے ایک ٹمکن تک نہ ابھری، ایک یہ محترمہ ہے ہونہر! اتنی بڑی غلطی پر صرف پھٹ کر کیا لگا دیا۔ اب ایک سال تک سوگ مناتی رہے گی۔ ان عورتوں کے یہ نام نہاد فریب (مکر)۔“

وہ بالوں کو اتنی سختی سے رگڑنے لگا گیا وہاں زمر وہی ہو۔

”بدر! میں ان سب چیزوں کی عادی نہیں۔“ اس کی آواز اگرچہ بہت دھیمی تھی مگر بدر نے بخوبی سن لی تھی۔

”یہ تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ میں نے نہ گن پوائنٹ پر تم سے نکاح پڑھوایا تھا اور نا ہی تمہاری منت کی تھی کہ پلیز مجھے اپنا لوتہا رہے بغیر مر جاؤں گا میں ہونہر۔“ اس نے بالوں میں برش پھیر کر سنگار میز پر پٹچا اور ترش روی سے گویا ہوا۔

”پلیز بدر! میری اتنی انسٹ مت کرو۔ بہت محبت کرتی ہوں تم سے۔“ حسین ٹمکن سی اس نے اپنی کانچ سی نیلی آنکھیں کھڑکی سے باہر نظر آتے کھیتوں، پگڈنڈیوں کے وسیع سلسلے پر سے ہٹا کر اپنے دل میں بے شمار اداس کی حقیقی شہید پر جمائی، لہجہ بھرا ہوا اور شکست خوردہ سا تھا۔

”مگر مجھے تم سے رتی بڑا بر محبت نہیں، جانتی ہو کیوں؟ کیوں کہ میں تمہارے حسن اور معصومیت کے پیچھے چھپے مکروہ چہرے کو پہچانتا ہوں، مجھے خالی خالی حسن اثر ایک نہیں کرتا۔“ اس کے تصور کے پردے پر زمر داؤر آکا ش کی اکٹھی شہینہ لہرائی اور وہ خاک ہو گیا۔

”تم اس گھر میں صرف میری ماں کی خواہش پر ہو۔ ان کا ظرف بہت وسیع ہے۔ جس عورت نے انہیں ہمیشہ آنسو دیے، وہ انہی کی بیٹی کو اپنی بہو بنا لائیں۔“ وہ تیزی سے اس کی طرف آیا اور اس کی کلا کی دبوچ کر کئی جھٹکے دیتے ہوئے بولا۔

”مجھ سے تمہیں کبھی کوئی سکھ نہیں مل سکے گا۔ اب یہ آنسو اور پچھتاوے ہی تمہارا مقدر ہیں۔ میری ایک نگاہ التفات کو ترس جاؤ گی مگر میں تم پر نفرت بھری نگاہ ڈالنا بھی اپنی توہین سمجھتا ہوں۔“ ایک جھٹکے سے اس کی کلا کی چھوڑ کر بدر نے انگارے چبائے تھے۔

اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

زمر اسی طرح ساکت و جامد کھڑی تھی۔ کانچ کے کھٹورے لبالب آنسوؤں سے بھرے تھے۔ ٹپ ٹپ بننے لگے۔

وہ کبل اوڑھنے، لائٹ آف کیے جانے سو رہا تھا یا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ زمر کی ناگوں میں مزید کھڑے رہنے کی طاقت نہ رہی تو وہ دیوار سے لگ کر زمین پر بیٹھ گئی اور سر گھٹنوں میں دے کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

”خاموش۔“ وہ دھاڑا زمر اپنی جگہ سے اچھلی تھی۔

رداؤ انجسٹ [179] جنوری 2015ء

”کس کا سوگ منار ہی ہو۔ خاموش نہیں ہو سکتی تو یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ اب اگر میری نیند خراب کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ زمر نے اپنی خود ساختہ جینوں کا گلا گھونٹا تھا۔ منہ پر سختی سے ہاتھ جمائے وہ سک رہی تھی۔

☆.....☆

”ہماری خوش بختی کہ میڈم آئرز نے صبح صبح ہمیں یاد کیا، زہرے نصیب، کیسی ہیں؟“ وہ جو دار ڈروپ سے اپنے کپڑے نکال رہی تھی۔ بدر کی خوش باشی آواز اس کی سماعتوں سے نکرائی۔  
سرگئی شلوار سوٹ میں نکھرنا خوشبو میں بکھیرتا وہ شاعر سا شخص اس کی ایک مسکراہٹ مقابل کو چاروں شانے چت کر دیتی، وہ ساہر تھا، جس کی ایک جادو بھری نگاہ کسی کو بھی اپنے دام میں گرفتار کر لیتی تھی۔

”یہ میرا ہو کر بھی مجھ سے کتنا بدگمان ہے۔“ زمر نے ہاتوں میں گن اس کی ذات کو یکسر فراموش کیے فون پر محو گفتگو بدر کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

”آج دوپہر تک مجھے اسلام آباد کے لیے نکلتا ہے، ماں جی سے ملنے آیا تھا۔“ وہ مقابل کی بات سننے کو رکا۔

”ہوں شارق زیدی سے ہمارا کنٹریکٹ ڈیل ہوا ہے۔ اسی سلسلے میں اہم میٹنگز ہوں گی۔ کوشش کروں گا آپ کی برتھ ڈے پارٹی میں آنے کی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔“

مقابل نے جانے کیا کہا تھا کہ وہ مسکرایا، وہی مخصوص پرکشش مسکراہٹ۔  
”یہ تو خالصتاً خواتین کا شعبہ ہے۔ خیر آپ اتنا ہی اصرار کر رہی ہیں تو کچھ دیر کو ٹائم نکال کر آ جاؤں گا۔“

زمر سے مزید سننے کی طاقت نہ رہی تو وہ ہاتھ روم میں گھس گئی تھی۔  
☆.....☆

”آٹا گوندھ کر دوپہر کے لیے سالن بنا لینا، پروین تمہاری مدد کر دے گی، تم اس گھر کی بڑی اور اکلوتی بہو ہو، بچپنا چھوڑو اور گریہ سنبھالو۔“ وہ ہدایات دے کر چلی گئیں۔

زہرہ کے منہ کرنے کے باوجود اس نے آٹا خود ہی گوندھا۔ ساتھ ساتھ ملازم عورتوں سے بھی ہدایات لے رہی تھی۔

زہرہ نے سالن کے لیے جلدی جلدی سبزی کاٹی اور آگ جلا کر دیگے چولہے پر رکھا۔ زہرہ اسے بتاتی جاتی اور وہ کھانا پکاتی رہی۔ سالن بہت مزے کا بنا تھا۔ زمر و بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی کہ ساجدہ جہاں خوش ہوں گی، اس کو شاباشی دیں گی مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ انہوں نے کھانا کھایا، بغیر اچھے یا برے تاثر کے انہوں نے نماز پڑھی اور کچھ دیر کو سو گئیں۔

وہ برتن اکٹھے کر کے دھونے کا ارادہ کر رہی تھی مگر کسی نے اسے مزید کام نہیں کرنے دیا۔ وہاں سب کو ہی اس سے محبت اور ہمدردی ہو گئی تھی۔ وہ کمرے میں آئی تو بدر تیار کھڑا تھا۔ گانگڑ بہن کر ریٹ واپس پہنی، بال بنائے، ہوبائل، والٹ اور گاڑی کی چابی اٹھا کر بریف کیس اٹھایا۔

”آپ کتنے دنوں کے لیے جا رہے ہیں؟“ زمر کی آواز پر اس کے دروازے کی طرف بڑھتے قدم رک گئے تھے۔

”میں نے تمہیں یہ حق نہیں دیا کہ میرے معمولات میں دخل دو، ماں جی کی وجہ سے تم سرخ نکل کا حصہ ہو، جب تک ان کا حکم مانو گی۔ یہاں تمہارے لیے جگہ ہوگی۔ جس دن ان کی حکم عدولی کی وہ تمہارا آخری دن ہوگا۔ دھکے دے کر یہاں سے نکالی جاؤ گی یاد رکھنا اور اپنی اوقات پہچاننا۔“ وہ پلٹا اور شعلے برسائے۔

”میں تو اس لیے پوچھ رہی تھی۔ آکاش نے کہا تھا ملنے کے لیے آنے کو، سب مجھے بہت یاد کرتے ہیں، دادی، مچی، پاپا اور میں بھی انہیں بہت یاد کرتی ہوں۔“ اس کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئی تھی۔

”اوہ..... تو یہ مسٹر آکاش کے دل کی خواہش تھی جو تمہارے لبوں پر آگئی اور تم نے سب کو اس میں گھسیٹ لیا۔ ویری اسٹریچ۔“ وہ استہزائیہ ہنسا۔

”تمہاری ماں آکاش سے شروع ہو کر آکاش پر ہی ختم ہوتی ہے۔ ایک بات تو بتاؤ تم دونوں کو ایک دوسرے سے اتنی ہی محبت تھی، تو شادی کیوں نہیں کی۔ مجھے کیوں ڈھالنا بنایا۔ بظاہر اس میں کوئی رکاوٹ بھی نظر نہیں آتی۔“ بدر کی چھتھی ہوئی نظریں، زمر کے جھکے چہرے پر جمی تھیں۔

”پلیز بدر!“ اس نے درو کی شدت سے بلبل کر جھکے سے سر اٹھایا تھا۔ آنسو بھری کانچ سی آنکھوں میں التجا تھی۔

”کیوں تکلیف محسوس ہوئی ناں؟ ایسی ہی تکلیف مجھے بھی ہوتی ہے۔ جب تمہیں اور آکاش کو ایک ساتھ سوچتا ہوں میرے دماغ کی شریان پھٹنے لگتی ہے۔ تم لوگوں نے میری انا کو پکلا ہے۔ میری مردانگی کی تذلیل کی ہے۔ میرا مذاق اڑایا ہے۔ بسک بسک کر ماروں گا تمہیں۔ تمہارا عاشق، وہ جب جب تمہیں تڑپا دیکھے گا۔ موت کی آرزو کرے گا مگر موت بھی اسے نہیں بخشے گی۔“ غصے کی زیادتی سے اس کا چہرہ سرخ اور لیس ابھرا نہیں تھی۔

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں بدر! میں.....“ بدر نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

”بس۔“ اس کی دھاڑ پر وہ ہم کر دو قدم پیچھے ہوئی تھی۔

”بس کوئی وضاحت نہیں، نہ اندھا ہوں اور نہ ہی بہرہ، سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے۔ مزید ایک لفظ بھی اپنی صفائی میں پیش نہیں کرنا۔ آج تم نے اتنی ہمت دکھائی اور میرا راستہ روکا، آئندہ میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو وہ حشر کروں گا کہ اپنے سائے سے بھی پناہ مانگوں گی گھٹیا عورت۔“ وہ نفرت سے زمین پر تھوکتا دھاڑ سے دروازہ اپنے پیچھے بند کرنا کمرے سے نکلا تھا۔

وہ زمین پر گر کر دوڑا تو پیٹھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”تمہارا عاشق..... گھٹیا عورت.....“ ان ہی الفاظ کی نفرت بھری بازگشت بار بار اس کی سماعتوں کو چھیر رہی تھی۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا پگھلا ہوا سپسہ کوئی اس کی سماعتوں میں اٹھیل رہا ہو۔ وہ سوائے درد کی شدت سے چیخنے چلانے کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی ہر سواذیت تھی۔

”آکاش! تم ٹھیک تھے۔ صبح کہتے تھے۔ میں ہی غلط تھی۔ میں نے چمکتی شے کو سونا سمجھ لیا تھا۔ میری جیسی سنگبر لڑکی کے ساتھ یہی ہونا چاہیے یہی میری سزا ہے۔“ زہرہ جو دروازہ بجانے کو ہاتھ اٹھا رہی تھی

زمر کی آہ وزاری سن کر تیزی سے دروازہ کھولتی اندر آئی تھی۔

وہ بے چاری حیران و پریشان سی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھی پکارنے لگی۔ دوسرے ہاتھ میں



کارڈ لیس پکڑا تھا۔

”آپ ٹھیک ہیں بی بی جی!“ وہ صحیح معنوں میں پریشانی ہو گئی تھی۔

زمر داسی طرح آکاش کو مخاطب کرتی روتی رہی۔

”صاحب ان کی طبیعت ٹھیک نہیں، آپ بعد میں فون کر لیتا۔“ اس نے کارڈ لیس کان سے لگا کر آکاش کو مخاطب کیا۔

وہ سارا کچھ سن رہا تھا۔ زمر دکارڈ نا اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔

”بدر کہاں ہے؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”صاحب تو ابھی ابھی اسلام آباد کے لیے نکلے ہیں۔“ زہرہ کی بات پر وہ لمبے کے ہزارویں حصے میں معطل کی تہہ تک پہنچا تھا۔

اس نے فون بند کر دیا۔

”بدر غفار! چھوڑو گا نہیں تمہیں، تم نہیں جانتے کس کو تکلیف دی ہے تم نے۔ نام نہاد غیرت کے بارے اپنے غرور میں مست انسان تف ہے تم پر۔“ وہ نفرت اور غصے کی زیادتی سے الکیاں مروڑتا کمرے میں ادھر سے ادھر بھل کر اس کے پیچھے کا انتظار کر رہا تھا۔

☆.....☆

”اتنے شاعر اور امیر کبیر شخص کی بیوی ہیں آپ، اوپر سے بے تحاشا حسن کی مالک اور ہیرے جواہرات پہنے ہوتی ہیں۔ حیرت ہے کبھی آپ کو کسی قسم کے پردوں کو ل میں نہیں دیکھا۔ سوائے اس پاگل زہرہ کے، جو ہر وقت آپ سے چٹھی ہوتی ہے۔“ افرایم نے مہندی کلر کے سادہ سوٹ اور سیاہ، رنگین گڑھائی کی چادر میں ملبوس سوگوار حسین سی زمر کو دیکھا۔ زہرہ کچھ فاصلے پر درخت سے مائلے توڑ کر کھا رہی تھی۔

ای سے میں نے آپ کا ذکر کیا تھا۔ وہ بہت خوش ہوئیں کہ مجھے میری ”کوئین آف ہارٹ۔“ (دل کی ملکہ) مل گئی۔ وہ مجھے لڑکیاں دکھاتیں اور میں کسی خای کسی کی کے سبب انکار کر دیتا۔ وہ میری اس عادت سے بہت بے زار تھیں۔ آپ کے بارے میں جان کر ان کو حقیقتاً بہت خوش ہوئی۔ ملنے کے لیے بے تاب ہوئیں۔ تو میں نے آپ کی شادی کا بتایا تو بہت افسردہ ہوئیں۔ کافی رنج ہوا تھا ان کو، میں نے تسلی دی کہ کوئی بات نہیں۔ میری نہیں ہو سکتی تو کیا ہوا مجھے مل تو گئی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ لیا۔ میری ساری زندگی کی تلاش ختم ہو گئی۔ دیکھا، بات کی، پھر مل لیا۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔“ وہ واقعی صاف گو اور بے مکہ انسان تھا۔

زمر داسے خاموشی سے سنتی رہی۔ زہرہ اسے باہر لائی تھی کہ شاید اس کی طبیعت کا بوجھل پن کچھ کم ہو جائے اتفاقاً افرایم سے ملاقات ہو گئی۔

”مجھے آج گھر جانا ہے کچھ دنوں تک واپسی ہوگی۔ آکر آپ سے معلومات بھی لینی ہیں تب تک آپ یہاں سے کافی حد تک واقف ہو جائیں گی۔ میں دعا کر رہا تھا کہ آپ سے ملاقات ہو جائے اور دیکھیں قبول ہوگی۔“ وہ جانے کے خیال سے اداسی سے مسکرایا تھا۔

باقی سارا وقت وہ بولتا رہا زمر داسے خاموشی سے سنتی رہی۔

☆.....☆

رداڈانجسٹ 182 جنوری 2015ء

بدر آفس پہنچ کر فائلز دیکھ رہا تھا کہ اس کی سیکریٹری نے انٹرکام پر آکاش کے آنے کی اطلاع دی اس نے آنے کی اجازت دے دی۔

وہ دروازے پر دستک دے کر اس کے شاندار سے آفس میں داخل ہوا تھا۔

”آسکتا ہوں؟“ اس نے تنگ لہجے میں پوچھا۔

”تشریف رکھیے۔“ بدر نے بھی اسی کے انداز میں سنجیدگی سے کہا۔ سلام دعا کا تکلف دونوں میں سے کسی نے نہیں برتا۔

”میں نے سرخ محل فون کیا تھا۔ زمر دنے مجھ سے بات نہیں کی۔ آخر ایسا کیا ہوا تھا جو وہ یوں شدت سے رو رہی تھی؟“ بیٹھنے کے بعد آکاش نے سنجیدگی سے ریوالونگ چیر پر بیٹھے شخص کو دیکھتے پوچھا تھا۔

”چوٹ اسے پٹی اور تکلیف تمہیں ہوئی تھی، واہ..... قدیم محبت ہے۔ ویسے وہ کون سا کبوتر ہے؟ جو اتنی تیزی سے ہر خبر پہنچا دیتا ہے۔“ وہ استہزائیہ بولا تھا۔

آکاش نے کرسی کے دونوں ہتھے مضبوطی سے تھام کر خود پر ضبط کیا تھا۔

”اس کا قصور کیا ہے آخر۔ کیوں اسے ٹارچہ کر رہے ہو؟“ وہ بہت گل سے گویا ہوا۔

”اس کا سب سے بڑا قصور تمہاری یہاں موجودگی ہے۔ کس تعلق سے تم اس کی حمایت کرنے میرے سامنے موجود ہو؟“ بدر اس سے بھی زیادہ تیزی سے بولا تھا۔

”اپنی بات پر غور کرو، غصے میں تم کسی بے گناہ پر بہت سنگین الزام لگا رہے ہو۔“ زمر د کا معصوم چہرہ اس کے سامنے لہرایا تو اس کا لہجہ خود بخود شکست خوردہ ہو گیا۔

”محبت تھی تو مجھے درمیان میں لائے بغیر دونوں ایک ہو جاتے، بے خبری میں میرے جذبات کو کیوں نہیں پہنچائی؟ میں ایک سچا اور کھرا شخص ہوں۔ تم جیسے بزدل اور دغے مرد و عورت سے مجھے نفرت ہے۔

ایک مرد کے سامنے اس کی بیوی کی حمایت کرنے والے اور اس کے درد پر بلبلانے والے کو تمہاری ڈکٹری میں کیا کہتے ہیں؟ کس حیثیت سے تم میرے سامنے ہو؟ میں اسے خوش رکھوں یا ناخوش تم کون ہوتے ہو مجھ سے اس کا حساب مانگتے والے؟ اس کے طلب گار تم دونوں میرے جذبات سے کھیلتے رہے، میرے گناہ

گار ہو۔ میرا جی چاہتا ہے تم جیسے گٹھیا اور بزدل لوگوں کو عبرت کا نشان بنا دوں۔ تاکہ آئندہ کوئی کسی کی عزت اور غیرت سے نہ کھیلتے۔“ اونچی آواز سے کہتے اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دونوں ہاتھ ششے کی ٹیبل پر

زور سے مارے تھے۔

”انسوس ہے تمہاری سوچ پر۔“ آکاش اپنی جگہ سے اٹھا۔

”اگر مرد ہو تو اقرار کرو، میں نے جو کچھ کہا وہ جھوٹ ہے، میرے ذہن کا فتور؟“ وہ سچ و تاب کھاتے ہوئے بولا۔

”وہ سراسر بے قصور ہے۔“ آکاش اتنا ہی کہہ سکا۔

”تو گویا تم قصور دار ہو؟“ وہ تیزی سے بولا۔

”ہاں یہ سچ ہے کہ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں مگر وہ معصوم ہے۔ کورے کاغذ کی طرح خالص، اس سارے میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ وہ صرف تم سے محبت کرتی ہے۔ حقیقت اور کچھ نہیں۔“ وہ شکست خوردگی سے بولا تھا۔

رداڈانجسٹ 183 جنوری 2015ء

بدر اپنی جگہ سے اٹھ کر آکاش کی سمت آیا تھا اور اسے گریبان سے پکڑ لیا۔

”اس اعتراف کو سننے کے بعد میں وعدہ کرتا ہوں۔ زمرہ کی زندگی جہنم بنا دوں گا۔ ایک ایک دن سسک سسک کر گزارے گی۔ میرے خدشات درست ثابت ہوئے۔ اس کی حمایت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، تم دونوں کی ایک دوسرے کے لیے دیوانگی، اندھوں سے بھی پوشیدہ نہیں، میں تو پھر بصارت رکھنے والا ایک غیر متندانسان ہوں، رشتوں کے احترام کو سمجھنے والا باظہیر انسان۔“ اس نے آکاش کے گریبان کو کبھی جھٹکے دے کر چھوڑ دیا تھا۔

”میں بھی تم پر ہاتھ اٹھا سکتا ہوں مگر تم زمرہ کے شوہر ہو، یہی لحاظ مجھے متحمل رکھنے پر مجبور کر رہا ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنے شرٹ کے بن بند کرتا چل سے گیا ہوا۔

”دفع ہو جاؤ، ایک سنت کے اندر اندر میری نظروں کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔“ وگرنہ دھکے دے کر نکلوانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔“ وہ اس کی طرف سے رخ موڑ کر غرایا، نفرت سے اس کا چہرہ جھلس رہا تھا۔

”ایک دن تمہیں اپنی کہی ہوئی ان باتوں پر افسوس ہوگا۔“ آکاش نے اس خوب صورت سے شخص کی مضبوط پشت کو دکھ سے دیکھا۔ بدر نے منھیاں بھیج کر خود پر قابو پایا۔ آکاش جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔

اس کے جاتے ہی بدر نے ٹیبل پر موجود ہر شے کو ہاتھوں سے گرا کر تھس نہیں کر دیا تھا۔

☆.....☆

”مگر اس کا گناہ کیا ہے اور تم اتنے غصے میں کیوں ہو؟“ ساجدہ جہاں کو بدر نے فون کیا تھا۔

”اس کا گناہ بہت بڑا ہے۔ ایک شخص کی بیوی ہو کر کسی اور کو دل میں بسائے رکھنا، راہ و رسم بڑھانا، ناقابل معافی جرم ہے اور وہ اس کی مرتکب ہو رہی ہے۔ میں ایسی منافق اور دوغلی عورت کو عبرت ناک انجام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ وعدہ کریں ماں جی! جب تک وہ زندہ ہے میری موجودگی میں یا میری غیر موجودگی میں اس کا ایک ایک لمحہ ایک ایک پل عذاب بنائے رکھیں گی۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت مانگے مگر اس برترس نہیں کھائیں گی۔ ایسی عورتوں کا انجام آخر کار کیا ہوتا ہے۔ یہ تمام عالم جان لے۔“ وہ طیش کے عالم میں کف اڑاتا بولا اور اپنی بات مکمل کر کے فون کر پیل پر پٹخ دیا تھا۔

ساجدہ جہاں نے فون بند کر دیا۔ عجیب گم صم سا انداز تھا۔

وہ تو بہت معصوم دکھتی ہے۔ اتنے دن میں نے اس کے ساتھ کیسا بھی سلوک روانہ رکھا مگر حیرت ہے کسی سے شکایت تو وورز کر تک نہیں کیا اور وہ دادی، وہ تو ہر وقت اپنی جیتی کو فون کرتی ہیں مگر زمرہ نے منہ سے بھاپ تک نہیں نکالی مگر نہ اب تک تو بڑھیا زمین و آسمان ایک کر دیتی۔ شاید بدر نے دھمکایا ہو، آخر کو میرا فرمانبردار بیٹا ہے۔ ماں کی برائیاں کیونکر برداشت کرے گا۔“ وہ دیر تک بیٹھ کر طرح طرح کی باتیں سوچتی رہیں تھیں۔

☆.....☆

”میری وجہ سے ایک انسان تباہ ہو رہا ہے۔ مجھے زبردستی اس کی نجی زندگی میں گھسیٹنا جا رہا ہے اور آپ کہتی ہیں خاموشی اور درگزر سے کام لوں۔ مجھے اپنی فکر نہیں، اس معصوم لڑکی کا خیال ہے وہ کیوں گناہ گار

رداؤ ایجنٹ 184 جنوری 2015ء

قرار دی جائے۔ کیوں سزا بھگتے؟ جب کہ اس نے کچھ کیا ہی نہیں۔ سوری مای اس معاملے میں، میں آپ سے ایگری نہیں کر سکتا۔ میں خاموش نہیں رہوں گا۔“ آکاش نے راحت بیگم سے بات کی تو انہوں نے اپنا موقف سنایا جو اسے کسی طور قبول نہ تھا۔ اسے صرف اور صرف زمرہ کی فکر تھی۔

”تم اس عورت کو نہیں جانتے، ساری زندگی اس نے اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں گردانا، جو کچھ ٹھکان لے کر گزرتی ہے۔ اسے روکنے والا آج تک پیدا نہیں ہوا۔ بدر کے ذہن میں یہ زہر بھرنے والی بھی اور کوئی نہیں سوائے ساجدہ جہاں کے، تم خود کو اس سب سے دور رکھو، اس معاملے میں خود کو مت گھسیٹو، یہ ان کے گھر کا معاملہ ہے۔ زمرہ میری بیٹی ہے۔ وہ ہر حال میں اپنا گھر بچائے گی۔ جتنا تم اس معاملے میں دخل دو گے، بات بننے کے بجائے بگڑتی چلی جائے گی۔ شادی کے ابتدائی دو سال میں نے حویلی میں کیسے گزارے ہیں، یہ صرف میں ہی جانتی ہوں۔ اس عورت نے میری زندگی عذاب بنا رکھی تھی۔ اماں بھی اس کی زبان درازی کے آگے خاموش ہو جاتیں۔ اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ صرف غفار بھائی تھے جن سے دتی تھی۔ اللہ کی پکڑ سخت ہوتی ہے، میں نے ہمیشہ اپنا دل صاف رکھا۔ میں نہیں جانتی کہ آخر وہ مجھ سے خدا واسطے کا پیر کیوں رکھتی ہے۔ روایتی جھٹائیوں والا رویہ کیوں مجھ سے روا رکھا حالانکہ میں ہمیشہ ان کی عزت کرتی آئی ہوں۔ ہمیشہ میں نے ان کو بڑی بہنوں والا پیار دیا۔ اس کے ہاں جو وہ مجھے بخشے کو تیار نہیں۔ جانے کہاں جا کر ان کی یہ دشمنی اختتام پذیر ہوگی۔ پہلے میں ہی اب میری بیٹی کو تکلیف دے کر مجھے نشانہ بنا رہی ہیں۔ مجھے زچ کرنا چاہتی ہیں مگر میں کچھ نہیں کہوں گی ہمیشہ کی طرح اب بھی میں نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑا۔“ انہوں نے آکاش کے جذبات کو سرد کرنے کے لیے اتنی طویل گفتگو کی تھی۔

”چاہے آپ کی یہ خاموشی اور صبر زمرہ کو کسی عظیم نقصان سے دوچار کر دے۔ تب بھی آپ یہی کہیں گی؟“ آکاش نے افسوس سے اپنی بزدل و ڈرپوک سی مای کو دیکھا تھا۔

”ہاں کیوں کہ میں کہہ چکی ہوں۔ اس عورت کو روکنے والا آج تک کوئی پیدا نہیں ہوا۔ تمہارے ماموں میرے ساتھ نہیں، وہ اپنے بیٹے اور بڑی بھابی پر اعتماد کرتے ہیں۔ میں اگر کچھ کہوں گی تو یہی سمجھیں گے کہ عام عورتوں کی طرح میں ان کو اپنوں کے خلاف کر رہی ہوں۔ ان کے کان بھر رہی ہوں اور تم جانتے ہو، وہ یہ سب کچھ کتنا پسند کرتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ۔ اللہ پر سارا معاملہ چھوڑنے میں، میں کتنی حق بجانب ہوں۔“ وہ بے چارگی سے بولیں تھیں۔

”ٹھیک ہے جو آپ کی مرضی مگر میں زمرہ کو اکیلا ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ آپ لوگوں کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ بگڑے چچا کے گھر پر ہے۔ نہ رابطہ نہ ملاقات، ایسے لگتا ہے آپ لوگوں نے اس کی شادی کر کے اپنی جان چھڑالی ہے۔“ وہ ہر حال میں اپنی بات پر ڈٹا رہا۔

”ان معاملوں کی نزاکت تم نہیں سمجھتے۔ بہتر یہی ہے کہ تم خاموش رہو۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھیں۔

”آپ لوگوں کی خاموشی نے ہی تو یہ دن دکھایا ہے۔ وہ لوگ حریہ شیر ہو گئے۔ آپ لوگ اگر زمرہ کو ایسے نہ چھوڑتے تو وہ اسے یوں اپنی ملکیت نہ سمجھتے۔ وہ لاوارث نہیں۔ آپ لوگ اس بات کو کیوں نہیں سمجھتے۔“ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔

راحت بیگم نے خاموشی سے کمرے سے نکلنے میں عافیت جانی۔ آکاش نے بہت افسوس و دکھ سے انہیں جانا دیکھا تھا۔

رداؤ ایجنٹ 185 جنوری 2015ء

Copied From Web

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

سیاہ رنگ کا پیروں کو چھوٹا لباس پہنے، ساتھ ہم رنگ جیولری پہنے وہ اداس سی اپنے کمرے کی طرف کھلتے والے ٹیرس میں کھڑی تھی۔

سیاہ رنگ میں اس کی دودھیارنگت نکھر کر مزید چم چم کرنا نکاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ سنہرے لہریے دار بال ہوا سے کھلتے اس کے روپ کو جلا بخش رہے تھے۔

معاہی نے دیکھا سفید کردالا سرخ گل کے پوریچ میں آ کر رکی تھی۔ وہ ذرا سا رنگتھام کر چکی، گاڑی سے اترتے شخص کو دیکھ کر اس کی نیلے کالج سی سکھوی آنکھیں، حیرانگی و خوشی سے پوری کھل گئیں۔

اس نے ریٹنگ سے ہاتھ ہٹاتے، دونوں پہلوؤں سے لباس تھاما، تیز قدموں سے بھاگتے کمرے سے نکلی، تیزی سے راہداری عبور کر کے سیڑھیاں اترنے لگی۔ مکے سے آنے والی ہوا بھی مسرت بخشتی ہے۔

آنے والا تو پھر آکاش تھا۔ طویل سیڑھیاں عبور کر کے وہ حویلی کے کشادہ صحن میں اتری تھی۔ سامنے ہی آکاش نظر آیا۔ کھل کھر کے شلوار ٹیص میں پشاوری چپل پہنے نکھر نکھر آکاش، وہ بھاگتے ہوئے آ کر اس سے لپٹ گئی۔

”آکاش!“ وہ بری طرح سے روتے ہوئے اسے پکار رہی تھی۔

”کتنا یاد کیا تم سب کو۔ مجھے بالکل بھول گئے۔ سوائے داوی کے کوئی فون نہیں کرتا۔“ وہ ہچکیوں سے روتے، شکوہ کر رہی تھی۔

”کتنی معصوم ہے یہ بدر! خدا بھی تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔“ آکاش کی آنکھوں میں نمی لہرائی اس نے خود سے لپٹی روٹی سسکتی زمرد کی کمر پر ایک ہاتھ رکھا دوسرا اس کے سنہری بالوں والے سر پر رکھ کر تسلی دینے کے انداز میں تھپکنے لگا۔

”اب تو میں آ گیا ہوں نا، روؤ مت پگلی، میں تمہارے پاس ہوں۔“ اس نے زمرد کو چپ کر جانے کی کوشش کی تھی۔

بہت سارا رونے کے بعد وہ شرمندہ شرمندہ سی اس سے الگ ہوئی اور اپنے آنسو پونچھے۔

”مئی، پاپا، دادی سب کیسے ہیں؟ پاپا مجھے یاد کرتے ہیں یا بھول گئے؟“ وہ آنسوؤں کے درمیان بولی۔

”کوئی نہیں بھولا۔ ایک حقیقی شہزادی کو، کون بھول سکتا ہے بھلا۔“ اس کا لہجہ بہت منظر تھا۔

”شہزادی اب نہیں رہی، وہ تو بہت بدل گئی ہے۔“ وہ جیسے بڑبڑائی تھی مگر آکاش نے سن لیا تھا۔

”وہ اپنے اندھے شک میں پل پل تمہیں ختم کر رہا ہے۔ مٹا رہا ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا کسی کے لیے تم خود کو نہیں بدلوگی۔ مگر افسوس تم نے ایک ایسے شخص کے لیے خود کو بدل لیا جو تمہارا ہے ہی نہیں، اس کی انا اور

اس کا زعم اسے تمہارا ہونے ہی نہیں دے رہا۔ تم ہو کے اس کی اصل صورت پہچاننے سے انکاری ہو۔ وہ تم پر کتنے رکیک الزامات لگا چکا ہے اور تم اب بھی اس کے لیے پاگل ہو رہی ہو؟ میں تمہیں لینے آیا ہوں، اب تم مزید اس گھنیا آدمی کے ساتھ نہیں رہوگی۔“ آکاش کی بات پر سیڑھیاں اترتی ساجدہ جہاں کے قدم وہیں

تھم گئے تھے۔

”میری محبت اس کے دل سے شک اور ہر منفی سوچ مٹا دے گی۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔ آکاش کے بدر

کے لیے کہے گئے الفاظ اسے حقیقتاً برے لگے تھے۔

”سوچ ہے تمہاری، ساری زندگی انتظار کرو گی۔ تب بھی وہ تمہارا نہیں، اپنی خود ساختہ انا کے زعم میں تمہیں تڑپاتا رہے گا۔ کبھی سکھ نہیں دے گا۔ تم ہمیشہ تکلیف میں رہو گی۔“ وہ قطعی لہجے میں بولا۔

”میں تمہیں لینے آیا ہوں، تمہیں ہر حال میں میرے ساتھ جانا ہو گا۔ تم مزید اذیت برداشت نہیں کرو گی۔ وہ گھنیا شخص تمہیں میرے نام پر زنج کرنا رہے گا اور تم سستی رہو گی۔ یہ میں ہونے نہیں دوں گا چلو۔“

اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”چٹاخ.....“ زمرد نے اس کے بڑھے ہاتھ کو نظر انداز کر کے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کیا تھا۔

”تم کون ہوتے ہو، میری زندگی میں مداخلت کرنے والے، بدر میرا شوہر ہے اور میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں، جب تک ہمت ہے میں اس کی بے رخی اور ہر اذیت برداشت کروں گی۔ تمہیں مجھ پر

زس کھانے کی کوئی ضرورت نہیں، میں اپنی خوشی اور اپنی رضا سے یہاں موجود ہوں، مجھے اگر جانا ہوتا تو پہلے ہی دن دل برداشتہ ہو کر یہ گھر چھوڑ دیتی اور مجھے یہ کرنے سے کوئی بھی روک نہیں سکتا تھا۔ آئندہ میرے سامنے بھی مت آنا۔ میرا راستہ کھوٹا کر کے میرا گھر اجاڑ کر تمہیں کیا ملے گا؟“ وہ چلائی تھی۔

ساجدہ جہاں کنگ رہ گئی تھیں۔ ٹھیک یہی حالت آکاش کی تھی۔

”اتنی ہمت..... تم اتنی بہادر کب سے ہو گئیں؟ میں تو سمجھ رہا تھا تم روڈ گی، گڑ گڑاؤ گی۔ مجھ سے مدد کی

بھیک مانگو گی۔ تم نے ناموافق حالات سے لڑنا کب سیکھ لیا؟ حیرت ہے تم اتنی بڑی ہو گئی اور مجھے پتا ہی نہ چل سکا۔“ وہ آنکھوں میں نمی لیے حیرت سے اس نازک لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ جسے ہوا بھی تیزی سے چھو کر

گزرتی تو وہ آکاش کی طرف دیکھ کر منہ بسورتی تھی۔ ہر موڑ پر آکاش کی محتاج وہ چھوٹی سی لڑکی، آج اسے اپنا گھر نڈا جاڑنے کی درخواست کر رہی تھی۔ اتنی بڑی بڑی باتیں اس کے منہ سے سن کر وہ حیران تھا۔

”میں تمہیں ایسے نہیں دیکھ سکتا۔ پلیز زمرد میرے ساتھ چلو۔ تم یہ سب سہتے سہتے ٹوٹ جاؤ گی۔ پلیز خود پر ظلم مت کرو۔“ اس کی التجا پر ایک پل کو زمرد کے قدم لڑکھڑائے تھے مگر اس نے بروقت خود پر قابو پا لیا۔

”پلیز آکاش! مجھے ان حالات سے لڑنے دو۔ مجھے کمزور مت کرو۔ میں نے بدر کو جانے کی خاطر بہت طویل انتظار کیا۔ قسمت مجھ پر مہربان ہو گی۔ میں اب بھی انتظار کرنا چاہتی ہوں۔ وہ اگر میرا ہے تو

ضرور میری طرف لوٹے گا۔ میری ہمت گھٹانے کے بجائے بڑھاؤ، مجھے تمہارے حوصلے کی بہت ضرورت ہے، مجھے کمزور مت کرو۔“ وہ بے بسی سے رو پڑی۔

”مگر میں یہ سب کیسے برداشت کروں گا۔ تم تکلیف سستی رہو اور میں تمہیں حوصلہ دیتا رہوں۔ بہت مشکل بات ہے۔“

”تمہیں یہ کرنا ہو گا اگر جو تم میرے مخلص دوست ہو تو تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا۔ کیونکہ میں یہ سب کچھ برداشت کرنا چاہتی ہوں۔ جب تک ہمت ہے سب سستی رہوں گی۔ جب ہمت جواب دے گی اسی پل

تمہارے در پر مدد مانگنے آؤں گی۔“

”چاہے اس سارے میں تمہیں کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے۔ اپنی شخصیت مسخ کرنا پڑے؟“ وہ تیزی سے اس کی بات کاٹ کر بولا تھا۔

”ہاں..... یہی چاہتی ہوں، اپنی محبت کی مضبوطی ناپنا چاہتی ہوں۔ میری محبت کتنا سہہ سکتی ہے مجھے کتنا حوصلہ دیتی ہے۔ یہ سب محسوس کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ ایک عزم سے بولی تھی۔

”آدھا زمانہ تمہارا طلب گار، کیوں یہ سب کر رہی ہو؟ اس ناقدر شخص پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ خود کو اتنا مت گراؤ۔ وہ کبھی تمہیں نہیں سمجھے گا۔“ آکاش نے اسے باز رکھنے کی آخری ناکام کوشش کی تھی۔

”تم جانتے ہو جو میں نشان لوں، اسے پورا کر کے رہتی ہوں، اس لیے تردد مت کرو، میں فیصلہ کر چکی ہوں۔“ وہ قطعاً پن سے بولی۔

”ٹھیک ہے جو تمہاری مرضی، اللہ تمہاری راہ آسان کرے۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے وہاں سے چلا گیا۔

زمر دہاتھوں میں چہرہ چھپا کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ساجدہ جہاں لٹے پیروں اپنے کمرے میں گئی تھیں اور بدر کو فون پر تمام صورت حال سے آگاہ کیا تھا وہ سچ و تاب کھانا رہ گیا۔

☆.....☆

آستین کہیوں تک فولڈ کیے انگارہ ہوتی آنکھوں پر گاگن چڑھائے وہ لب بھینچے جانے کب سے رش ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ سفر تھا کہ کتنے کے بجائے طویل تر ہونا جا رہا تھا۔

اس کے دماغ پر ایک ہی بات سوار تھی آکاش سرخ نکل آیا تھا اور زمر دے مل کر گیا تھا۔ یہی نہیں اسے ساتھ لے جانے کی کوشش بھی کی تھی۔

وہ سرخ نکل پہنچا تو سارا گاؤں بیٹھی نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک تو اس کے اعصاب سچ رہے تھے۔ اوپر سے گیٹ بند تھا اور چوکیدار کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔

وہ ہارن پر ہاتھ رکھ کر بھول گیا۔ چوکیدار جو اندر کوارٹر میں سو رہا تھا بغیر قیصر کے ہی بڑا کر جاتے تھے۔

یہ باہر کو بھاگا اس نے گیٹ کے دونوں پٹ بمشکل صاحب کے خوف سے کھولے تھے اور ایک سائڈ پر مودب سا کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی جھاڑ کا منظر تھا مگر حیرت کی انتہا نہ رہی جب صاحب نے کار تیزی سے پورج میں لے جا کر روک دی اور خود تیز قدموں سے چلتے اندر حویلی میں چلے گئے۔

اس نے سکھ کا سانس لے کر گیٹ بند کیا تھا۔

☆.....☆

ماں جی سمیت تمام ملازم سو چکے تھے۔ پوری حویلی میں خاموشی کا راج تھا۔ وہ تیزی سے میڑھیان چڑھتا اپنے کمرے میں آیا تھا۔

زمر دیاہ لہارے میں بلبوس صوفے کی پشت سے سر نکالے سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی۔

چہرے پر آنسوؤں کے مٹے مٹے نشان موجود تھے۔ چہرہ نم اور گلانی سا محسوس ہو رہا تھا۔

بدر نے ایک چھدتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی اور پھر ہاتھ میں پٹا موبائل والٹ گاڑی کی جابی تمام چیزیں اس نے سائڈ ٹیبل پر ڈالیں۔ شور کی آواز سے سوئی جاگتی سی کیفیت میں زمر د نے آنکھیں کھولیں اور بدر کو سامنے پا کر حیرت و خوشی سے سیدھی ہو بیٹھی۔

”آپ!“ وہ اس کی طرف دیکھتے اٹھنے لگی تھی کہ بدر نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

رداؤ انجسٹ [188] جنوری 2015ء

”مجھے ان چونچلوں سے رام کرنے کی کوشش بے سود ہے۔ بیٹھی رہو ابھی بہت حساب نکلتا ہے تمہاری طرف سے۔“ اس کا لہجہ اس کا اعزاز سب بیگانگی لیے ہوئے تھا۔

زمر د ہلکی تھی۔

اس نے کوٹ اتار کر بیڈ پر پھینکا۔ ٹائی ڈھیلی کر کے گلے سے کھینچی اور کمرے میں دور پھینک دی۔

کمرے کے وسط میں آکر زمر د کے عین سامنے کچھ فاصلے پر رک گیا۔ اس کی خاموشی و بھسم کر دینے والی نظروں سے زمر د کو بہت خوف محسوس ہوا۔

”سیاہ رنگ کا انتخاب کر کے کس کا سوگ منا رہی ہو؟ کیا میرا؟ میں تو ابھی زعمہ ہوں۔“ اس کی سرد آواز دستہزائیہ لہجہ کمرے میں گونجا تھا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ میں سمجھ نہیں پا رہی۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”میرے سامنے یہ معسومیت کا چولہا اتار دیا کرو، مجھے نفرت ہے اس ڈرامے بازی سے۔“ وہ دہاڑا۔

زمر د نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ ان لہجوں کی عادی ہی کب تھی۔ آنسو دوایانہ وار بہہ نکلے۔

”وہ یہاں کیوں آیا تھا۔ جب کہ میں تم سے کہہ چکا تھا کہ مجھے وہ شخص اپنی زعمگی میں قطعی برداشت نہیں۔ یہ ہمت تم نے اسے دی وگرنہ اس جیسے بزدل شخص کی یہ مجال کہ وہ میری غیر موجودگی میں میرے گھر آئے اور میری ہی بیوی کو اپنے ساتھ جانے پر اکسائے، کس کی شہہ پر وہ یہ سب کرتا رہا، صرف تم ہو اور کوئی نہیں۔“ اس کے لہجے کا پتھر بلا پن زمر د کو ن کر گیا۔ وہ نا سمجھتے ہوئے بھی سمجھ گئی تھی۔

بدر نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے مقابل کھڑا کر دیا۔

جس شخص کی ذرا سی قربت اسے سرشار کر دیتی۔ آج اس لمحے اسے خوف زدہ کر رہی تھی۔

”میری طرف دیکھو۔“ بدر نے اس کا بازو بھجھوڑا، زمر د کا جھکا سر نہ اٹھ سکا وہ خود میں بدر کی طرف دیکھنے کا حوصلہ نہیں پاتی تھی۔

”پلیز چھوڑیں مجھے۔“ اس نے کمزور ساد فاع کیا۔

”میں نے کہا میری آنکھوں میں دیکھو۔“ اس کی دہاڑ پر زمر د نے کانپتے ہوئے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس کی طرف ایک لمحہ کودیکھا مگر اس کی سرخ ہوئی آنکھوں اور چہرے کے سخت تاثرات نے نگاہیں جھکانے پر مجبور کر دیا۔

”تو تم اعتراف نہیں کرو گی؟“ اس نے زمر د کے بازو پر اپنے ہاتھ کی گرفت سخت کرتے اسے سمجھہ کیا اور اس کا بازو چھوڑ دیا۔

وہ جو ایک قدم پیچھے ہو کر اپنا بازو سہلانے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ اس کی حرکت قلب بند کرنے کو کافی تھا۔

”بدر.....!“ اس کی آنکھیں خوف و حیرت کی زیادتی سے پھٹ پڑیں۔ لرزتی لیوں سے اس نے بمشکل بدر کو پکارا تھا۔

وہ پینٹ کی بیلٹ کھینچ کر نکال چکا تھا۔

زمر د کے ذہن نے فوراً سے بیشتر ایک راہ سجائی تھی۔ وہ جچی سے تو مدد لے سکتی ہے یہ سوچتے ہی وہ دروازے کی سمت بھاگی۔ دروازے کا تاب ہر طرح سے آزمانے لگی مگر وہ کھل کر نہ دیا۔

رداؤ انجسٹ [189] جنوری 2015ء

جو یقیناً لاک کیا جا چکا تھا۔

”بدر پلینز.....“ وہ دروازے کے نائب پر ہاتھ جمائے بالکل دروازے سے لگ کر کھڑی تھی اور سونے کے پتے کی طرح لرز رہی تھی۔

ہاتھ میں کس کر بیٹ پکڑے، یقیناً ارادوں سے اس کی طرف بڑھتے بدر کو دیکھ کر وہ رونے لگی۔ کچھ دیر پہلے آکاش سے کیے گئے وعدے اور ہمت کا ذکر، اب ختم ہونے کو آ رہا تھا اسے اپنی ساری ہمت زائل ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

”آکاش کے ساتھ تمہارا کیا چکر ہے؟ سچ بتانا؟ وہ اعتراف کر چکا، اب تمہاری باری ہے۔“ اس کی آنکھوں سے لہو بہتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دروازہ چھوڑنی ہم کر دیوار سے جا لگی۔

”پلینز بدر! ایسا کچھ نہیں۔“ وہ رونے لگی۔

”مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔“ وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

”چٹاخ۔“ یکے بعد دیگرے ہنسنے اس کے منہ پر نشان چھوڑ دیا تھا۔ وہ صونے کے ہتھکے سے ٹکرانی اور زمین پر گر گئی۔

”پلینز بدر!“ وہ روتے ہوئے التجا کرنے لگی۔

”تم جیسی عورتوں کا علاج مجھے خوب آتا ہے۔ میں ایک خاندانی اور عزت دار شخص ہوں۔ میرے گھر میں یہ ساری ذلالت نہیں چلے گی۔ میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تم آئندہ اس کا نام لینا تو دور اسے سوچے ہوئے بھی کانپو گی۔“ بدر کا بیٹ والا ہاتھ ہوا میں معلق ہوتا دیکھ کر اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید ہوا تھا اور منہ سے ہلکی سی چیخ ابھری۔

وہ منہ سے کف اڑاتا، مغلظات بکاتا اسے مارتا رہا وہ جسم پر پڑنے والے نیلوں کو سستی چینی رہی۔ مدد اور رحم کی بھیک مانگتی رہی۔

خواب دیکھنے والی شہزادی کی آنکھوں میں خوشیوں کے بجائے آنسو تھے۔ درد تھا۔ وہ اپنی مصیبت کی قسمیں کھا رہی تھی مگر کوئی یقین کرنے والا نہ تھا۔

اپنی انا اور اپنی ذات کے زعم میں مبتلا وہ شخص اس پر رحم کھانے یا یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ وہ مار کھاتے ہوئے سب کو پکارنی ان ناموں میں ایک نام آکاش کا بھی ہوتا اور پھر بدر کے تھکتے ہاتھ دو بارہ پوری قوت سے اسے مارتے۔ وہ درد سے چینی رہی۔ درد جو صرف جسم پر پڑنے والی ضربوں کا نہ تھا، اپنے خواب کی اتنی بھیا تک تعبیر کا تھا۔

☆.....☆

خوب صورت و ناک سی شہزادی کا ناتواں وجود نیلوں میں تھا۔ جسم کا ایک ایک جوڑ درو سے ٹوٹ رہا تھا۔

وہ رات کے آدھے پہر میٹس کے کھلے تنگی والے ماحول میں بیٹھی سسک رہی تھی۔

”وہ تم جیسی شہزادی کو سونے کے بچرے میں قید تو رکھ سکتا ہے مگر تمہاری قدر کبھی نہیں جان سکتا۔ اس کی توجہ حاصل کرتے کرتے تم مر جاؤ گی۔ مگر وہ تمہیں بھی نہیں ملے گا۔“ اس کی سماعتوں میں آکاش کی کبھی کبھی ایک ایک بات گونج رہی تھی۔

”وہ ایک انا پرست اور حاکم ذہنیت کا شخص ہے۔ ویسا بالکل نہیں ہے جیسا تم سمجھتی ہو۔“ درد کی ایک لہر

رداؤ انجسٹ 190 جولائی 2015ء

اس کے پورے وجود سے ہو کر گزری تھی۔

”زندگی خوابوں خیالوں کے سہارے نہیں گزرتی، حقیقت کو تسلیم کرنا سیکھو، تم اس کے ساتھ ٹوٹ جاؤ گی۔“ وہ اسے پکارتے ہوئے زار و قطار رو رہی تھی۔

”میں تمہیں تمہارے سببوں سے اور تصور سے کہیں حسین زندگی دے سکتا ہوں۔“ اسے آکاش بہت یاد آ رہا تھا۔

”میری محبت تمہاری امانت ہے۔ آخری لمحے تک تمہارا منتظر رہوں گا۔ آہ آکاش.....!“ اس کی آنکھوں سے درد کی برسات برس رہی تھی۔

”آکاش! تمہارا تھا تمہارا ہے اور تمہارا ہی رہے گا۔ کسی کے کہنے پر کبھی مجھے مت چھوڑنا، اے آکاش کو مت چھوڑنا، ہم ہمیشہ سے ایک ہی تھے۔ دنیا کے خوف سے، کسی دکھ کے ملنے پر، ہر چوٹ لگنے پر، وہ مہربان و مخلص بائیس اس کے لیے وا ہوتی۔ وہ بہت سے رشتوں کو چھوڑ کر صرف اسی کی طرف بڑھتی۔ آج اس لمحے اسے وہ مہربان بائیس بہت یاد آ رہی تھیں۔ خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہی تھی۔

اس سچے و مخلص شخص نے اپنا ہر وعدہ پورا کیا تھا۔ زمر نے ہر پہل اس سے جھوٹے وعدے کیے۔ وہ ایک وعدہ بھی پورا نہ کر سکی تھی۔ آج وہ اس کی مدد کو آیا تھا مگر زمر نے اسے دھکا کر دیا تھا۔

بدر کے کہنے پر اسے چھوڑ دیا۔ اس نے خود کو بدل لیا تھا۔ کیوں کہ وہ ایک مشرتی لڑکی تھی۔

☆.....☆

وہ ہر بڑا کر خواب سے جاگا تھا۔ اس کا تنفس بہت تیز تھا۔ چہرے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔ اس نے خواب دیکھا تھا زمر بہت برے حال میں تھی اور بچوں کی طرح بائیس پھیلائے ہچکیوں سے روٹی، اسے پاس بلا رہی تھی۔

اس نے جب میں سے پانی گلکان میں اٹھایا اور ایک ہی سانس میں پی گیا۔ بیڈ سے اتر کر وہ کمرے میں بے چینی سے ٹپکنے لگا۔ اسی مضطرب سی کیفیت میں وہ فون تک آیا اور زمر کو فون ملانے لگا۔ رات آدھے سے زیادہ بیت چکی تھی۔ اسے زمر کی بات یاد آئی تو ریسور کر یڈل پر رکھ دیا۔

”کیا کروں؟“ وہ سر تھامے صونے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک ذہن میں طرح طرح کے خیالات آتے رہے۔ پھر وہ اٹھ کر وضو کرنے چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ رب کے حضور زمر کی آسودہ و خوشیوں بھری زندگی کے لیے دعا کرنے لگا تھا۔

☆.....☆

شب خوابی کے نیلے لباس میں وہ بیڈ سے پاؤں لٹکائے بیٹھا۔ اپنی جمائی روک رہا تھا۔ رات بھر اس نے بہت کھل و آسودہ نیند لی تھی۔

اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے وہ چونکا، پورے کمرے میں نگاہ دوڑائی زمر کو کہیں نہیں تھی۔ وہ تیزی سے دروازے کی سمت گیا تھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے پلٹا اور ٹیرس کا دروازہ کھول دیا۔ وہ زمین پر دیوار سے ٹیک لگائے سکڑی کٹی سی بیٹھی تھی۔

”اٹھو۔“ اس نے زمر کو ٹھوس لہجے میں آواز دی۔ وہ اسی طرح غافل رہی۔

”اب کے بدر نے پاؤں کے انگوٹھے سے اسے ضرب لگائی اور اونچی آواز میں حکم دیا۔“

رداؤ انجسٹ 191 جنوری 2015ء

## رودا کی ڈائری

خیالوں کی شمعیں جلائے  
دبے پاؤں آتے ہوئے  
سالوں کو دیکھتے ہیں

نوشین مدثر کی ڈائری سے

فیضان عارف کی نظم

ملال

دقت گزرا تو یہ ملال ہوا  
ختم زندگی کا ایک سال ہوا  
آج زندگی کو عروج ملا  
آج لمحات کو زوال ہوا  
سوچ کی جھیل میں گرا پتھر  
بے سبب منتشر خیال ہوا  
یاد کر کے وصال کے لمحے  
دل یہ پاگل بہت بڑھ حال ہوا  
اتنی شدت سے کوئی یاد آیا  
آج جہتا بڑا حال ہوا  
لوگ دیکھے بہت مگر اب تک  
کوئی حیرت کہاں مثال ہوا  
کوئی جا کر زرا سے کہہ دے  
ہجر میں کیا ہمارا حال ہوا

تجربہ تو قیر کی ڈائری سے

وصی شاہ کی غزل

آج کل زبان پہ وہی سردیوں کا موسم ہے  
تمہاری ہاں پہ وہی سردیوں کا موسم ہے

صباح کی ڈائری سے

ایک خوب صورت نظم

اے نئے سال کے ابھرتے ہوئے سورج  
تمہیں اپنی کرنوں کی قسم  
میری ایک بات مان لو  
کہ اس نئے سال میں  
دل کی راہوں پر چلنے والوں کے  
راستوں کو روشنیوں سے بھر دینا

عانیہ نیازی کی ڈائری سے

نیاسال

نیاسال آیا ہے  
میری ان صبحوں کی نیلی تہوں سے ابھرتا  
خیاں دشت جبل کی ٹھٹھری خوشی میں برقی  
چمکی بجاتا دے پاؤں  
رخ آلود شاموں کی خاموشیاں  
اس کے قدموں کی آہٹ سیٹھے  
گزر گاہوں پر سائبانوں میں نوحہ کناں  
در آتی شب کے در پچوں در زون  
پد شور جھونکوں کی بے مہر ٹھنڈک  
برودت زدہ پانیوں پر پرندے  
کناروں پر ایستادہ پتھروں کی نمناک شاخوں کی  
جانب اڑے جا رہے ہیں  
نکین آنکھوں میں، پتھروں پر  
دھڑکتے دلوں میں ہزاروں

وہ ہڑبڑا کر جاگی تھی۔ اسے دیکھ کر زمر کی روئی روئی متورم نیلی آنکھوں میں خوف اتر آیا تھا۔  
”میرے پاس تمہارے نازخڑے اٹھانے کا وقت نہیں، فوراً کھڑی ہو جاؤ۔“ اس نے پتھر پھوڑے۔  
وہ دیوار کا سہارا لے کر ابھی، ہمت مجتمع کرتی کھڑی ہوئی۔  
بدر نے اس کا بازو سختی سے تھاما اور ٹیس کا دروازہ ٹھوکر سے کھولتا باہر آیا تھا۔ زمر میں کچھ پوچھنے کی  
ہمت نہیں تھی۔ اس کی آنکھ کے پونے رونے کی زیادتی سے سوچے ہوئے اور چہرہ سستا ہوا تھا۔  
وہ بدر کے ساتھ جھپٹتی رہی۔

نیچے میڑھیوں کے اختتام پر ساجدہ جہاں کچن کی سمت جا رہی تھیں۔ ٹھٹھک کر کہیں۔  
”یہ بدر کب آیا؟ مجھے کسی نے خبر تک نہ دی۔“ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ پریشانی فطری تھی۔ وہ تو چھینکتا بھی  
ماں کی اجازت سے تھا۔

زمر کی ابتر حالت۔ مار کے نشانات اس کے چہرے اور گردن پر صاف دکھائی دے رہے تھے۔ بدر کا  
اس کو یوں پکڑے اپنے ساتھ گھسیٹ کرنے کے جانا وہ فوراً سے بیشتر سارا معاملہ سمجھ گئیں۔  
وہ اسے گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ ملازمین کے کوارٹرز کی طرف لایا تھا۔ قطار در قطار بنے ان کو ارٹرز سے گزر  
کر وہ اسے ایک تاریک کمرے میں لے کر آیا جس کی میڑھیوں نیچے زمین کو جاتی تھیں۔  
”تم شام تک یہاں بھوکی، پیاسی، تنہا رہ کر اپنی موت کا انتظار کرو گی یا میرے سامنے اقرار کر کے منجانی  
مانگو گی۔ یہ نہیں کرو گی تو پھر یہ اذیت اور ذلت تمہیں برداشت کرنا ہو گی۔“ اس نے چاچا کر کہتے اس کو  
تاریک و سنسان کمرے میں دھکیلا۔ دھول مٹی سے اٹا کرہ بالکل خالی پڑا تھا۔ زمر نے اس سارے  
دورانیے میں پہلی بار لب دا کیے تھے۔ بدر کے واپسی کو پلٹے قدم رک گئے۔

”آپ کو مجھے اذیت دے کر تسکین ملتی ہے تو میں یہ سب کچھ برداشت کرتی رہوں گی۔ جب تک مجھ  
میں ہمت ہے۔ سستی رہوں گی۔ اس لیے نہیں کہ میں بے بس ہوں یا مجبور، اس لیے کیوں کہ میں آپ سے  
بہت محبت کرتی ہوں۔ آپ کا ہر ظلم ہر اذیت اور ہر ذلت چپ چاپ سہتی رہوں گی۔ ایک نہ ایک دن آپ کو  
میری صداقت پر اعتبار کرنا پڑے گا۔“ کالج سی نیلی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھری تھیں۔ گردن پر نیلا  
نشان خوب صورت چہرے پر بدر کے مضبوط ہاتھ کا نشان، اس کی پیشانی پر چمکتا خون کا نشان، یہ سب کچھ  
بدر کی دین تھے۔

اس کے لہجے میں ایسا کچھ ضرور تھا جس نے ایک بل کے لیے بدر کو ساکت کر دیا تھا۔  
آکاش کا اعتراف یاد آتے ہی اس کے وجود میں شرارے دوڑے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر زمر کے  
سنہری بالوں کو مٹھی میں سختی سے جھکڑا تھا۔

”کل رات کی مار شاید تم بھول گئی ہو۔ اسی لیے تمہاری زبان میرے سامنے چل رہی ہے۔ آئندہ  
میرے سامنے زبان چلائی تو کاٹ کر ہاتھ میں دے دوں گا۔ میرے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں۔ جو کہتا  
ہوں وہ کر گزرتا ہوں۔ آئندہ خیال رہے۔“ اس نے بن پانی چھلکی کی طرح تڑپتی زمر کے بالوں کو کئی بار  
جھکے دے کر دانت پیستے غرا کر کہا تھا اور اپنی مٹھی سے اس کے بال آزاد کیے۔

اس کی بات پر زمر کا پورا وجود تھرا اٹھا۔ بدر اسے وہاں روتا بلکتا چھوڑ کر دروازے کو موٹا سا تالہ لگائے  
چلا گیا تھا۔  
(باقی آئندہ ماہ انشاء اللہ)

## الشعار

حنا علی..... ملتان  
اب کے برس کچھ ایسی تدبیریں کرتے ہیں  
مل کے اک شہر محبت تعمیر کرتے ہیں  
کچھ خواب یقین کی سرحد پر آ پہنچے  
آنکھ کھلنے سے پہلے ان کی تعمیر کرتے ہیں  
نوشین مدثر..... لاہور  
نئی رتیں نئے خواب ہیں اور چاہتوں کے سلسلے  
سال نو کے سنگ ہیں تیری نگاہ رفاقتوں کے سلسلے  
کبھی دن بھر تجھے سوچنا کبھی رات بھر ہے جاگنا  
تیری یاد ہے میں ہوں اور جنوری کی شاموں کے سلسلے  
امبرین حیدر..... اسلام آباد  
منظر بدل گئے پس منظر بدل گئے  
حالات اپنے شہر کے یکسر بدل گئے  
موسموں کے بدلنے پر بھی حیران نہ ہوئے تھے ہم  
اب سوچتے ہیں کتنے کیلنڈر بدل گئے  
نور بانو..... کوئٹہ  
پہلے سے خدو خال نہ پہلے سے ہیں خیال  
ہم کتنا ایک سال کے اندر بدل گئے  
عائیہ نیازی..... ربوہ  
اب کے برس کچھ ایسی تدبیر کرتے ہیں  
چلو ایک شہر محبت تعمیر کرتے ہیں  
خزاں کی اجاڑ شامیں نہ آئیں اگلے سال  
آؤ اس بہار رُت کو زنجیر کرتے ہیں  
☆.....

سہاس گل..... رحیم یار خان  
خرچ ہوتی رہی سانسوں کی نقدی  
سفر ہم رائیگاں کرتے رہے بس  
راؤ تہذیب، حسین تہذیب..... رحیم یار خان  
عیب آتے ہیں نظر تو دوسرے انسان میں  
ہر کوئی اک دوسرے پر طعنہ زن ہے آج کل  
یہ بھی سچا وہ بھی سچا میں بھی سچا ہوں اگر  
کون سچا ہے یہاں اس عالم امکان میں  
مدیحہ اعجاز..... کراچی  
زندگی دوڑتی رہی خزاں کی زہریلی شاموں میں  
اس کا نشان پھر بھی نہ مجھ کو ملاج کے اجالوں میں  
ریمانور رضوان..... کراچی  
جو دل پہ بوجھ ہے اتار دو  
دو دن زندگی کے ہیں نہیں کر گزار دو  
میں تم کو اپنی جان دوں گی سب کچھ  
بدلے میں تم مجھ کو اپنا پیار دو  
عابد محمود..... ملکہ ہانس  
کتنے ہی درد بہانے سے میرے پاس آ کر  
دیکھتے ہیں کہ میری شام سہانی تو نہیں  
فرزانہ شوکت..... کراچی  
وہ پاس نہ کے بھی رکھے گا فاصلہ مجھ سے  
یوں میرے وہ عشق کو بے مثال کر دے گا  
پیٹ کے غم دنیا میں دے گا اپنا غم  
وہ اس طرح سے مجھے مالا مال کر دے گا

## مریم شیخ کی ڈائری سے

### ایک خوب صورت نظم

اجھی کیا کہیں اجھی کیا کہیں  
کہ سر قسطل سکوت جاں  
کف روز و شب پہ شر تھا  
وہ جو حرف حرف چراغ تھا  
اسے کس ہوانے بجا دیا  
کبھی لب بلیں گے تو پوچھنا  
سرخ عمر و سال  
وہ جو لوگوں کا جوم تھا  
اسے دست موجِ نراق نے  
تیرے خاک کب سے ملا دیا  
کبھی گل کھلیں گے تو پوچھنا  
ابھی کیا کہیں ابھی کیا کہیں  
یونہی خواہشوں کے حصار میں  
کبھی بے سبب کبھی بے خلل  
کہاں کون کس سے پھڑ گیا  
کبھی پھر بلیں گے تو پوچھنا

### فاطمہ ظہیر کی ڈائری سے

#### غزل

واسطہ حسن سے یا شدتِ جذبات سے کیا  
عشق کو تیرے قبیلے یا میری ذات سے کیا  
میری مصروفیات اس کو کہاں روک سکیں گی  
وہ تو یاد آئے گا اس کو میرے دن رات سے کیا  
پاس دیکھوں یا کروں فکر کہ گھر کچا ہے  
سوچ میں ہوں کہ میرا رشتہ ہے برسات سے کیا  
جس کو خدشہ ہو کہ مر جائیں گے بھوکے  
سوچئے اس کو کسی اور کے حالات سے کیا  
آج اسے فکر ہے کہ کیا لوگ کہیں گے ساغر  
کل جو کہتا تھا مجھے رسم و رواج سے کیا  
☆.....

درخت پر جو کبھی چوڑیوں سے ڈالا تھا  
اس اک نشان پہ وہی سردیوں کا موسم ہے  
سلگ رہی ہیں ذہن میں قبائیں لفظوں کی  
مگر زباں پر وہی سردیوں کا موسم ہے  
تمہارے آنے پر سورج کے ہاتھ چمکیں گے  
مرے مکاں پر وہی سردیوں کا موسم ہے  
تیری جدائی کے پل سے ہوا ہے عشقِ حنوط  
کہ اس جہاں پر وہی سردیوں کا موسم ہے  
وہ مجھ کو سوئپ گیا فرہمیں دسمبر کی  
درخت جاں پہ وہی سردیوں کا موسم ہے  
ہمارے لب تو دعائیں جلائے رکھتے ہیں  
پر آسمان پر وہی سردیوں کا موسم ہے

### دھنک ناز کی ڈائری سے

#### ایک خوب صورت نظم

بدن کی قید سے نکلیں تو اس نگر جائیں  
جہاں خدا سے کسی شب مکالمہ ہوگا  
جہاں یہ روح کا بھی کوئی حق ادا ہوگا  
نہ دل کو تنگ کرے گی حصول کی خواہش  
نہ کوئی خدشہ لا حاصلی ستائے گا  
نہیں قبول نہ ہوگی صدائے نوحہ گری  
کہ پھر وصول نہ ہوگی شکستِ سادہ دلی  
نہ مرحلے وہ مشقت کے پیش جاں ہوں گے  
کہ جن کے خوف سے لب ہنسنا بھول جاتے ہیں  
نہ ایسی شب کی مسافت کا سامنا ہوگا  
جہاں پہ کوئی چراغ وفا نہیں جلتا  
ایوں کی شاخ پر حرف دعا نہیں کھلتا  
کہیں یہ کوئی مزاج آشنا نہیں ملتا  
غذاب ترک و طلب سے بھی اب نگر جائیں  
زمین کی قید سے نکلیں تو اس نگر جائیں  
جہاں خدا سے کسی دن مکالمہ ہوگا  
جہاں یہ روح کا بھی کوئی حق ادا ہوگا



# اس ماہ میں

اس ماہ کے اقتباس

تعلیم، مشترکہ دشمن

دو بڑے زمین داروں کا ذکر کیے بغیر جھنگ میں میرے ملاقاتیوں کا سلسلہ تشہرہ جائے گا۔ ایک روز ایک بڑے زمین دار صاحب ملاقات کے لیے تشریف لائے خود تو بڑی حد تک ناخواندہ تھے مگر تعلیم کے فوائد اور فضائل پر طویل تقریر کرنے کے بعد بولے:

”جناب! آپ اس پسماندہ ضلع کے لیے نیکی کا ایک اور کام کرتے جائیں فلاں فلاں گاؤں میں ایک پرائمری اسکول کھول دیا جائے۔ تو یہی اس علاقے کے لوگوں پر احسان عظیم ہوگا اگر آپ قبول فرمائیں تو بندہ اسکول کے لیے مفت زمین بیس ہزار روپے نقد اور ایک استاد کی ایک برس کی تنخواہ جیب سے ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔“

ریمانور رضوان۔ کراچی

گدھے

اگرچہ میں سیمینارز کو ذرا تشریح کی نظر سے دیکھتا ہوں لیکن ان دنوں میری شدید خواہش ہے کہ ملکی مسائل کے بارے میں کہیں کوئی سیمینار منعقد ہو اور مجھے اس میں شمولیت کی دعوت مل جائے کیوں کہ ابھی سال ہی میں مجھ پر انکشاف ہوا ہے کہ پاکستان کے مسائل کی اصل وجہ کیا ہے اور میں اس سلسلے میں اپنا تھیمس پیش کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ مجھے ابھی تک کسی جانب سے اس قسم کے سیمینار میں شامل ہونے کے

لیے کوئی دعوت نامہ نہیں آیا اس لیے اپنا یہ زبردست تھیمس آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ جگر تھام کر یا دل پر پتھر رکھ کر اسے پڑھ لیجئے گا یاد رہے کہ یہ انکشاف تازہ ترین اور ملکی مسائل کی جڑ ہے اور انکشاف یہ ہے کہ ہم گدھوں سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ ہم ان سے اتنا لاڈ پیار کرتے ہیں کہ ان کی عادتیں بگڑ گئی ہیں اور وہ پہلے سے بھی زیادہ گدھے ہو گئے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کی تصنیف ”گدھے ہمارے بھائی ہیں“ سے اقتباس  
نوشین منڈر۔ لاہور

اس کا ماہ کا شعر

نیاسال

تو ہے نیا تو رکھا صبح نئی شام نئی  
ورنہ ان آنکھوں نے دیکھے ہیں نئے سال کئی

عاشیہ نیازی۔ ربوہ

اس ماہ کا فلسفہ

زندگی بند دروازہ ہی تھی مگر جو لوگ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے ان کے لیے یہ بند دروازہ کھلنے پر بھی مایوسی نہیں لانا پس اللہ کے فیصلوں پر عمل اعتماد اور رحمت کا کمال یقین ہی تو زندگی گزارنے کا اصل مقصد ہے۔

امبرین حیدر۔ اسلام آباد

اس ماہ کا وعدہ

یہ جو وعدے ہوتے ہیں یہ تو زندگی کی آس

ہوتے ہیں اور آسیں زندہ رہنے پر، بھر کاٹنے پر، دکھ ہونے پر، انتظار کرنے پر، آنسو پینے اور جھوٹی ہنسی ہنسنے پر مجبور کرتی ہیں۔

عابد محمود۔ ملکہ ہانس

اس ماہ کی

ہری مرچیں

شوہر نے کار چلاتے ہوئے نیگم سے کہا۔ ”تورا کار کی کھڑکیاں تو کھول دو گری سے برا حال ہو رہا ہے۔“ بیوی نے جواب دیا۔ ”چپ چاپ بیٹھے رہو۔ پیچھے ہمارے پڑوسی اسلم صاحب کی کار آرہی ہے انہیں پتا چل جائے گا کہ ہماری کار میں ایئر کنڈیشنر نہیں ہے۔“

☆

ایک ماں نے اپنے بچے کو اسکول میں داخل کرواتے ہوئے کہا۔ ”میرا بچہ حساس ہے اسے سزا ہرگز نہ دینیجئے گا اگر یہ اتفاق سے شرارت کر بیٹھے تو اس کے برابر والے بچے کو ذور سے پھینک مار دینیجئے گا یہ خود بخود سمجھ جائے گا۔“

☆

ایک خاتون نے ٹریفک سارجنٹ کو اپنی تیز رفتاری کی وجہ بتاتے ہوئے کہا۔

”میری گاڑی کے بریک خراب ہو گئے ہیں اس لیے میں چاہتی ہوں کہ کسی حادثے کے بغیر گھر پہنچ جاؤں۔“

سیدہ امبر ہاشمی۔ کراچی

اس ماہ عورت کے زوہب.....!

عورت ہی ظالم ہے عورت ہی مظلوم، عورت ہی حاکم ہے، عورت ہی محکوم، عورت ہی ساس ہے، عورت ہی بہو، عورت ہی نند ہے عورت ہی بھانجی۔ اگر تمام فساد کی جڑ عورت ہے تو اسن دامان کی فاختہ بھی عورت ہی ہے۔ ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ استحصال عورت ہی کا ہوتا ہے۔ کہیں اسے کوڑیوں کے مول سچ دیا جاتا ہے تو کہیں اسے ہمیر کی جوتی سمجھا جاتا

ہے وہ تمام ہوش مند مرد جو اپنی بیوی کو ہمیر کی جوتی سمجھتے ہیں کیا وہ اپنی ماؤں اور بہنوں کو بھی یہی وجہ دیتے ہیں کیوں کہ آخر وہ بھی تو عورتیں ہی ہیں۔

اگر عورت بھابھی کی شکل یا پھر نند کے روپ میں فساد کرواتی ہے تو ان ”عقل مند“ مردوں کو تو اپنی آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں اور انصاف سے کام لینا چاہیے۔ انہیں نہ تو بیوی کی محبت میں اندھا ہونا چاہیے اور نہ ہی ماں بہنوں کے پیار میں پاگل۔ انہیں ہر بات کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد ہی دونوں فریقین میں سے کسی کو کچھ کہنا چاہیے۔

ہمارے ملک میں طلاق کی شرح میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ بھی عورتوں کے آپس کے جھگڑے ہیں۔ یعنی عورت ہی ظلم کرتی ہے اور عورت ہی ظلم سہتی ہے۔ عموماً جب کوئی ماں اپنے بیٹے کی شادی کر دیتی ہے تو اسے یہ خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ میرا ہونہار سپوت اس باہر والی (بیوی) کے چکر میں گھس کر مجھے تو بھول ہی جائے گا۔ یہی سوچ بہنوں کی ہوتی ہے بس پھر شوہر کے کان کچھ اس طرح سے بھرے جاتے ہیں کہ وہ نہ صرف اپنی بیوی سے بدگن ہو جاتا ہے بلکہ اپنے بچوں سے بھی بے پروا ہو جاتا ہے۔

اگر یہ مرد اپنی عقل کے خانوں کو کھول کر سوچیں تو انہیں بخوبی احساس ہو جائے کہ وہ عورت جو اپنے اتنے پیارے رشتے چھوڑ کر آئی ہے تو کس کی خاطر؟ اپنے شوہر کی خاطر ہی نا! اگر وہ شوہر بھی اسے اعتماد نہ دے، اس پر اعتبار نہ کرے تو پھر اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ ایک عورت اپنے شوہر سے صرف اعتبار چاہتی ہے۔ وہ اعتبار کا دامن تمام کرمشکل سے مشکل کام سر انجام دے لیتی ہے اگر وہ کوئی غلطی کرتی ہے تو شوہر کو پہلے اس سے بات کرنی چاہیے نہ کہ تین حرف کا استعمال کر کے اس کی زندگی اجیرن کر دے۔ اگر مرد طلاق کا ہتھیار استعمال کرتے ہیں تو اس سے نہ صرف ان کی بلکہ ان کے بچوں کی زندگی بھی داؤ پر لگ جاتی





چاہے تو آپ کو پہلے اپنا آئینہ توڑنا چاہیے۔  
 ☆ تجربہ بہترین استاد ہے لیکن اس مدرسے کی فیس بہت زیادہ ہے۔  
 ☆ ڈپلومیٹ وہ شخص ہے جو ایک عورت کی سالگرہ کا دن تو یاد رکھے لیکن اس کی عمر بھول جائے۔  
 ☆ تین آدمیوں میں راز، راز، راز رہ سکتا ہے۔ بشرطیکہ ان میں سے دو مرچکے ہوں۔  
 ☆ ایک مرتبہ شادی کرنا فرض ہے دوسری مرتبہ حماقت اور تیسری مرتبہ پاگل پن۔  
 ☆ جہوم میں کئی سر ہوتے ہیں لیکن : ماغ نہیں ہوتے۔  
 ☆ مہمان چلے جانے کے بعد اکثر بہت اچھے لگتے ہیں۔  
 ☆ جب دولت محو گفتگو ہوتی ہے تو کوئی قطع کلامی نہیں کرتا۔  
 ☆ اپنے متعلق آپ خود کچھ نہ کہیں یہ کام آپ کے جانے کے بعد ہو جائے گا۔  
 ☆ کوئی آئینہ انسان کی اتنی حقیقی تصویر نہیں پیش کر سکتا جتنی اس کی بات چیت۔  
 ☆ خوشی امید کی ایک "ماسٹر کی" ہے جس سے ہر بند روواڑہ کھولا جاسکتا ہے۔  
 ☆ انسان کی زندگی کبھی پودوں جیسی ہوتی ہے کچھ کو مانی دینے کے لیے اللہ تعالیٰ کسی کو راہ دکھاتے ہیں کچھ کو جھگ کے پودوں کی طرح خود سنبھالتے ہیں۔  
 امیرین حیدرہ۔ اسلام آباد

حضور اکرمؐ نے فرمایا  
 حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا: "ایک آدمی کسی دوسری بہستی میں اپنے بھائی کی زیارت کے لیے گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے راستے میں ایک فرشتہ بٹھا دیا جو اس کا انتظار کر رہا تھا جب وہ شخص اس کے پاس سے گزرا تو فرشتے نے پوچھا۔  
 "تم کہاں جا رہے ہو؟"  
 اس نے کہا۔ "اس بہستی میں میرا بھائی رہتا ہے اس کے پاس جا رہا ہوں۔"  
 فرشتے نے پوچھا۔ "کیا اس کا تم پر کوئی احسان ہے جس کی وجہ سے تم یہ تکلیف اٹھا رہے ہو اور اس کا بدلہ اتارنے جا رہے ہو؟"  
 اس نے کہا۔ "نہیں صرف اس لیے جا رہا ہوں کہ میں اس سے اللہ کے لیے محبت کرتا ہوں۔" فرشتے نے کہا۔ "میں تیری طرف اللہ کا فرشتہ ہوں (اور یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ اللہ تعالیٰ بھی تجھ سے محبت کرتا ہے جیسے تو اس سے صرف اللہ کے لیے محبت کرتا ہے۔) (مسلم)  
 سیدہ نورین۔ کراچی

محبت  
 محبت سے غم اور اداسی ضرور پیدا ہوگی وہ محبت ہی نہیں جو اداس نہ کر دے۔ (اشفا احمد)  
 نوشین مدر۔ لاہور

کچھ کٹھا بیٹھا  
 ☆ اگر آپ کسی بے وقوف کی شکل نہیں دیکھنا

آنکھ بچا کر جگنو پکڑنے نکل آتی تھی۔  
 اس شام بھی ایسا ہی ہوا لیکن گیٹ پار کرتے بابا نے اسے دیکھ لیا۔ "پارس بیٹے کہاں جا رہی ہو؟" اس نے فوراً اپنے بابا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "پلیز بابا جانی بس ایک جگنو کو پکڑ کر ابھی آ جاؤں گی مجھے جانے دیں، پلیز بابا۔"  
 "اد کے لیکن پراس کر دو کہ ابھی پانچ منٹ میں آؤ گی۔"

"جی بس یوں۔" اس نے چنگی بھائی اور بھاگ گئی۔  
 اس نے دادی میں جھانکا جہاں رنگ رنگ کی تتلیاں اور جگنو منڈلاتے ہوئے ایک خوشگوار احساس پیدا کر رہے تھے۔ اس نے اپنے سنہری بالوں کو پینڈ کیا اور ایک جگنو کو اپنی مٹھی میں چھپانے کے لیے بھاگ کھڑی ہوئی۔

شام کا منظر بھیک کر خود کورات کی تاریکی سو رہا تھا لیکن وہ جگنو کو پکڑنے میں اس قدر مگن تھی کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ ایک ایسی جگہ آ گئی جہاں پہلے بھی نہ آئی تھی اس نے اپنی چاروں طرف نظر دوڑائی تو ایک انجان جگہ تھی اور وہ راستہ کہیں نہ تھا جو اس کے گھر کی طرف جاتا تھا اور گرد جگنی درندوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔  
 جگنو پکڑنے کی خواہش اس پر اس قدر حاوی ہو گئی تھی کہ وہ اپنے پیارے بابا جانی سے کیا وعدہ توڑ بیٹھی تھی۔

"اف نہیں۔" اس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھا اور چیخ اٹھی "بابا جانی۔"  
 "پری بیٹے کیا ہوا، خواب میں ڈر گئی ہو۔ یہ خواب تھا اس نے اپنے بابا جانی کے ہاتھ پکڑتے ہوئے حقیقت کی دنیا میں آتے ہوئے سوچا۔  
 پارس نے شکر ادا کیا کہ راستہ بھولنے سے پہلے ہی اسے احساس ہو گیا کہ "خوشامدات کو اپنے اوپر اس قدر حاوی نہیں کرنا چاہیے کہ آپ اپنی منزل کھو بیٹھیں۔"  
 حریم فاطمہ۔ جھنگ

ہے۔ اس سے نہ تو ان کی بہنوں کا کچھ بگڑتا ہے اور نہ ہی والدہ کا۔ جب بہنوں کو اپنے بیٹے گھردوں کو چھوڑ کر روز روز میکے والوں کی خدمت کے لیے آتا پڑتا ہے تو ان کی محبت کی قلعی بھی چار دن میں کھل جاتی ہے۔ اس لیے اپنے بیٹے بیٹے گھردوں کو محض کسی کی باتوں میں آکر اجاڑنے سے پہلے اپنے منہموم بچوں اور بے بس بیوی کی طرف سچے دل سے ایک نظر ضرور ڈال لیجیے تاکہ آپ کو حقیقت کا ادراک ہو سکے۔ باقی آپ مرد تو ماشاء اللہ ہوتے ہی عقل مند ہیں۔

نوٹ: یہ تحریر ان مظلوم بہوؤں کے لیے جو حقیقتاً اپنے سسرال والوں کے ظلم و ستم کا شکار ہیں نہ کہ ان کے لیے جنہوں نے اپنی ساس مندوں کو ناکوں پٹنے چوڑے ہوئے ہیں۔

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

اس ماہ کا

پاکیزہ جذبہ  
 جب تم کسی کو نظر انداز کرو اور وہ تمہیں اس کا بدلہ دے دے تو جان لو کہ وہ تمہیں خود سے زیادہ اور سچی محبت کرتا ہے

ریمانور رضوان۔ کراچی

اس ماہ کا افسانہ

خواب اور جگنو  
 اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ دادی میں جگنوؤں کی تلاش میں وہ اس قدر دور چلی آئے گی کہ واپسی کا راستہ بھول بیٹھے گی۔  
 پہاڑی کے اس پار ایک دلکش وادی تھی جہاں تلی اور جگنو کا کھیل ہوتا تھا۔ وہ روزانہ شام کو اپنے بابا سے

## نصیب والے

جھڑکیاں دینے والا، رعب جمانے والا، وھمکیاں دینے والا بھول چکا ہوتا ہے کہ وہ بھی انسان ہے۔ انسانوں پر رعب جمانے اور انہیں جھڑکیاں دینے کا اسے کوئی حق نہیں۔ ہر نفل استحقاق صرف غرور نفس کا دھوکا ہے اور غرور انسان میں صرف اس وقت تک نہیں آسکتا جب تک وہ بد قسمت نہ ہو۔ نصیب والے ہمیشہ عاجز و مسکین رہتے ہیں۔ (واصف علی واصف)

نورین ملک - کراچی

## سوچ ریزے

☆ کچھ ارادے کچھ فیصلے کچھ خواہشیں دریا کنارے بنی بستیاں جیسی ہوتی ہیں جنہیں کچھ پورا نہیں ہوتا ہوتا۔ وقت مٹی کی ڈھیری میں تبدیل ہو جاتا ہوتا ہے اور انسان کیا ہے ایک مٹی کی ڈھیری اور اکڑنا کتنا ہے؟

☆ کچھ لمحے ایسے بھی تو زندگی میں آتے ہیں جب دعائیں بھی پوری نہیں مانگی جاسکتیں اور ادھوری دعائیں بھی روگ جیسی ہوتی ہیں ہم کسی کا ساتھ مانگتے ہیں اور وہ مل بھی جاتا ہے لیکن پھر نباہ نہیں ہو پاتا۔ فطرتوں میں تضاد نفل آتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے جھگڑے پھیل کر جدائیوں کا دشت بن جاتے ہیں تو وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ ہم نے دعائیں ادھوری مانگی ہوتی ہیں۔ دعائیں تو بڑی لمبل بڑی جامع ہونی چاہئیں۔

عابد محمود - ملکہ ہانس

## یاد کر!

چاہتوں کے سفر میں کچھ یادیں ہمارے ذہن و دل میں بہت گہرے نقوش مرتب کرتی ہیں۔ وہ یادیں ان خوشگوار لمحوں پر محیط ہوتی ہیں جو ہمارے لیے ان گنت مسکراہٹوں کا باعث بنتے ہیں جب کہ ان میں سے کچھ یادیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمارے

لیے نہایت اذیت کا سبب بنتی ہیں۔ جس کھڑی ان یادوں کا دل پر نزول ہوتا ہے اس وقت ہماری آنکھوں سے بے اختیار آنکھوں کا طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ ہم اپنی زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ ہر نئی سانس ہمارے لیے ایک نئی اذیت کی پیامبر بن کر ابھرتی ہے۔ یہ یادیں ایک زہریلی ناگن کی شکل میں ہمیں ڈستی رہتی ہیں اور ان یادوں کا زہر ہماری روح و جسم میں سرایت کر جاتا ہے۔ ہم اپنی زندگی سے اس زہر کو نکالنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں لیکن یہ زہر ہماری رگ و جان میں پیوست ہو جاتا ہے کیوں کہ جن لوگوں کو ہم اپنے دل میں بسالیتے ہیں۔ ان سے وابستہ یادیں ہمارے دل میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ ہم ان یادوں کو بھلانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں لیکن زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر وہ یادیں ہمارے دل پر حملہ آور ہو جاتی ہیں اور پھر سے ان یادوں کے زہر آلود نشتر ہمارے دل میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ یہ یادیں ایک عذاب کی صورت اختیار کر گیتی ہیں اور یہ عذاب زندگی کی سانسوں کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوتا ہے۔ ہم اپنے دل پر بوجھ تو محسوس کرتے ہیں لیکن اس بوجھ سے خود کو آزاد نہیں کر پاتے۔ ہم سانس تو لے رہے ہوتے ہیں لیکن "جی" نہیں سکتے۔ زندہ رہنے اور جینے میں فرق یہ ہے کہ جینے سے مراد ایسی زندگی بسر کرنا ہے جو خوشیوں سے بھرپور ہو۔ ہر لمحہ ہمیں نئی خوشیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ ہمارے ساتھ ایک ایسا شخص ہو جس کا وجود ہمارے لیے سزا یا خلوص ہو۔ ہم اپنی زندگی اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اس کی مرضی سے بسر کریں جب کہ محض زندہ رہنے کا مطلب ایسی زندگی بسر کرنا ہے کہ جس میں ہماری زندگی کی تمام تر خوشیاں ہم سے روٹھ چکی ہوں گویا ہم سانس تو لیتے ہیں لیکن ہمارا دل انہی یادوں کے جھرنگوں میں کھو جاتا ہے اور ہم انہی یادوں میں تمام عمر بسر کر دیتے ہیں۔

ایس امتیاز احمد - کراچی

## تم کیا جانو کہ زندگی کیا ہے؟

زندگی بھی ایک دائرے کی مانند ہے جس کے ہر صفحے پر دن، تاریخ، ماہ، سال زندگی چسپاں ہیں۔ صفحہ ایک سے لے کر آخر تک زندگی اس پر بے شمار تاریخیں لکھی ہیں ہر تاریخ کی نوعیت زندگی کے مزاج پر منحصر ہے۔ جب یہ خوش ہوتی ہے تو دھنک کے ساتوں رنگ ڈائری پر سجائی ہے اور جب ناخوش ہوتی ہے تو ماتمی سیاہ رنگ سے صفحوں کو کالا کر دیتی ہے۔ ہم اگر شروع سے آخر تک اسے پڑھتے جائیں تو پتہ چلے گا کہ تاریخ کے ساتھ ساتھ تحریروں میں کتنی سوچ اور تجربہ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن افسوس کہ جوں ہی ہم ان تجربوں سے فیض یاب ہونے لگتے ہیں ڈائری کے صفحات ختم ہو جاتے ہیں۔

ثناء کنول اللہ دتہ - لودھراں

## محبت

محبت اپنے عروج کے بعد زوال ضرور دیکھتی ہے۔ جس طرح خاموشی سے کوئی دل میں گھر کر جاتا ہے۔ اسی طرح بہت خاموشی سے کوئی اپنے سے برابرا بھی بن جاتا ہے۔ چند واقعات کے لیے محض کچھ لمحے ہی درکار ہوتے ہیں۔ کسی کے دل سے اترنے میں اور پھر دل کی زمین بھر ہو جاتی ہے۔ وہاں محبت پھر کبھی پرذان نہیں چھوڑتی بس یادوں کی کمروری زمین رہ جاتی ہے۔

دانیہ آفرین - کراچی

## مرد اور عورت

ہر خطرناک ایک بچہ ہے۔ جب کسی کی چاہت میں جلا ہوتا ہے تو پھر اسے پانے کے لیے اس کی کیفیت ایک ایسے ضدی بچے کی سی ہو جاتی ہے جسے اپنا من پسند کھلونا ہر حال میں چاہیے ہوتا ہے اور اس کے حصول کے لیے وہ خود کو ہر بازار نیلام تک کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔

جب کہ ہمارے معاشرے کی عورت اکثر ایک ایسی خاموشی جھیل کی مانند ہوتی ہے جس میں پتھر چھینکنے سے وقتی تلاطم ضرور پیدا ہوتا ہے مگر پھر شانت ہو جاتی ہے وہ جس سے محبت کرتی ہے اسے پانا بھی چاہتی

ہے مگر جب کوئی راہ دکھائی نہ دے تو حالات کے آگے ہتھیار بھی ڈال دیتی ہے۔ دعاؤں کی چھاؤں میں وہ اپنی چاہت کو نم آنکھوں سے اپنے ہی ہاتھوں کی اور کو سوئپ دیتی ہے اور افسانہ تک نہیں کرتی۔

زارا صدف قمر - کراچی

## دولت

دولت کا انبار کھاؤ اور کوڑے کے ڈھیر کی مانند ہے۔ جس شخص کے پاس یہ ڈھیر جمع رہتا ہے اس کے وجود سے اس کے گرد و نواح اور اس کی سانسوں سے بدبو کے بھیکے آتے رہتے ہیں لیکن جو نئی کھاؤ کا یہ ڈھیر و روز بکھیر دیا جاتا ہے اور آسمانوں سے اس پر شبنم کا نزول ہوتا ہے۔ تو اس میں سے خوب صورت رنگوں والے خوشبو دار پھول پیدا ہوتے ہیں جن کی خوشبو سے ساری کائنات مہکتی ہے۔

اشفاق احمد شہر آرد - صفحہ 368

## ذرا سوچو

☆ اندھیرا آپ کو اندھیرے سے باہر نہیں نکال سکتا صرف روشنی ہی ایسا کر سکتی ہے۔ نفرت آپ کو نفرت سے باہر نہیں نکال سکتی صرف محبت ہی آپ کو نفرت سے باہر نکال سکتی ہے۔

☆ جب تمہاری مخالفت حد سے بڑھنے لگے تو سمجھ لو اللہ تمہیں کوئی مقام دینے والا ہے۔

☆ عزت کے موتی پر اگر ایک بار سیل آجائے تو سینکڑوں دریا بھی اسے دھوئیں سکتے۔

☆ خوشامدیوں سے بچو وہ تمہیں کسی بھی جگہ ذلیل کروا سکتے ہیں۔ (حکیم اقلیوس)

☆ اگر تم سخت محنت کے عادی ہو تو مفلسی تمہارے نزدیک نہیں آئے گی۔ (زر تشت)

☆ اپنے سے اچھے کو تلاش کر، اپنے جیسے کے ساتھ تو عمر ضائع کروے گا۔ (حضرت شیخ سعدی)

زارا صدف قمر - کراچی

# دورانِ سحر کہنا

دھڑکنوں کا قرار اللہ ہو  
زندگی کی بہار اللہ ہو  
تیری رحمت کے سبب اب تک  
ہے یہ روشن دیار اللہ ہو  
سوگھی شاخوں کے سر پر ہنہ پر  
پھر گلوں کا سنگھار اللہ ہو  
خنگ، بخر، ویران دھرتی پر  
بارشوں کی پھوار اللہ ہو  
دنیا والے سب مان جائیں گے  
ہے دلوں کا نکھار اللہ ہو  
سب ترے کرم سے ہی ممکن ہوا  
ہے جو گل کا دقار اللہ ہو  
سہاگل

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
کلی کھلتی ہے بسم اللہ کہتی ہوتی کھلتی ہے  
بادل سے بوند پھرتی ہے بسم اللہ کہتی آتی ہے  
بحر و بر بسم اللہ کہہ کر آواز سناتا ہے  
پانی کا گھونٹ حلق سے جاتا ہوا بسم اللہ کہتا ہے جانا  
صبح کو آنکھ بسم اللہ کہتی ہوئی کھلتی ہے  
فرخ سلطانہ

نیاسال

جان نورا  
سنو جاناں

ظہر  
کچھ دیر بھلا کر ان پرانی باتوں کو  
جو تمہارے میرے درمیان آئیں ہیں  
جو دوری کا سبب تھیں  
آؤ جان نور  
ہاتھوں میں ہاتھ لے کر  
شانوں پر سر کا کر  
ایک دو بے کوبانہوں میں بھر کر  
دسمبر کی دھوپ میں بیٹھ کر  
اپنے درمیان سے خفکیاں  
غلط فہمیاں، دوریاں نکال کر  
آؤ جان جاناں  
مل جل کر تمام اگلی پچھلی باتیں یاد کریں  
کہ تم کہاں صحیح تھے  
میں غلط تھی  
کہاں میں غلط تھی  
تم صحیح تھے  
اور.....  
کہاں وقت غلط تھا  
اور کیا اچھا ہوا؟  
کیا برا ہوا؟  
کہتی مہکتی جنوری کی دلہیز پر  
کچھ رنگ زریست کے بکھیریں

ریمانور رضوان

رداؤ انجسٹ 202 جنوری 2015ء

نظم

دن ڈھلنا نہیں  
دن گزرتا نہیں  
کچھ بھی اب نہیں  
بھاتا ہے مجھ کو  
سب کچھ ادھورا ادھورا

سا  
گلتا ہے  
نہ بھوک لگتی ہے نہ ہی پیاس لگتی ہے  
نہ آنکھ لگتی ہے  
نہ ہی نیند آتی ہے  
نہ سکون ملتا ہے  
نہ ہی چین ملتا ہے  
جاناں  
جب تم مجھ سے  
روٹھ جاتے ہو

نظم

چاہتوں کی منزل تک  
خواب نگر کے  
رستے میں  
گر رکاد میں انگنت  
قدم تمہارے تھکا ڈالیں  
چاہتوں کے بدلے میں  
نفرتوں کے سنگی ہوں  
پیار بھری باتوں کو  
طرز بھرے لہجوں کا  
سامنا ہر سو ہو  
من نور میں میرے  
تم کو چلتے رہنا ہے  
اس وقت تک کے تمہاری  
خواب نگر تک جاتی راہ

افسانہ آفتاب کاوش

تم کو چاہتوں کی منزل  
تک خود ہی  
حوصلوں کے ساتھی کو سنگ تمہارے  
ہم قدم نہ کروے

مریم ماہ منیر

اگر

سر پٹختے  
ایڑیاں رگڑتے  
ہراک کو  
مناتے  
روتے  
چینتے  
چلاتے  
اگر  
ضد کرنے سے  
تم مل جاتے

جہان آفتاب

محبت کے اسیر

محبت کے اسیر اکثر  
محبت تغیر نہیں کر پاتے  
ہشٹی بردستی  
ہیرے جیسی چاہت  
کو ٹڈی لگیروں میں بدل ڈالتے ہیں  
محبت کے مطلب، معانی، معیار سے عاری  
اپنی سوچوں کے قافلوں کو  
ہر سمت دوڑاتے رہتے ہیں  
جذبے پر کھتے ہیں  
وفا میں تولتے ہیں  
کبھی اس سے  
کبھی اس سے ملاتے رہتے ہیں  
یہ محبت کی شدتیں ہی اکثر  
اس کی روح کو گھائل کر جاتی ہیں

رداؤ انجسٹ 203 جنوری 2015ء

یہ دوسروں کو  
مورد الزام ٹھہرانے والا "عشق"  
اپنی مات کا اکثر  
خود ہی سبب بنتا ہے  
منہ زور دل کی  
لافتناہی خواہشیں  
بے پناہ حسرتیں  
جو پیار کے رستوں پر بھی  
پر جوش قدم چاہتی ہیں  
اور حقیقی کے محاذ پر بھی  
جنگ کی قائل ہیں  
پھر وہ خود کو سزا کیسے سنائے؟  
جو محبت! خود اپنی ہی قاتل ہے  
اپنی جلالت، کم ہمتی، ناقدری سے اکثر  
انمول سچے تعبیر نہیں کر پاتے  
عہد ناموں کے محل اوسارنے والے  
اعتبار تعمیر نہیں کر پاتے  
محبت کے اسیر اکثر  
محبت تسخیر نہیں کر پاتے

حیران افشا

غزل

آنکھوں میں انتشار بڑی دیر تک رہا  
کل اس کا انتظار بڑی دیر تک رہا  
کل اس کی یاد نے مجھے تڑپا کے رکھ دیا  
دل میرا بے قرار بڑی دیر تک رہا  
شاخِ وفا پر پھول کوئی کھل نہیں سکا  
گو موسم بہار بڑی دیر تک رہا  
اس نازنین کو رب نے دیا ہے عجیب حسن!  
چاند اس پہ جاں نثار بڑی دیر تک رہا  
سچ ہے کہ مجھ کو ترک تعلق کے باوجود  
اس بے وفا سے پیار بڑی دیر تک رہا

حکیم خان حکیم

دیباچہ

ذرا پوچھو تو مجھوں سے دیباچہ کی قیمت  
کہ کیوں وہ چومتا تھا شہر لیلیٰ کی گزرگاہیں  
زیلچا کے قصر پوست گئے کتنے مراحل میں  
مگر یعقوب سا یارو کہاں سے ہم جگر لائیں  
نہیں میرے محمد کا زمانے میں کوئی ثانی  
کرے فائق نہ کیوں ان کے مدینے کی تمنا لیں

عمران فائق

غزل

شامل جو محبت میں اذیت نہیں ہوتی  
اے دل کبھی کبھیل جمعیت نہیں ہوتی  
جو ہوش نہ ہو سر کا وہ ہوتی ہے عبادت  
سر جہدے میں رکھنے سے عبادت نہیں ہوتی  
کچھ اپنے ہیں انہوں کا گلہ کس سے کریں ہم  
کچھ غیر ہیں تو غیروں سے شکایت نہیں ہوتی  
جان دینے کا تمہیں شوق ہے تو سن لو  
مقل میں ترپنے کی اجازت نہیں ہوتی

فرزانہ شوکت

لڑکیاں!

کتی نادان ہوتی ہیں لڑکیاں  
بچپن سے خواب بنتی ہیں لڑکیاں  
ماں باپ بھائیوں کی سلامتی کے لیے  
خدا سے سجدہ رد ہوتی ہیں لڑکیاں  
ماں باپ کا مان رکھتی ہیں  
بھائیوں پر جان چھڑکتی ہیں لڑکیاں  
نازک سا ارمان دل میں لیے رکھتی ہیں  
زندگی میں بس پیار چاہتی ہیں لڑکیاں  
کانچ کی چوڑیوں سے خوش ہونے والی  
سچا ہمسفر چاہتی ہیں لڑکیاں

ایس امتیاز احمد

غزل

اس نے جب درد بڑھانے کا ہنر سیکھ لیا  
میں نے بھی اشک چھانے کا ہنر سیکھ لیا  
اس نے سیکھا ہے ہنر قطع تعلق جب سے  
میں نے ہر طور بھانے کا ہنر سیکھ لیا  
رد ٹھ جانے کا اسے شوق ہوا ہے جب بھی  
میں نے ہر بار منانے کا ہنر سیکھ لیا  
سامنا ہونے لگا ہے میرا رسوائی سے  
جب سے آئینہ دکھانے کا ہنر سیکھ لیا  
بھول جانے کا بشارت وہ کبھی کھیل تماشے  
میں نے جب چھوڑ کے جانے کا ہنر سیکھ لیا

سید بشارت شاہ

نظم

اے دلبر اندہ یاراں تو نے چھوڑ دی

وہ الفت وہ عنایت

وہ خوشیاں ہزاروں

وہ امر محوں کی ساوگی

وہ بات بے بات کھلکھلانا

وہ لوٹ کے اب نہیں آئے گا زمانہ

وہ بہاروں کی خوشیاں نہ کھریں گی واحد ان کو

وہ تھلیاں نہ چھوڑیں گی رنگ بوؤں پر

وہ آشیانہ ناب روشن ہوگا تیرے وجود سے

جس میں نہ ہوگی مسکراہٹ تیری

وہ شاعروں کے بچوں میں ماہوں گی

نہ ہوگی نینوں میں آگے سرور کی

کہاے دلبر اندہ یاراں لوٹ آ اب کہ

دسمبر گزار میں بھنگی بھنگی رت ہے ابھی

کہ آملاکر جنوری کو خوش آمدید کہیں

سارہ احسان

نظم

تیری یادوں کی روانی

اور یہ جنوری  
میری باتیں تری کہانی  
اور یہ جنوری  
میرا ہاتھ تیرا ساتھ اور لمبی سڑک  
اور یہ جنوری  
گم سم شامیں سنہری راتیں  
اور یہ جنوری  
بہتی ندی گاتے پنچھی اور اڑتی دھند  
اور یہ جنوری  
کالی، بستر، تری محبت  
اور یہ جنوری  
تہا سن، تہا چاند میرا کرا  
اور یہ جنوری  
میری آنکھیں، میری نیند، تیرے خواب  
اور یہ جنوری

شاہ کنول اللہ دتہ

غزل

وہ اپنے چال بدلتا نہیں کبھی  
پھول سائے کے ساتھ چلتا نہیں کبھی  
دے کے داغ جدائیوں کے ہمیں  
میرے غم میں تیرا پیار ڈھلتا نہیں کبھی  
تیری سوچوں کے گہرے سمندر میں  
یہ دل میرا پھر سے ڈوبتا نہیں کبھی  
فضا صاف ہے تیرے پیار کی طرح  
کوئی کسی کے غم میں جلتا نہیں کبھی  
ہم کیوں نہ بدل لیں راہیں اپنی جاوید  
یہ دل کسی کی یاد میں دھڑکتا نہیں کبھی  
محمد اسلم جاوید

غزل

وہ جس کی خاطر ہر رشتہ چھوڑتا چلا گیا  
ایک خواب تھا وہ بھی ٹوٹا چلا گیا

رداڈا مجسٹ [205] جنوری 2015ء

رداڈا مجسٹ [205] جنوری 2015ء

ستاروں کو چھونے کی تمنا میں جو آگے بڑھا  
سفاک تھا اس قدر زمانہ روندتا چلا گیا  
جانے کیوں دلوں میں اس قدر کدورتیں آگئیں  
بھری محفل میں ہی وہ منہ موڑتا چلا گیا  
خوابوں ہی خوابوں میں ٹوٹے ہوئے خوابوں کو  
خوش فہمیاں اس قدر کہ جوڑتا چلا گیا  
شہرتوں سے بھلا مجھے کیا مطلب سحر  
ایک احساس تھا جوان کی طلب میں بھجوتا چلا گیا

سحر نہیں

آنسو

میں مر بھی جاؤں تو

میرے جنازے کے قریب  
مت آنا

کیوں کہ  
میرے ہاتھ نہیں اٹھیں گے تیرے  
آنسو پونچھنے کے لیے

کادش اقبال

دسمبر کی آخری رات

دسمبر کی آخری رات  
گزرے سال کے نقش خالی دالان  
جنوری کی کن من میں  
بھگی راتیں، نرم کرنوں کا دان  
فروری کے رومانوی رنگ میں  
محبت کے جنم، عہد و پیمان  
مارچ کی مہکتی فضا میں  
ہنتے چہرے، بھگتے نین  
اپریل کی بوجھل چادر میں  
اداس آنکھیں، دل بے چین  
مئی کے بدلتے تیوروں میں  
جہاں سورج سلگتے چمن

جون کے تپتے صحرا میں  
آبلہ باوصال کٹھن  
جولائی کی پگڈنڈی پر  
آنکھیں سوئی خواب رہن  
اگست کے کیڑوں سے  
جھانکتے جبے دل ناداں  
ستمبر کی سرشاری میں  
گنگنائے لب حسین گمان  
اکتوبر کے سرمست بادل پر  
پیار کے برندے تیر گمان  
نومبر کی آنکھ پجولی میں  
بچتے سینے وہم حیران  
دسمبر کی خشک ہواؤں میں  
ٹھٹھرتا لان، تیرے وجدان  
دسمبر کی اس آخری رات میں پھر.....  
تیری آہٹ کے امکان دل خوش گمان

نائل طارق

سال نو

اب کے جو نیا سال آئے  
سب کے لیے خوشیوں کا پیغام لائے  
نہ کسی دل میں کدورت رہے  
نہ کسی دل میں رنجش رہے  
نہ کسی دل میں غموں کا بسیرا ہو  
نہ کوئی آنکھ آنسوؤں سے نم ہو  
کسی کے ہاتھ سے نہ کوئی ہاتھ چھوٹے  
نہ کوئی اپنا کسی اپنے سے روٹھے  
سب بچھڑے ہوؤں کو ملائے  
اب کے جو نیا سال آئے  
سب کے لیے خوشیوں کا پیغام لائے

راجہ افضل خان

اے سال نو

اے سال نو

رداؤ انجسٹ 206 جنوری 2015ء

تو اپنے ساتھ

بہار لانا  
جس سے پھول کلیاں سب کھل اٹھیں  
ایسی خوشبو لانا  
جو ہر سوتا زگی بکھیر دے  
ایسا موسم لانا  
جس سے دکھ مٹ جائے  
غم چھٹ جائے

دلوں پر چھائی گرد بھی ہٹ جائے

سال نو تو اپنے ساتھ

ایسی صبا لانا  
جو نغمہ توتوں کو کدورتوں کو مٹا دے  
سال نو تو ایسا آفتاب لانا  
جس کی روشنی سے اندھیرے چھٹ جائیں  
جس کی کرنیں باہم امید ہوں  
اے سال نو ایسی شام لانا  
جو سب رنج و ملال اپنے اندر سمیٹ لے  
ایسے تارے اور چاند لانا  
جو محبت کا پیغام ہوں

اے سال نو تو میرے ہم وطنوں کے لیے

امن لانا

سکون لانا

چمن لانا

خوشیاں لانا

دانیہ آفرین

شب غم

آج شب پھر کوئی بچہ فاتح سے سویا ہے  
پھر اک بے بس باپ خون کے آنسو روایا ہے  
سیاست کے دیوانوں سے اک مزدور گویا ہے  
ہڑتالوں نے کیا دیا ہے؟ کیا پایا کیا کھویا ہے؟  
غربت کے ماروں نے پھر بوجھ نیا اک ڈھویا ہے  
حالت یہ ہے مہمانوں کی آمد پر سفید پوش رویا ہے

رداؤ انجسٹ 207 جنوری 2015ء

لیکن فکروں سے آزاد اور چین سے کب وہ سویا ہے  
بس سوچوں میں رہتا ہے گم سم کیا کانا کیا بویا ہے؟  
اس شہر میں بسنے والوں نے خون کو اپنے ڈھویا ہے  
قاتل مقتول کے جنازے پر آکر زور سے رویا ہے  
انصاف تو اندھا ہے اور ہمت کہنے کی کس میں  
میرے شہر کو میرے لہو میں تم نے ہی تو بھگویا ہے  
شمیذہ فیاض

پکار

شام کے دھندلے  
ڈوبتا سورج  
لوٹتے چھٹی  
لہراتا آجیل  
یادوں کے جھونکے  
ہتے آنسو  
بھگی پلکیں  
بوجھل من  
تنہا میں اور ایک پکار  
لوٹ آؤ ناں

صائمہ قریشی۔ آکسفورڈ

اے نئے سال

اے نئے سال!

میری دعا ہے اس سال

کچھ ایسا کرنا

پیار کرنے والوں کا دامن

سچی خوشیوں سے بھرنا

سب نغمہ توتوں، کدورتوں، غلط فہمیاں

دلوں سے ختم کرنا

خلوص، پیار، وفا، چاہت سے

سب پیاروں کے دامن بھرنا اور

انہیں سدا سلامت رکھنا (آمین)

ایمنہ رؤف، مصباح مسکان



## سنہریسے

**صانعہ قریشی..... آکسفورڈ**  
 السلام علیکم! ردا قارئین کی خدمت میں صائمہ قریشی کا پہلا پیار بھرا سلام۔ ”سو جان سے دل ہارنے“ ردا میں میری پہلی تحریر۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے اس بیٹھے بٹھائے آتے خیال کو اتنی پذیرائی ملے گی۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ کن الفاظ میں، میں ان ڈھیروں میسج کا شکر یہ ادا کروں جو میری اس شوخ سی تحریر کے بعد آپ سب کی طرف سے ملے۔ اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ اس کے بعد میری فیملی کی حوصلہ افزائی اور پھر میری وہ بہت پیاری سی فرینڈز جن کی وجہ سے جن کے پیار کی وجہ سے میں قلم کو رکھ نہیں پاری ہوں سب کا نام لینا ممکن نہیں ہے کیوں کہ میری یادداشت کبھی کبھی باداموں کی مرہون سنت ہو جاتی ہے اور پچھلے کچھ دنوں سے مصروفیت کی وجہ سے باوام کھانے کا نام نہیں مل رہا ہے۔ کسی کا نام رہ گیا تو بھرم ٹوٹ جائے گا۔ اچھا بھلا امپریشن خراب ہو جائے گا (ہاہاہا)۔ میں صالحہ آنٹی کا تہہ دل سے شکر یہ ادا کرنا چاہتی ہوں جن کی سپورٹ نے بہت خوشی دی۔ اور انشاء اللہ بہت جلد آپ ردا کے صفحات پر صائمہ قریشی کی ایک اور طویل تحریر دیکھ سکیں گے۔ آپ سب کی محبتوں کی حوصلہ افزائی کی مجھے بہت ضرورت رہے گی۔ آپ سب کے تہرے تعریف و تنقید کا انتظار رہے گا۔ بہت ساری دعاؤں اور نیک خواہشات کے ساتھ آپ سب کی اپنی صائمہ قریشی۔

**افشاں علی..... کراچی**  
 بہت ساری دعاؤں و نیک تمناؤں کے سنگ افشاں علی حاضر ہے۔ سٹا کلاوز کی مانند دعاؤں و محبتوں کے نکلنے حرفوں کی صورت تکبیر نے افشاں علی آپ سب کی بزم میں حاضر خدمت ہے۔ وقت کا تمہ دتیز و خارا ہر شے کو بہا کر لے جاتا ہے۔ ابھی سال کا آغاز ہوا تھا کہ اختتام آ پہنچا۔ پلک جھپکتے سال بیت چلا زندگی کی زاہ گزرنے ایک اور سال کی مسافت طے کر لی۔ شب و روز، ماہ و سال کا پریچ سفر راہ میں کتنے ان دیکھے موڑ آئے اور گزرتے چلے گئے۔ کبھی منزل ملی تو کبھی سراپ، کبھی عروج تو کبھی زوال پر زندگی کا سفر ایسے گمان نہ گیا اور یوں ہی گزرتا چلا۔ نئی خواہشوں نئے خیالوں نئی امیدوں اور نئے خوابوں تلے ایک اور سورج طلوع ہونے کو ہے۔ سال نو دلہیز پر آکھڑا ہے اور سال گزشتہ یادوں کی کھڑکی سے دبے پاؤں رخصت ہو چلا۔ دعا گو ہوں کہ نیا سال ہم سب کی زندگی میں روشنی بن کر آئے اور ہمارے ملک میں امن سلامتی اور خیر کا اجالا ہو، آمین۔ اب باری آتی ہے تنگ سرود خلتی بھرے دبیر کی۔ ٹائیکل ہے حد پسند آیا جیسے کوئی معصوم الہیسی ووشیزہ نئی نویلی وہن کی مانند شرمیلی سی نگاہ و خوب صورت سی مسکراہٹ لیے نئے سال کی منتظر ہو۔ سب سے پہلے فہرست پر نگاہ دوڑائی اتنے سارے افسانے واؤ زبردست وہیں اپنے افسانے کو بھی شامل دبیر دیکھ کر از حد خوشی ہوئی۔ آپ کی سرگوشاں پر دھیں۔ آپنی ان مصنفات میں میرا

جو شمار نہیں نا جو تکبر کرتی ہیں کیوں کہ میں تو بڑی اچھی سی پیاری سی بچی ہوں نا (آہم) اور سندیے میں شامل بھی رہتی ہوں اللہ تکبر سے بچائے۔ تمام سلسلے دار ناول اپنی اپنی رفتار سے اپنے اپنے مدار میں محوسر نظر آئے۔ تمام رائٹرز کا کام و نام قابل تعریف ہے۔ ایمان علی کا رخ و غریب گھرانے کی مالی حالات کی عکاسی کرانا اور اللہ پر بھروسہ سا بڑھا تا ناولٹ اچھا تھا۔ اس بار اتنے سارے افسانے شامل دبیر رہے کہ کس کس کے بارے میں لکھوں ”اس بحر کرب میں“، ”ہم کئی بار مرنے والے تھے“، (ریسل آرزو کی ردا میں یہ پہلی تحریر تھی۔ آپ کو بہت سارا ویکلم)، ”دبیر کی شام“، ”خوشیوں کے آنگن میں“، ”رفاقوں کے نئے خواب“ لے کر چلی آئی۔ ”وقت کا دست ستم“ دیکھیے۔ ”دبیر“ آیا پر ”وہ لمحہ نہیں ملا“، ”معمولی گرہ“ کھلی تو ”پچھتاوا“ (عائشہ خان آپ کو بھی ویکلم) اور ”احساس“ نے ”تمہی داماں لوگوں“ کو گھیر لیا۔ الغرض ہر تحریر اپنی جگہ اچھی رہی۔ اب کے دبیر میں میری ایک قلم بھی شامل رہی میرے افسانے ”معمولی گرہ“ کے بارے میں آپ اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔ پیاری ریمانورا میرا وجود ریزہ ریزہ کہانی آپ کو بے حد پسند آئی اور اپنے دل کے قریب تر لگی۔ آپ کی پسندیدگی کے لیے بہت بہت شکر یہ ڈیڑھ۔ ساتھ ہی پیاری سی کیتی آراء، زاہدہ ہاشمی، شہ کنول اللہ ویتہ اور اچھی سی صبا عبدالغنی میری پیاری دوستوں میری تحریر و سندیے کو پسند کرنے، آپ سب دوستوں کے نام پیغام میں شہ کنول اللہ ویتہ کی جانب سے اپنے نام پیغام دیکھ کر از حد خوشی ہوئی۔ پیاری دوست آپ مجھے بے حد عزیز ہو۔ یہ کئی دوستی یوں ہی برقرار رکھیے گا۔ باقی ردا کے تمام سلسلے چاہے اشعار ہوں یا شاعری، لیکن ہو یا بیوی پس سب ہی اچھے اور کارآمد ہوتے ہیں۔ اب بہت ساری دعاؤں پیار و چاہت اور نیک تمناؤں کے سنگ افشاں علی کو اجازت

سندیے کے سنگ ہمارا اور آپ کا تعلق ورشتہ یوں ہی برقرار رہے، آمین۔  
**نانکہ طارق..... کراچی**  
 السلام علیکم! صالحہ آپنی اور ردا کے تمام قارئین اور مصنفات، آپ سب کو نئے سال کی بہت بہت مبارک باد۔ دبیر کا شمارہ بھی بہت زبردست رہا۔ ہمیشہ کی طرح سرورق سے آخر تک آپنی کی حوصلہ افزائی اور ہماری نئی رائٹرز کے اضافے نے ردا کو مزید چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نئی رائٹرز بہت محنت کر رہی ہیں۔ سب ہی بہت اچھا لکھ رہی ہیں اس لیے ان کو پڑھنا بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ مجھے ان سے بہت کچھ نیا سیکھنے کو ملتا ہے جب کہ اپنی سینئر رائٹرز کو پڑھنے سے قلم میں نکھار آ جاتا ہے مجھے یاد ہے۔ ایک بار آپنی نے مجھ سے کہا تھا کہ ”لکھتی رہو قلم نہیں رکنا چاہیے“ ویسے سے دیا جتا ہے۔ میں اپنی ساکھی نئی رائٹرز سے بھی یہی کہوں گی کہ آپ سب لکھنے کا سفر جاری رکھیں۔ ردا ڈائجسٹ میں مصنفات کا کارواں بڑھتا جا رہا ہے۔ ماشاء اللہ ردا کی کامیابی قابل تحسین ہے جس کے لیے میں صالحہ آپنی اور ردا کے تمام اسٹاف کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ نومبر کے شمارے میں سب سے پہلے آپنی کے ”میرا پیار کا پہلا شہر“ نے سحر میں جکڑا تھا۔ بہت عمدہ اپنے نام کی طرح۔ آپنی! سب کی طرح میری بھی یہ فرمائش ہے کہ آپ کے قلم سے ایک اور اب شاہکار ناول ردا کی رونق بڑھانے آجائے۔ آخر میں تمام قارئین جو میری تحریر پڑھتی ہیں۔ رائے دیتی ہیں۔ جراک اللہ۔ یہ سب میرے لیے بہت معنی رکھتا ہے۔ آخر میں ایک بار پھر آپ سب کو نئے سال کی ڈھیروں مبارک باد۔  
**دابعہ افضل خان..... کراچی**  
 پیاری اینڈ سوئیٹ سی صالحہ آپنی ردا اسٹاف اور ردا کی سب ہی رائٹرز و قارئین کو رابعہ افضل خان کی

طرف سے نئے سال کے آغاز کے ساتھ محبت کی چاشنی سے لبالب بھرا سلام قبول ہو اور ساتھ ہی نیا سال بھی مبارک ہو۔ خدا کرے یہ سال ہم سب لوگوں کے لیے ڈھیروں خوشیاں اپنے سنگ لائے، آمین۔ اب ہات ہو جائے دسمبر کے ردا کے برورق پر موجود فارینہ اپنے نام کی طرح پیارے سے میسر اسٹائل اور میک اپ کے ساتھ بہت منفرد اور پیاری لگی پھر ”گوشہ آگہی“ کی طرف بڑھے اور صالحہ آبی کے گوشہ آگہی کو پڑھ کر دسمبر سے جڑی کچھ یاویں تازہ ہو گئیں۔ آپ کی طرح دسمبر میرا بھی بہت فیورٹ ہے۔ دھند میں لپٹے بھیکے بھیکے سے دسمبر کی تو کیا یہی بات ہے۔ آئی لو دسمبر۔ ”ردائے جنت“ ہمیشہ کی طرح بہت دلچسپ لگا۔ شازبہ جی ”تجھ سے مانگوں میں تجھ کو“ کی قسط زبردست لگی۔ شہر بار اور حسنی کی نوک جھونک نے بے ساختہ چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ نائلہ طارق جی ”جو عشق میں جیتی وہ عشق ہی جانے“ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سپر ہٹ رہا۔ جہلانے اچھا مشکل میں ڈالا تھا۔ بے چارے عثمان کو عارش کے سامنے مگر بہت مزہ آیا۔ روشانے عبدالقیوم ”مشرق کی شہزادی“ کی یہ قسط بھی زبردست رہی۔ مگر بے چارے آکاش کے لیے افسوس بھی ہوا۔ قمر و شہک جی ”تیرے پیار کی خوشبو“ کی یہ قسط بھی ہمیشہ کی طرح دل چھو گئی۔ افسانے میں افشاں علی، عائشہ خان، مہرین کنول، یاسمین اختر، حافظہ مون شاہ، امبر افکن، ایہان علی، ریمیل آرزو، ثناء کنول، حنا اصغر، نائلہ طارق، شاہدہ علی، مدیحہ اعجاز سب ہی نے اپنی اپنی جگہ بہت اچھا لکھا۔ صائمہ قریشی ”سو جاں سے دل ہارے“ نام کی طرح زبردست ناول تھا۔ ایمان علی آپ نے بہت اچھے موضوع پر قلم اٹھایا۔ واقعی اللہ پر بھروسہ ہمیں ہماری سوچ سے بڑھ کر نوازتا ہے اس ماہ میں افشاں علی، سعدیہ عابد، سیدہ فرزانہ حبیب فرزین نے زبردست لکھا۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ افشاں علی،

یاسمین آفریدی، سعدیہ عابد نمبر لے گئیں۔ ”سندیے“ میں ریمیا نور رضوان، گیتی آرا، صبا عبدالغنی نے بہت اچھا اور تفصیلی تبصرہ کیا۔ ثریا اقبال ”کچن“ میں مزے دار سوپ کی ڈشز دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔ ”سنگھار“ میں موسم سرما سے متعلق بیوٹی گائیڈ بھی اچھی تھیں۔ ریمیا نور رضوان جی اور صبا عبدالغنی جی آپ لوگوں کا بہت شکر یہ کہ آپ نے میرے ناول کو اتنا پسند کیا اور سراہا اور سندیے میں اپنی قیمتی رائے سے آگاہ کیا اس کے لیے میں آپ کی تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ آپ لوگوں کی قیمتی رائے میرے لیے بہت اہم ہے۔ سعدیہ عابد جی اور افشاں علی جی آپ دونوں اس بار کہاں غائب ہو گئیں سندیے کی محفل سے۔ صالحہ آبی نئے سال کے آغاز پر آپ کے لیے اور باقی تمام اشاف رائٹرز و قارئین کے لیے بہت ساری دعائیں خدا ہم سب کے لیے نیا سال ڈھیروں ڈھیروں خوشیاں لائے (آمین)۔ خدا ردا کو بھی دن دو گئی تری سے ہم کنار کرے اور آپ کو صحت و تندرستی عطا کرے، آمین۔ اس کے ساتھ ہی اجازت چاہوں گی زبردستی رہی تو انشاء اللہ پھر سندیے کی محفل میں حاضر ہوں گی۔ آپ سب اپنا بہت خیال رکھیں اور راجہ افضال خان کو اجازت دیں اللہ حافظ۔

**افسانہ آفتاب کاوش.....کراچی**  
 پیاری آبی جی! پھولوں جیسی مسکان رکھنے والی آبی کو میرا محبت بھرا سلام قبول ہو۔ آبی! آپ اور نورین ملک جس خوب صورتی سے ردا جیسے خوب صورت گلدستے کو سجاتی ہیں اس کی تعریف لفظوں سے ادا ہو ہی نہیں سکتی۔ سب سے پہلے ”گوشہ آگہی“ پڑھا۔ اسلاک معلومات کافی حاصل ہوئیں۔ آپ بہت ہی پیاری باتیں کرتی ہیں۔ پھر ”ردائے جنت“ سے مستفید ہوئے۔ فہرست میں آپ کی تحریر دیکھ کر میرا سیروں خون بڑھ گیا اور سب سے پہلے آپ کا ناولٹ پڑھا۔ آبی یقین جالیے آپ نے خوب بلکہ

لکھنے کا حق ہی ادا کر دیا۔ بہت خوب لکھا آپ نے تمام سلسلے وار ناول بھی زبردست طریقے سے آکے بڑھتے جا رہے ہیں۔ پھر میں نے افشاں علی کا افسانہ پڑھا۔ واہ بہت ہی بہترین۔ تمام کھل ناول بھی اپنی مثال آپ تھے۔ مستقل سلسلے بھی رنگا رنگ تحریروں سے مزین تھے۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ میں میری غزل چھپی۔ مجھے دل سے خوشی ہوئی۔ یہ غزل میں نے اپنے بے قرار دل کو قرار دینے کے لیے لکھی تھی وہ بھی صبح کے پانچ بجے، شکر یہ۔ رضوانہ کی شاعری بھی اچھی تھی۔ عمران فائق اور سحر مبین کی شاعری بھی مجھے پسند آئی۔ آپ تمام پڑھنے والوں کا میں دل سے شکر یہ ادا کرتی ہوں جن لوگوں کو میری تحریر اچھی لگتی ہے۔ آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی سے ہی مجھ میں لکھنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ ”سندیے“ میں افشاں علی اکثر ہی مجھے عزت بخشی ہیں۔ میری خواہش ہے کہ میں کبھی بالمشانہ ملاقات کروں آپ سے۔ میرے دوستوں کے نام پیغام میں ثناء کنول اللہ دتہ نے بھی مجھے یاد کیا۔ میں ٹف روٹین کے ہاٹ لکھ ہی کم رہی ہوں مگر لکھنے لکھانے کا سلسلہ میں جاری رکھوں گی کیوں کہ آپ جیسے پیارے دوستوں کا ساتھ جو میسرے ساتھ ہے۔ مجھے آپ سب جن کا نام میں لکھ نہیں سکی معذرت قبول کیجیے۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

**مہرین کنول.....کراچی**  
 ردا کی جان اور ہم نئے لکھاریوں کے اوپر سایہ نلگن صالحہ آبی اور ردا اشاف و رائٹرز دقارمین کو مہرین کنول کا پیارا بھرا سلام علیکم! اٹ از سومو بیٹ آئی لو ٹو ڈسمبر خوب صورت سرد موسم کا مہینہ سال کے آخر کا مہینہ۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بارش و ہواؤں کا مہینہ جو جنوری فروری نئے سال کے مہینوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔ میری دعا ہے نیا سال پاکستان کے لیے تری و خوش حالی کا پیغام لائے۔ ”ردائے جنت“ اسلام،

ایمان اور احسان کے بارے میں معلومات فراہم کر گیا جس سے وراحت کا احساس ہوا۔ سلسلے وار ناول ”تجھ سے مانگوں میں تجھ کو“، ”جو عشق میں جیتی وہ عشق ہی جانے“، ”تیرے پیار کی خوشبو“ اور ”مشرق کی شہزادی“ زبردست جا رہے ہیں۔ صائمہ قریشی جی ”سو جاں سے دل ہارے“ میں آپ نے کمال کر دیا مجھے آپ کی تحریر پسند آئی ہے۔ ناولٹ ”بھروسہ“ ایمان علی جی کیا ہی کہنے آپ کے۔ اتنی ایمان افروز بات پھیلانے کی کوشش کی ہے کہ ہمیں ہر حال میں اللہ پر توکل رکھنا چاہیے ویلڈن۔ افسانوں میں افشاں علی جی کا ”معمولی گرہ“، عائشہ خان جی کا ”پچھتاوا“، یاسمین اختر جی کا ”وقت کا دست ستم“، ایہان علی جی کا ”خوشیاں ڈھونڈھیں گے“، حافظہ مون شاہ جی کا ”دسمبر“، امبر افکن جی کا ”وہ لکھ نہیں ملا“، ریمیل آرزو جی کا ”ہم کئی ہار مرنے والے تھے“، ثناء کنول جی کا ”تہی داماں لوگوں“، حنا اصغر جی کا ”خوشیوں کے آنگن میں“، نائلہ طارق جی کا ”اس بحر کرب میں“، شاہدہ علی جی کا ”رفاقتوں کے نئے خواب“، مدیحہ اعجاز کا ”احساس“ سب ہی ٹھنڈے موسم میں گرم و سرد سے افسانے ردا کی لڑی میں موتیوں کی طرح پردے ہوئے بے حد حسین لگے۔ جن کو پڑھ کر بے اختیار منہ سے نکلا ماشاء اللہ۔ اب آتی ہوں مستقل سلسلوں کی طرف جو کہ ردا کی ڈائری، ذرا پھر سے کہنا، خوشبو، اس ماہ میں اور دوستوں کے نام پیغام بے حد پسند آئے۔ میری پیاری سہیلی ریمیا نور رضوان جی آپ کا محبت و خلوص بھرا سلام ہمارے سر آنکھوں پر۔ آخر میں اہل وطن اور ردا اشاف کو مہرین کنول کی طرف سے نیا سال مبارک ہو۔ نئے سال کی خوشیاں مبارک ہوں۔

**صائمہ قریشی.....کراچی**  
 صالحہ آبی، نورین ملک اور ردا کے تمام رائٹرز و قارئین کو میرا پیارا بھرا سلام۔ سب سے پہلے تو

معذرت میں پچھلے دو تین ماہ سے سندھیوں کی محفل میں شرکت نہیں کر پائی۔ معذرت کے بعد اب بات ہو جائے ہماری ناراضی کی۔ دسمبر میں ہمیں افشاں علی کا مسکراتا خوشیاں ورنگ بکھیرنا خط پڑھنے کو نہیں ملا۔ ہم آپ سے ناراض ہیں ایسے تو نہیں کرتے نا ہمیں عادت سی ہو گئی ہے۔ سب سے پہلے آپ کا خط پڑھنے کی چلو اب مجھے اپنی سب سے فحورث، چوڑیوں کا سیٹ گفٹ کر کے مناد (ہاہاہا)۔ میری غیر حاضری میں بہت سے نئے لکھنے والوں کا اضافہ ہوا ہے جن میں ندا حسنین، سحرش فاطمہ، شامہ ناز، ریمیل آرزو اور یاسمین اختر آفریدی شامل ہیں۔ صائمہ قریشی کا بھی نیا اضافہ ہے۔ آپ سب کو روائیلی میں خوش آمدید۔ اب آئی ہوں تبصرے پر۔ ندا حسنین آپ کا پہلا افسانہ 'صدقہ جاریہ' پڑھ کر ہرگز گمان نہیں ہوا کہ یہ آپ کی پہلی تحریر تھی۔ ماشاء اللہ بہت پختہ انداز تحریر تھا۔ معاشرے کے ایک اہم پہلو پر نظر ڈالی آپ نے اپنے اس افسانے میں اس کے بعد اکتوبر میں سحرش فاطمہ آپ کی پہلی تحریر 'میرا حجاب میرا مان' شائع ہوئی۔ اس خوب صورت تحریر نے بہت اہم پیغام دیا۔ اللہ کرے زور قلم اور (آمین)۔ صائمہ قریشی آپ کا ہنستا مسکراتا ناولٹ ہمیں بہت اچھا لگا۔ اب آپ کے قسط وار ناول کا انتظار ہے۔ نومبر میں صالحہ آبی آپ کا ناولٹ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ پلیز اسی طرح ہم سب کو خوش کرتی رہا کریں۔ نومبر میں افشاں آپ کا افسانہ میرے خواب ریزہ ریزہ پڑھا ہا مسٹری کے ایٹو پر لکھ کر آپ نے بہت اچھا کیا۔ کائنات غزل آپ کا افسانہ 'رائز' بھی بہت اچھا تھا۔ بہت اچھا سبق دیا اس میں آپ نے عورت کو۔ اب بات ذرا ماہ دسمبر کی۔ دسمبر کی فہریت دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ افسانوں کی لائن بھی ماشاء اللہ اس بار یاسمین آفریدی آپ کی پہلی تحریر 'وقت کا دست ستم' بہت اچھی تھی۔ افشاں علی کا افسانہ 'معمولی گرہ' ایک ایسے موضوع پر

تھا جو ہمارے معاشرے کا المیہ ہے۔ لوگ اپنے لیے کچھ سوچتے ہیں اور دوسروں کے لیے کچھ۔ ریمیل آرزو آپ کا افسانہ 'ہم کئی بار مرنے والے تھے' ایک مختصر مگر غور طلب تحریر تھی۔ افسانوں کی ایک لمبی لسٹ ہے سب ہی لکھنے والوں نے خوب لکھا ایمان علی آپ کا ناولٹ بھی بہت اچھے موضوع پر تھا۔ صالحہ آبی اور نورین کی محنت کی بدولت ماشاء اللہ ردا کی مقبولیت میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کر کے ردا ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ افشاں آپ کی پہلی نظم پڑھی۔ آپ کی پہلی کاوش بہت اچھی تھی۔ اب شاعری کا سلسلہ بھی جاری رکھیے گا۔ 'ذرا پھر سے کہتا' میں شامہ ناز اور بشارت شاہ آپ کی نظمیں زبردست تھیں۔ باقی سب کی شاعری نے بھی خوب رنگ بکھیرے۔ حمیرا فضا ردا میں پہلی دفعہ آپ کی نظم شائع ہونے پر مبارک باد۔ کتنی آرا اور ریمیا نور مجھے یاد رکھنے کا شکر یہ خوش رہیں۔ صائمہ عبدالغنی آپ کو میرا افسانہ 'محبت چاندی' پسند آیا۔ اس کے لیے بے حد شکر یہ اسی طرح اپنی آراء دیتی رہے۔ اس دعا کے ساتھ اجازت کہ آنے والا سال ہم سب کے لیے خوش بخت ہو۔ میرے وطن کے لیے بہاروں کا موسم لائے۔ نئے سال کا سورج میرے ہم وطنوں کے لیے خوشیاں لے کر طلوع ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے آسانیاں پیدا کرے، آمین۔ مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔

**سلامتہ اسلام..... خانیوال**  
پیاری سی صالحہ آبی اور پر خلوص سی نورین آبی! لعل سی رائز لہند فرینڈز کو پیاری سی ملا لہ (آہم) محبتوں اور چاہتوں سے لبریز سلام قبول ہو۔ حسب توقع ردا 11 کو ملا۔ ٹائیکل گرل پر ہر چیز ہی پرفیکٹ لگ رہی تھی۔ 'گوشہ آگہی' پڑھ کر ایسا قائل ہوتا ہے آپ Face to Face ہمکلام ہوں۔ دسمبر کی

ردا ڈائجسٹ [212] جنوری 2015ء

بھکتی شاموں کے پرسوں خیر ماحول میں پڑھ کر ردا کو پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ 'ردائے جنت' سے فیض یاب ہوئے۔ 'تجھ سے مانگوں میں تجھ کو' اچھا جا رہا ہے۔ صائمہ قریشی جی! بچی یا ریمیا اور شہیر کی نوک جھونک بڑے مزے کی تھی۔ ایمان علی میرے لیے تمہارا نیم نونہیں ہے۔ میرا خیال ہے افشاں، ایمان، ایمان، نائیلہ، عائشہ خان کی اب تک ایسی کوئی کاوش نہیں جو میری نظر سے نہ گزری ہو۔ 'جو عشق میں بیٹی وہ عشق ہی جانے' نائلہ آبی میں تو خود Sad ہو جاتی ہوں۔ بس جو بھی کرنا اچھا کیجیے گا۔ قمروش جی! مقصوم کو کہاں غائب کر دیا۔ مہرین کنول اچھی کاوش تھی۔ تھینک گاڈ ہیرو نے دسمبر کی شام پالی تھی۔ یاسمین اختر کی عنوان کی طرح کہانی بھی زبردست تھی۔ حافظہ مون شاہ نے کرداروں کے نام اچھے رکھے تھے۔ 'اس بحر کرب میں' اور 'احساس' مدتوں یاد رکھوں گی۔ 'مشرق کی شہزادی' واہ جی واہ زبردست۔ مگر پلیز کرداروں کے ساتھ نا انصافی مت کیجیے گا۔ ریمیل آرزو، شامہ کنول، شامہ علی نے بھی خوب لکھا۔ حنا اصغر کی 'خوشیوں کے آنگن میں' لا جواب تھی۔ اس بار سب افسانے ہی سبق آموز اور اچھے تھے۔ 'ردا کی ڈائری' میں حبیبہ عارف اور سعدیہ اسلم کی 'دسمبر' پسند آئی۔ اشعار میں دانیہ آفرین، سعدیہ عابد، ریمیا نور، مصباح مسکان، صباحر، حنا علی، عائشہ نیازی کے اشعار پسند آئے۔ 'اس ماہ میں' افشاں علی، ایس ایمیاز، سعدیہ عابد، نور بانو اور عائشہ نیازی چھائی ہوئی تھیں۔ 'خوشبو' کے لیے نام ہی کافی ہے۔ 'ذرا پھر سے کہتا' سب ہی نے لا جواب لکھا۔ 'سندھ کے لیے' ریمیا نور رضوان کا تبصرہ اچھا تھا۔ 'دوستوں کے نام پیغام' اچھا سلسلہ ہے۔ 'چکن' دال کا سوپ پسند آیا۔ بلاشبہ دسمبر کا شمارہ زبردست اور خوب تر تھا۔ اکین ٹھیکنس آبی آپ نے میری حوصلہ افزائی کی۔ اگلے ماہ تک اجازت دیجیے اپنا اور خود سے وابستہ رشتوں کا

ردا ڈائجسٹ [213] جنوری 2015ء

خیال رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔

**ذرا صدف قمر..... کراچی**  
السلام علیکم! اس ماہ دسمبر کا 'گوشہ آگہی' پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ یقین کریں صالحہ آبی جی اینڈ نورین آبی اور آل اسٹار خصوصاً صالحہ اپنا جی کی میں دل سے بہت عزت کرتی ہوں۔ میں ریمیا نور رضوان کی کزن زارا صدف قمر ریمیا نور رضوان آبی کے کہنے پر جب سے ردا کو جوائن کیا ہے تب سے فضول کام فضول گپ شب چھوڑتھوڑا بہت ٹائم ملتے ہی ردا کا مطالعہ کرتی ہوں۔ میں جو افسانہ جو ناولٹ پڑھتی ہوں بس ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔ اتنی دلچسپ تحریر ماشاء اللہ سے لکھتے ہیں رائز میں ردا اور اس کے لکھنے والوں کی تحریر کو دل سے سراہتی ہوں۔ صالحہ اپنا جی زور قلم اور زیادہ۔

**شازیہ مصطفیٰ عمران..... کراچی**  
السلام علیکم! امید ہے آپ اور تمام لکھنے اور پڑھنے والے خیریت سے ہوں گے اور میری خیریت یہ ہے کہ میں بھی اللہ کا شکر ہے خیریت سے ہوں۔ آج شادی کو تین سال ہو گئے ہیں کتنی جلدی وقت گزرا ہے ہی نہیں چلا۔ میں ایک پیاری سی بیٹی کی ماں بھی بن گئی اور میری بیٹی ایمان میری اور میرے سہوئے عمران کی گل کائنات ہے۔ ایمان آج دو سال کی ہونے والی ہے۔ ماشاء اللہ سے اور مجھے وہ لکھنے نہیں دیتی کہتی ہے مجھے پین دو لکھوں گی۔ ہاں تو میرے پیارے قارئین اور رائز بہنوں کیسی ہیں آپ سب میڈم جو قافلہ لے کے چلی تھیں اس میں نئے لکھنے والے بھی شامل ہو رہے ہیں۔ صائمہ قریشی، نائلہ طارق دونوں ہی بہت خوب صورت لکھ رہی ہیں۔ مجھے جب بھی موقع ملتا ہے۔ ڈائجسٹ پڑھتی ہوں مگر یہ میری ایمان رسالہ تک نہیں چھوڑتی مجھے چھپا کے رکھنا پڑتا ہے۔ رائز جتنی بھی ہیں سب خوب لکھ رہی ہیں اور میں ان سب سے بھی بہت کچھ



سکھ رہی ہوں کیوں کہ سیکھنے کا عمل تو ساری زندگی چلتا ہے۔ ہماری میڈم کی ہم سب لکھنے والوں کو رہنمائی ہے جو ہم لکھ رہے ہیں۔ میڈم نے میرے ہر قدم پر ساتھ دیا اور رہنمائی کی میں ان کی اتنی مشکور ہوں کہ بس۔ مجھے لکھنے کا پلیٹ فارم دیا اور آج یہ انہی کی جو مسلم فرائی ہے کہ میں سلسلے وار ناؤ صرف ان کی بدولت تھی ہوں ورنہ کوئی سلسلے وار نادل لکھنے کا موقع کہاں دیتا ہے۔ میری سب سے ہی گزارش ہے کہ بھی اپنے دل و دماغ میں غرور نہیں لائے گا کیوں کہ ہماری میڈم صالحہ محمود کو دیکھیے جو ذرا بھی غرور نہیں کرتیں ہم سب لکھنے والیوں کے ساتھ ہیں۔ ڈائجسٹ کے تمام سلسلے ہمیشہ کی طرح لاجواب ہیں مجھے جو سلسلہ سب سے زیادہ اچھا لگتا ہے وہ میں شوق سے پڑھتی ہوں ”دوستوں کے نام پیغام“ اس کے ساتھ ہی اجازت چاہوں گی کیوں کہ عمران بار بار مجھے دیکھ رہے ہیں۔ رات کے گیارہ بجنے والے ہیں ایمان سورہی تھی تو میں نے سوچا لکھ لوں اس کے ساتھ ہی میں اپنا انٹرویو بھی بہت مزے دار لکھوں گی بہت جلد۔

**ثناء کنول اللہ فقہہ..... نو دھراں**  
 السلام علیکم صالحہ آپنی! افشاں علی، کشف ضیاء، نورین آپنی، صبا عبدالغنی وغیرہ سب کو میرا محبت بھرا سلام قبول ہو۔ سب سے پہلے آپ نے میری کہانی شائع کی اس کا شکریہ۔ سب سے پہلے ”ہم کئی بار مرنے والے تھے“ اور ”اس بحر کرب میں“ پڑھی۔ نائیلہ طارق کیا کہوں دل خون کے آنسو رو دیا۔ افشاں علی ”معمولی گرہ“ واقعی بالکل صحیح لکھا۔ مہرین کنول ”دوسبر کی شام“ ایک پیاری تحریر تھی۔ ہلکی پھلکی مزید اچھا لکھیں۔ کیونکہ سی حافظہ مون شاہ بخاری دوسبر کیا تحریر تھی سچ میرے تو آنسو ہی نکل آئے۔ ایمان علی بالکل صحیح لکھا آپ نے ہم دکھوں سے لڑتے نہیں سکتے مگر انہیں کم ضرور کر سکتے ہیں یہ کوشش ہی کسی کی زندگی

ہوگی۔ شاہدہ علی، مدیحہ اعجاز، حنا اصغر، امیرا گلن شاکر آپ سب نے بھی خوب لکھا۔ ایمان علی ”بھروسہ“ تحریر بھی اچھی تھی مجھے پسند آئی ویل ڈن۔ اس بار بھی ردا ہر بار کی طرح زبردست تھا۔

**زانیہ..... کراچی**  
 دل و جان سے عزیز نہایت قابل احترام صالحہ آپنی اور سوئیٹ نورین ملک اور تمام ردا فرینڈز کو سلام! امید ہے کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ سوئیٹ صالحہ آپنی تھوڑی دیر کے لیے آپ کی آواز سنی مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ آپنی جی اس بار ردا کے نائیل نے دل خوش کر دیا اور ”گوشہ آگہی“ میں لکھے آپ کے الفاظ نے مجھے اپنے بچپن میں پہنچا دیا نہ جانے کیوں دوسبر سے جڑی یادیں ہمیں اداس کر دیتی ہیں۔ ”ردائے جنت“ بلاشبہ اس میں لکھے لفظ ہمارے ایمان کو نازہ کر دیتے ہیں۔ ایمان علی کی کاوش ”بھروسہ“ بہت پسند آئی اور نائیلہ طارق کا افسانہ بہت زبردست تھا۔ باقی تمام رائٹرز نے بھی کمال کا لکھا۔ ہر اسٹوری میں کوئی نہ کوئی سبق چھپا ہوا تھا اور میں ریما نور کا بے حد شکر ادا کروں گی کہ انہوں نے مجھے اپنی فرینڈ لسٹ میں شامل رکھا اور میری صحت کے لیے دعا کی۔ خوش رہیں ریما جی۔ ردا کے تمام سلسلے ہمیشہ کی طرح جگمگاتے نظر آئے۔ ردا کی ڈائری میں مہوش جو اد کی نظم سپر ہٹ لگی۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ میں دانیہ آفرین کی نظم بہت اچھی تھی۔ آپنی جی ملک کے حالات دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ آخر کب یہ سب ختم ہوگا۔ دعا ہے کہ آنے والے سال کا سورج ہم سب کے لیے خوشیاں لائے، آمین۔ ہمارے ملک میں ترقی اور خوش حالی کی ہوائیں چلیں اور ناامیدی کے بادل چھٹ جائیں۔ آپ سب کو نوب ایئر کی ایڈوانس مبارک اس دعا کے ساتھ کہ جنوری کا امیدوں اور خوشیوں سے بھرا سورج ہم سب کے لیے راحت و سکون لائے، آمین اب اجازت چاہوں

گی۔ اللہ حافظ۔

**گیستی آراء..... کراچی**  
 پیاری آپنی السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ سب سے پہلے تو آپ کو نورین کو اور ردا کے تمام رائٹرز قارئین، اراکین کو ہماری طرف سے نئے سال کی ڈیڑھوں مبارک باد۔ اللہ آپ سب کو ایسی ڈیڑھوں خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔ اب بات ہو جائے ماہ دسمبر کے ردا کی تو سب سے پہلے ”گوشہ آگہی“ کی خوب صورت لفظوں کے بحر میں ڈوبی باتوں نے ہمیں اپنے حصار میں جکڑ لیا۔ آگے چل کر ”ردائے جنت“ میں دینی باتیں اور معلومات مشعلی راہ بن کر ہمارے دل میں اتر گئیں اور اب باری جی سلسلے وار نادل، ناولٹ کی جسے ہمیشہ کی طرح آج بھی ردا کے قارئین کو اپنے سحر میں جکڑا ہوا ہے اور اب باری جی افسانوں کی تو سب سے پہلے افشاں علی اپنی ”معمولی گرہ“ کے ساتھ حاضر تھیں جس میں انہوں نے ہمارے معاشرے کے ایک اہم مسئلے اور بات کی طرف بہت خوب صورتی سے قلم اٹھاتے ہوئے بڑی گہری چوٹ کی ہے۔ عائشہ خان کا ”پچھتاوا“ نے دھی کر دیا۔ مہرین کنول کی ”دوسبر کی شام“، ”وقت کا دست ستم“، ”دوسبر“، ”وہ لمحہ نہیں ملا“ دلچسپ اور اچھی تحریریں تھیں۔ ایمان علی کی ”خوشیاں ڈھونڈ ہی لیں گے“، ”ہم کئی بار مرنے والے تھے“، ”جی دامان لوگ“، ”اس بحر کرب میں“، ”احساس“ کے طرز تحریر نے متاثر کیا۔ ”ردا کی ڈائری“ کے سبھی انتخاب بہترین تھے۔ اس ماہ میں اس ماہ کا اقتباس سے لے کر اس ماہ کا لطیفہ سب ہی شاندار رہے۔ ”خوشبو“ ہمیشہ کی طرح بہترین رہا۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ کی بھاری ہی غزلیں، نظم بہترین تھیں۔ خاص کر زاہدہ ہاشمی، حکیم خان حکیم، ایس امتیاز، جمیر افضا، فرح ناز، سندھیے میں افشاں علی داہ پڑھ کر مزہ آجاتا ہے۔ ایسا کہ

واقعی سندھیے پڑھنے کو دل چاہئے۔ لگے۔ ”کچن“ میں مردیوں کے حوالے سے سوچ بنانے کے ڈھیر سارے طریقے بتائے گئے۔ ”سنگھار“ میں موسم سرما کے لحاظ سے بیوٹی پلان بہترین رہا۔ اب اجازت ڈھیروں دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ۔“

**فریدہ فریدی..... پاک پبلسیشن شریف**  
 السلام علیکم! جس دقت یہ سطور آپ کی نگاہوں سے گزریں گی۔ 2015ء کا سورج روئے دنیا پر طلوع ہو چکا ہوگا۔ اللہ کرے اس سورج کی ہر کرن عالم اسلام اور پاکستانیوں کے لیے خیر و برکت کی پیامبر ہو۔ یہ سال خصوصاً ردا کی شہزادیوں کے لیے خوش بخت ثابت ہو۔ آپنی کی تخلیق ”میرے پیار کا پہلا شعر“ ابتدائے لطم سے انتہائے وصال تک ساحرانہ گرفت لیے ہوئے تھا۔ آپنی کی شخصیت کی مانند آپ کی تحریر بھی مشفق ہے آپ کسی بھی کردار سے خواہ متنی ہو یا مثبت کچھ برائیاں ہونے دینیں۔ آپ کا پیغام محبت ہر دل میں اتر جائے ایک جھلک ردا کے سندیوں میں بکھری نظر آنے لگ گئی ہے۔ سوئیٹ افشاں علی وائے عجب کہ آپ کے سندیے طویل اور افسانے مختصر ہوتے ہیں اور غضب یہ کہ دونوں بھر پور توجہ کے لائق ہوتے ہیں۔ افشاں جی اپنی یونیک شخصیت اور طرز گفتگو کی مانند عانیہ ڈیزی مسلسل غیر حاضری چھ معنی دارد۔ ”گوشہ آگہی“ سے آپنی کی تسبیہ پر خود کا احتساب کرتے ہوئے ”ردائے جنت“ میں ایمان اسلام احسان کا فرق خوب اچھی طرح سے سمجھ گئے۔ یاسمین اختر، ریحل آرزو، ثناء کنول، حنا اصغر، شاہدہ علی کو فردا فردا مبارک باد۔ ایمان علی ویل ڈن۔ غرض تمام رسالہ خوب تھا۔ آپنی جان، نورین ملک اور تمام سکھی سہیلیوں کو خدا حافظ۔

☆.....



## دوستوں کے لیے پیغام

اس سال کا پیغام سب کے نام  
انسانی زندگی تو دکھ سکھ نشیب و فراز سے ہی  
مزین ہے۔

کچھ خوشیاں کچھ آنسو دے کر ٹال گیا  
جیون کا ایک اور سنہری سال گیا  
دوسرے سالوں کی نسبت میرا یہ سال 2014ء  
بہت خوشگوار گزرا۔ رشتوں کے خوب صورت  
احساسات سے بھرپور اور دوستی کے رنگوں سے آشنائی  
کروانا یہ سال یادگار رہے گا۔ سب سے بڑی وجہ  
سال 2014ء میں ردا میں میرے 5 افسانے اور  
ایک ناول شائع ہوا۔ یہ پیغام میرا ان سب لوگوں  
کے نام سے جنہوں نے میرے اس سفر میں میرا ساتھ  
دیا اور مجھے کبھی رائٹر کہلانے کا اعزاز بخشا۔ سب سے  
پہلے ہر دل عزیز محترمہ صالحہ ایپا اور خوب صورت و  
پیاری آواز کی مالک نورین ملک کا دل کی گہرائیوں  
سے شکر یہ جنہوں نے مجھے ردا کا حصہ بنایا۔ میری ہر  
تحریر دس دہائیے کو بروقت جگہ دی۔ گزشتہ 4 سالوں  
سے ردا کے سنگ یہ سفر جاری ہے۔ انشاء اللہ آئندہ  
بھی یوں ہی جاری دساری رہے گا (آمین)۔ اس  
کے بعد میری پیاری نانی جان میری اکلوتی Cute  
سی بہنا آسیہ میری بہت ہی اچھی کلاس فیلو و دوست  
کشف ایک محترم ٹیچر اور ساتھ ہی بچپن کی دوست  
حفصہ انعم اور ان کی اچھی سی ای کا بہت بہت شکر یہ  
جنہوں نے ہر قدم پر مجھے سپورٹ کیا۔ میرا حوصلہ  
بڑھایا۔ آج ان سب ہی کی بدولت میں اتنا لکھ پاتی

ردا ڈائجسٹ [216] جنوری 2015ء

ہوں۔ مجھے آئندہ بھی آپ سب یوں ہی سپورٹ  
کیجیے گا پلیز۔ اب باری آتی ہے ان سب کی تعریف  
و تبصرے حوصلہ افزائی جو قدم بہ قدم مجھے نکھارتی  
رہی۔ جی ہاں آپ سب قارئین کی تو مصباح  
مسکان، ندا حسنین، ثناء کنول، اللہ دتہ، افسانہ آفتاب،  
سیدہ فرزانہ حبیب، ایمان علی، دانیہ آفرین، سحرش  
فاطمہ، رودنی فیصل، سہاس گل، انعم خان، درشیدہ کنول،  
فریدہ فرید، ریما نور، امبرین حیدر، صباح سحر، دھنگ  
ناز، عانیہ نیازی۔ صبا عبدالغنی، نور ہانو، فرزانہ  
شوکت، سیدہ امبر ہاشمی، پیاری، کیتی آراء، نوشین  
مدثر، جہانہ آفتاب اور جو نام رہ گئے ان کے لیے تہ  
دل سے معذرت اور تمام وہ قاری کہنیں جنہوں نے  
ناصرف میری تحریریں پڑھیں بلکہ ان کی دی گئی  
رائے نے مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی دیا تو میری  
پیاری دوستوں سال کے اس اختتام پر میں تہ دل  
سے آپ سب کی مشکور ہوں کہ آپ سب نے  
سندیے کے ذریعے مجھے سپورٹ کیا۔ آئندہ بھی  
میرے ہمراہ رہیں گے۔ انٹرنس سب ہی کو افشاں علی کی  
جانب سے شکر یہ۔ اپنی دعاؤں میں افشاں علی کو بھی  
یاد رکھیے گا۔

افشاں علی۔ کراچی

ردا فرینڈز کے نام

حسب عادت سب سے پہلے تمام قارئین ردا اور  
رائٹرز کو السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ دسمبر میں رابعہ  
افضال خان آپ کی برتھ ڈے تھی۔ لہذا ردا کے توسط  
سے مابودولت آپ کو مبارکباد دیتی ہیں، قبول  
فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ آپ کے  
لیوں سے دوسرے مسکان نہ ہو اور آپ کو کبھی زندگی  
میں کوئی نقصان نہ ہو، آمین۔ افشاں علی! مجھے بہت  
انسوس ہے کہ میں آپ کو آپ کی برتھ ڈے و ش نہیں  
کر پائی مگر میں نے آپ کو دعاؤں میں ہمیشہ یاد  
رکھا۔ ہا ہے؟ میں آپ کو بہت زیادہ چاہتی ہوں۔

ردا ڈائجسٹ [217] جنوری 2015ء

آپ کی تحریریں اور آپ کے سندیے مجھے بہت عزیز  
ہیں۔ میں جتنی آپ کی تعریف کروں اتنی ہی کم ہے۔  
آپ کی تعریف کے لیے الفاظ ڈھونڈنے مشکل ہو  
جاتے ہیں۔ ڈیڑھ افشاں! میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ  
آپ کی دوستی میرے لیے کیا ہے؟ اگر آپ کی دوستی کو  
ایک انمول خزانہ کہا جائے تو یہ لفظ بھی آپ کی دوستی  
کے آگے بچ ہے۔ جس خلوص سے آپ اپنی تمام  
دوستوں کو یاد رکھتی ہیں اور ان پر دعاؤں کے خزانے  
لٹاتی ہیں اتنا اچھا اور اعلیٰ اخلاق کا حامل شاید ہی میں  
نے آج تک کسی کو دیکھا ہو اور مجھے یہ کہنے میں کوئی  
عار نہیں کہ میں نے آپ کو پڑھ کر ہی لکھنا سیکھا ہے۔  
میں آپ کے سندیے بہت غور سے پڑھتی ہوں۔ اسی  
لیے مجھ میں اتنی صلاحیت پیدا ہوئی ہے کہ میں ردا کے  
مستقل سلسلوں میں شامل ہو سکوں۔ آپ کو تو میں  
ہمیشہ یاد رکھوں گی لیکن ساتھ ہی میں اپنی باقی  
دوستوں کو بھی نہیں بھولی ہوں۔ امبرین حیدر! آپ  
کہاں مصروف ہیں یا دوستی کر کے بھول گئیں۔ بھئی  
دوستی کر لی اب تھوڑی گپ شب بھی کر لیا کریں۔  
آپ کو میں بتا دوں کہ آپ بھی مجھے بہت عزیز ہیں  
کیوں کہ آپ وہ پہلی قاری ہیں جنہوں نے سب  
سے پہلے مجھ ناچیز کو دوستی کے قابل سمجھا۔ آپ کی  
دوستی بھی میرے لیے ایک انمول خزانہ کی طرح ہی  
ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے کبھی نہ  
بھلا میں اور نہ ہی میں آپ کو بھولنے دوں گی۔ اب  
آپ مجھے جلدی سے بتا دیجیے کہ آپ کی برتھ ڈے کی  
ڈیٹ کیا ہے؟ تاکہ میں ردا کے توسط سے آپ کو دوش  
کر سکوں اور افسانہ جی! آپ بھی بڑی بڑی ہو گئی  
ہیں۔ جلدی سے ردا میں واپس آجائیں۔ میں آپ کو  
بہت حس کر رہی ہوں۔ مصباح مسکان جی! شکر یہ  
کیسا؟ آپ کی تحریر واقعی قابل تعریف تھی اسی لیے  
میں نے آپ کی تعریف کی۔ مہرین کنول جی! آپ  
سے بھی میں یہی کہوں گی جو مصباح مسکان جی سے

زارا صدف قمر جو مجھے پڑھتے ہیں پسند کرتے ہیں میں  
سچ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ان کی شکر گزار ہوں۔  
اللہ آپ سب کو کامیابی عطا کرے۔ خصوصاً (ریمانور)  
آپ کی دل سے شکر گزار ہوں انہوں نے سینئر اعلیٰ  
لکھنے والوں میں مجھ جیسی اونٹنی رائٹر کو بھی یاد رکھا۔ (سچ  
میں ریما جی)

I Love you and thank you  
so much.

Allah bleuse u.

شازیہ آپ کی تو ٹاپ آف وی لسٹ ہی رہتی ہیں  
باشاہ اللہ زور قلم اور زیادہ۔ روشا نے عبدالقیوم، جہانہ  
آفتاب جی بہترین تخلیق ہے آپ کی۔ مسکان رؤف  
میں دل سے مسکان جی کی شکر گزار ہوں۔ یہ شکر یہ  
اس لیے انہوں نے میری تحریر کو Like کیا تھا اور ہم  
معروفیت کے باعث ان کا شکر یہ بھی ادا نہیں کر  
پائے تھے۔ اللہ آپ کو کامیاب و کامرانی عطا  
فرمائے، آمین۔ اسی کے ساتھ اب اجازت اللہ سب  
کو اپنی حفظ و امان میں رکھے، آمین۔

زارا صدف۔ کراچی

پیارے ردا کی تمام پیاری رائٹرز اور پیاری قارئین

سہیلیوں کے نام

اگر کسی کے پاس سب کچھ ہو تو دنیا جلتی ہے  
اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو تو دنیا آہستی ہے  
ہمارے پاس آپ کے لیے دعا ہے  
جس کے لیے دنیا ترستی ہے  
اللہ تعالیٰ آپ سب کو نام میں، کام میں، گھر  
میں، عزت میں، صحت میں، زندگی میں، حلال مال  
میں ہمیشہ خیر و برکت عطا فرمائے اور آپ سب  
پیاریوں کو ہمیشہ تندرست اور سلامت رکھے، اس  
نئے سال میں (آمین)۔

ایضاً رؤف، مصباح مسکان رؤف۔ جہلم

☆.....

Happy Birthday R.G

زارا صدف قمر۔ کراچی

جیون ساتھی کے نام

زندگی جی! کسے ہو جی۔ آئی ریلی مس یو، تین  
دن ہو گئے اسی کے گھر آئے ہوئے تمہاری بہت یاد  
آ رہی ہے۔ شادی سے پہلے عجیب خیالات آتے  
تھے کہ میں اپنی امی، اپنے گھر اپنے بہن بھائی کے  
بغیر کیسے رہوں گی۔ لیکن آج دیکھو شوہر کی محبت و  
چاہت ہر رشتے پر حاوی ہو گئی ہے۔ اللہ پاک ہمارا  
رشتہ ہماری آخری سانس تک قیامت تک قائم  
رکھے۔ ہمارے درمیاں ہمیشہ محبت رہے۔  
آمین ثا آمین۔

جب بادل خوب صورت ہے

جب ہوا کے سنگ خوشبو آتی ہے

جب رات کے آخری پہر چاندنی

چاند کے سنگ ثرمانی ہے

بادلوں کے اوٹ میں چھپ چھپ کر

نکل آتی ہے

ایسے میں

ہم سفر جی تمہاری یاد بہت آتی ہے

ریمانور رضوان۔ کراچی

ردا کے قارئین و رائٹرز کے نام

دل و جان سے عزیز صالحہ ایما جی السلام علیکم! آپ  
تو سچ میں منفرد ہیں۔ میں آپ کی دل سے  
Respect کرتی ہوں۔ اینڈ آل اسٹاف نورین آپ کی  
آپ سب کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نیا سال مبارک  
ہو۔ تمام سینئر اینڈ جونیئر نے لکھنے والے جو کسی معروضیت  
کی وجہ سے اس ماہ نہیں شامل ہو سکے جو خاموش قاری  
ہیں سب کو نیا سال مبارک ہو۔ امید واثق تعالیٰ ہے یہ  
سال ہم پر امن و سلامتی صحت و تندرستی نئی امنگوں، نئے  
سپنوں کو سچ کرنا گزرے۔ نئے پھولوں کی کھلا ہٹ سنا  
ہر منظر جگمگائے ہمارے گھروں میں۔ (آمین)۔ میں

ردا ڈائجسٹ 219 جنوری 2015ء

تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں اگر قسمت مجھے پنجاب سے  
کراچی دوبارہ لے گئی تو سچ میں تمہارا گھر ضرور  
دیکھوں گی خدا تمہیں ایک اچھا اور نیک ہمسفر عطا  
کرے۔ سنو اس دوستی کو کبھی مت توڑنا سمجھیں۔  
میری لظم صرف تمہارے نام

میرا اور تمہارا اک رشتہ ہے جاناں

اور یہ رشتہ ہر رشتے سے سچا ہے جاناں

سنو جاناں! اس رشتے کو مت توڑنا

پلیز میرے دل کو مت توڑنا تم وہ لڑکی ہو

جسے دوستی کرنے کو دل چاہا ہے تو سنو لڑکی

اس دل کی خطا بڑی سہی پر تم اسے مت توڑنا

اس رشتے کو مت توڑنا افشاں علی

شاہ کنول اللہ دت۔ لودھراں

جیون ساتھی کے نام

میرے جیون ساتھی ساتھ بھائی کے

ہماری روجوں کو سہرا ب کر جائیں گے

جب کبھی خودی ستائے چندہ کشکش نظر آئے

دیر سے سے گداز لبوں پہ پیار کی مٹھاس جگائیں گے

مانا اپنا پرست ہوں پر ہوں وفا دار

گرفت میں تیری سانس کے چھاتی پہ تیری سراپنا

ٹکائیں گے

تیری نام کی لگا کر لوٹے مہندی کے اس پر لکھن

نام کے تیرے چڑھائیں گے

سنگنا بھرے ہاتھ کانوں کی لوٹک

لے جائیں گے

پھر احساس محبت دلائیں گے

برکھاتی شام کی پون حسین رت کی بدلیاں

میرے جیون ساتھی جب بھی روٹھ جاؤ

مظاک فریاد کرنا

ہر انداز سے منائیں گے ہم اپنی محبت کو

تھہر پر جتائیں گے ہم!!

ردا ڈائجسٹ 218 جنوری 2015ء



# گوشہ چشم

جیا قریشی..... کراچی

پیاری اور کیوٹ سی جیا قریشی بہت سی دعائیں اور پیار آپ کے لیے۔ 127 کتور کو آپ کی شادی ہوگئی جس کی آپ کو بہت مبارک ہو اللہ سے دعا ہے کہ آپ کی زندگی کا نیا سفر خوشیوں اور مسرتوں بھرا ہو اور آپ سدا مسکرائی اور ہنستی رہو اپنا بے حد خیال رکھنا اور خوش رہنا۔

فرح ناز ریشی..... کراچی

ڈیز فرح! ہم بھی آپ سے سو فیصد متفق ہیں اور جو بھی رائٹر خود نمائی یا معاوضے کے لیے لکھنے کی سوچ رکھتے ہیں میں نے انہیں کبھی آگے بڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ دنیا کی اس بھیڑ میں کھو جاتے ہیں۔ اسی طرح خود نمائی کا جذبہ کبھی انسان پر غالب نہیں آتا چاہے۔ میں نے ہمیشہ اپنی روح کی تسکین کے لیے لکھا کبھی میں نے نہ معاوضے کی تمنا کی اور نہ ہی اسے کبھی معاوضے کا ذریعہ بنایا اور اللہ نے مجھے میری اوقات سے زیادہ لوٹا دیا۔ آپ ردا سے جڑی رہے ردا آپ کا اپنا ردا ہے۔ لکھنا اور معاشرے کی برائیوں کو بے نقاب کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ اپنے کچھ کی نمائندگی کرتے ہوئے لوگوں کو مثبت ماہ دکھائیں وہی تحاریر کامیاب ہوتی ہیں آپ ایسے ہی لکھتی رہیں اور اپنا خیال رکھیے آپ کی تحاریر قریشی اشاعت میں شامل ہوں گی۔

ثمینہ فیاض..... کراچی

پیاری ثمینہ! سدا خوش رہو اور آپ کو ردا کی محفل میں خوش آمدید! اس بار آپ کی شاعری شامل اشاعت ہے اور افسانہ بھی قریشی اشاعت میں شامل ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ردا سے آپ کا تعلق اب سدا

جڑا رہے گا کیوں کہ ردا آپ کا اپنا ردا ہے۔

زارا صدف قمر..... کراچی

سوئیٹ زارا! آپ کی محبتوں اور چاہتوں سے سجا دلکش نیو ایئر کارڈ موصول ہوا یقین جانے دل خوشی سے بھر گیا۔ اتنی محبتوں اور چاہتوں کا بے حد شکر یہ آپ کی شاعری شامل اشاعت ہے اور افسانے لکھنے کی کوشش بھی جازی رکھیے۔ اپنا بے حد خیال رکھیے اور خوش رہیں۔

مبشرہ ناز..... کراچی

ڈیز مبشرہ! آپ کا افسانہ مل گیا ہے اور ہماری کوشش ہوگی کہ جلد شامل اشاعت ہو۔

ملاہ اسلم..... خانیوال

سوئیٹ ملاہ! خوش رہیں آپ سے بات کرنا ہمیں بھی اچھا لگتا ہے اور آپ کے مستقل سلسلوں کے ساتھ افسانہ بھی مل گیا ہے۔ انشاء اللہ قریشی اشاعت میں شامل ہوگا۔ اپنا خیال رکھیے گا۔

☆ خاص طور پر میں ردا کے پڑھنے والوں سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ردا سے رشتہ صرف پر خلوص رہنا ہے۔ بے لوٹ لکھنا اپنے اندر کی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا نام ہی ردا ہے۔ لمبے انتظار سے بہتر ہے کہ میں آپ کی صلاحیتوں کو نیچا کر کے ردا میں پیش کر دوں یہ سب سن لیں کہ یہ موقع ہر کوئی نہیں دیتا اور سال میں ایک تحریر آنے کا مطلب یہ ہے ہوتا ہے کہ آپ کی تمام صلاحیتوں کو زنگ لگ گیا۔

ردا ڈائجسٹ [220] جنوری 2015ء

# کچھ

پودینہ (چوپ کیا ہوا) : دو کھانے کے چمچے

نمک : حسب ذائقہ

تیل : حسب ضرورت

ترکیب: سوس پین میں تیل گرم کر کے گوشت ڈال کر فرائی کریں، سنہری ہو جائے تو چوپ کی ہوئی ادرک، لہسن پیسٹ، لال مرچ پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، دہی، کالا زیرہ اور نمک ڈال کر بھون لیں حسب ضرورت پانی ڈال کر گوشت گلنے تک پکائیں، مصالحہ بھون کر چوبے سے اتار لیں۔

دہی میں گوشت کی ایک تہ لگا کر ابلے ہوئے چادلوں کی تہ لگائیں اور ہر ادھیا، ہری مرچیں اور پودینہ ڈال دیں، جانقل جاوتری پاؤڈر چمک کر 10-15 منٹ دم دے دیں، نمک کر کے سردنگ ڈش میں نکال کر گرم گرم سرو کریں۔

لاہوری کباب چنا مصالحہ

ضروری اشیاء:

قیمہ (پسا ہوا) : آدھا کلو

لہسن، ادرک پیسٹ : دو چائے کے چمچے

پیاز : ایک عدد

لال مرچ پاؤڈر : دو چائے کے چمچے

گرم مصالحہ پاؤڈر : ایک کھانے کا چمچ

خشک ماش : ایک چائے کا چمچ

مہمانوں کی غیر متوقع آمد جہاں حیرت آمیز خوشی کا باعث بنتی ہے وہیں فوری طور پر "ان کی تواضع کیسے کی جائے" کا مسئلہ بھی کھیر لیتا ہے۔ اس ماہ ہم نے کوشش کی ہے آپ کو ایسی ڈشز سے متعارف کروانے کی جو کم وقت، کم بجٹ میں تیار بھی ہو سکیں، ذائقے میں بھی منفرد ہوں اور مہمان بھی آپ کی مہمان نوازی کی تعریف کرتے ہوئے رخصت ہوں۔

بیف ہر مصالحہ رائس

ضروری اشیاء:

گوشت

آدھا کلو

چاول

تلن پاؤڈر (پندرہ منٹ)

بھلو کر ابا لیں

لال مرچ پاؤڈر

ایک کھانے کا چمچ

دھنیا پاؤڈر

ایک چائے کا چمچ

ادرک (چوپ کیا ہوا)

ایک چائے کا چمچ

لہسن پیسٹ

ایک چائے کا چمچ

دہی

آدھا کپ

کالا زیرہ

ایک چائے کا چمچ

جانقل جاوتری پاؤڈر

ایک چمچی

ہر ادھیا (چوپ کیا ہوا) : دو کھانے کے چمچے

ہری مرچیں (چوپ) : دو کھانے کے چمچے

کی ہوئی

ردا ڈائجسٹ [221] جنوری 2015ء

سفید چنے : ایک کپ  
دہی : ایک کپ  
تیل : حسب ضرورت  
نمک : حسب ذائقہ

ترکیب: قیمہ میں لہسن، ادراک پیسٹ، لال مرچ پاؤڈر، خشک ماش، نمک کی پتلی میں تیل گرم کر کے پیاز کاٹ کر ڈال دیں سنہری ہو جائے تو اس میں لہسن، ادراک پیسٹ، لال مرچ پاؤڈر، نمک اور تھوڑا پانی ڈال دیں۔ اچھی طرح مصالحہ بھویں اور اس میں دہی اچھی طرح پھینٹ کر ڈال دیں ابال آنے تک چمچہ مستقل چلائیں 10 منٹ درمیانی آج پر پکنے دیں، اس میں ابلے ہوئے چنے اور کباب احتیاط سے ڈالیں۔ پتلی کو کپڑے سے پکڑ کر ہلا میں اور تمام اجزاء اچھی طرح کس کر دیں، آخر میں گرم مصالحہ پاؤڈر اور ہر مصالحہ ڈالیں چادل اور چپانی دونوں کے ساتھ نوش فرمائیں۔

### بلوچی پلاؤ

ضروری اشیاء:

گوشت : آدھا کلو  
چادل : آدھا کلو (دھو کر بیس منٹ کے لیے بھگو دیں)

سوفن پاؤڈر : ایک کھانے کا چمچ  
دھنیا پاؤڈر : ایک کھانے کا چمچ  
زیرہ : ایک چائے کا چمچ  
لونگ : چھ عدد  
ثابت سیاہ مرچیں : آٹھ دس عدد  
ادراک لہسن پیسٹ : ایک چائے کا چمچ  
سبز الائچی : چار یا پانچ عدد

بڑی الائچی : دو عدد  
براون پیاز : پون کپ  
دہی : آدھا کپ  
پیاز (چوپ کر لیں) : دو عدد  
بادیان کے پھول : تین عدد  
زر درنگ : پون چائے کا چمچ  
نمک : حسب ذائقہ  
سجھی : حسب ضرورت

ترکیب: پیالے میں گوشت، دہی، سوفن پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، زیرہ، لونگ، ثابت سیاہ مرچیں، ادراک لہسن پیسٹ، سبز الائچی، بڑی الائچی اور بادیان کے پھول ڈال کر اچھی طرح کس کر لیں۔ دہی میں سجھی گرم کر کے گوشت اور پیاز ڈال کر فرانی کریں۔ سنہری ہو جائے تو مصالحے کا آمیزہ اور نمک شامل کر کے بھون لیں۔ حسب ضرورت پانی ڈال کر درمیانی آج پر ڈھک کر پکائیں۔ گوشت گل جائے تو چادل ڈال کر اتنا پانی ڈالیں کہ چادل اس میں ہی پک جائے۔ چادلوں کا پانی خشک ہو جائے تو زر درنگ اور براؤن پیاز ڈال کر 15-20 منٹ ہلکی آج پر دم پر رکھ دیں۔ کس کر کے سرونگ ڈش میں نکال کر سلاد اور رستے کے ساتھ گرم گرم سرور کریں۔

### بیف قیمہ ہری مرچیں

ضروری اشیاء:

بیف قیمہ : آدھا کلو (موٹا)  
پیاز (سلاکس کاٹ لیں) : دو عدد  
آئل : پون کپ  
لہسن، ادراک پیسٹ : ایک کھانے کا چمچ  
ہلدی پاؤڈر : آدھا چائے کا چمچ  
گرم مصالحہ (کٹا ہوا) : ایک چائے کا چمچ

نمک : حسب ذائقہ  
دہی : ایک کپ  
ہری مرچیں (چھوٹی) : آدھا کپ

ترکیب: سوس پین میں کوئنگ آئل گرم کر کے پیاز ڈال کر فرانی کریں پیاز سنہری ہو جائے تو قیمہ، لہسن، ادراک پیسٹ، نمک اور ہلدی پاؤڈر ڈال کر قیمہ بھون لیں۔ قیمے کا پانی خشک ہو جائے تو دہی ڈال کر ڈھک کر ہلکی آج پر پکائیں۔ دہی کا پانی خشک ہو جائے تو مصالحہ بھون لیں۔

ہری مرچیں اور کٹا ہوا گرم مصالحہ ڈال کر دم پر رکھیں۔ مزیدار بیف قیمہ ہری مرچیں تیار ہے۔ سرونگ ڈش میں نکال کر چپانی کے ساتھ سرور کریں۔

### آلو کی بھجیا

اجزاء:

آلو : آدھا کلو  
لہسن (ہارنیک) : چار جوے  
(کٹے ہوئے)

ثابت سفید زیرہ : ایک چائے کا چمچ  
سوکھی لمبی لال : آٹھ عدد  
مرچیں

پسی ہوئی ہلدی : آدھا چائے کا چمچ  
سوکھی ہوئی کھٹائی : چار عدد  
نمک : حسب ذائقہ

سرسوں کا تیل : ایک پیالی

ترکیب: کڑا ہی میں سرسوں کا تیل گرم کر کے لہسن سنہری کریں، پھر آلو اور نمک ملا کر ہلکی آج پر آلوؤں کے 1/2 گل جانے تک پکائیں۔ اس میں باقی اجزاء ڈالیں اور دم پر رکھ دیں۔

### چنے کی دال گوشت

اجزاء:

بکرے کی بوٹیاں : آدھا کلو

چنے کی دال (املی ہوئی) : ایک پیالی  
پیاز (باریک کٹی ہوئی) : دو عدد  
پسا ہوا لہسن ادراک : ایک کھانے کا چمچ  
پسی ہوئی ہلدی : ایک کھانے کا چمچ  
پسی ہوئی لال مرچ : ایک کھانے کا چمچ  
پسا ہوا گرم مصالحہ : ایک کھانے کا چمچ  
بھجنی اور پسی دار چینی : ایک چائے کا چمچ  
لیموں کا رس : ایک کھانے کا چمچ  
گرم پانی : چار پیالی  
نمک : حسب ذائقہ  
تیل : ایک پیالی

پودینہ، ہری مرچیں، لیموں کا رس، ادراک چمڑکنے کے لیے

ترکیب: دہی میں بوٹیاں، 1/2 پانی، پیاز، لال مرچ، ہلدی، لہسن ادراک اور نمک ملا کر پکائیں۔ پانی خشک ہو جائے تو اس میں دال اور باقی پانی شامل کر کے دال اور گوشت کھجان ہونے تک پکائیں۔ اس میں باقی اجزاء ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ مزیدار دال گوشت پودینہ، ہری مرچیں، لیموں کا رس اور ادراک ڈال کر پیش کریں۔

### پودینے کی چٹنی

ضروری اشیاء:

پودینہ : ایک گٹھی  
ہرا دھنیا : آدھی گٹھی  
ہری مرچیں : دس عدد  
انار دانہ : پانچ چائے کے چمچ  
لہسن کے جوے : چار عدد  
سفید زیرہ : ایک چائے کا چمچ  
نمک : حسب ذائقہ

ترکیب: پودینہ اور ہرا دھنیا توڑ کر دھولیں، انار دانہ صاف کر کے بھگو دیں، سفید زیرہ، لہسن، ہری مرچیں،

## سنگھار

ہے۔ اس طرح آپ خزاں میں بہار، پت جھڑ میں گلاب نظر آئیں گی۔

### مڈ ماسک

اس میں چکنائی، مٹی اور مصفاہ جڑا شامل ہوتے ہیں یہ جلد کو خشک کرتی ہے۔ چکنی جلد کے لیے مفید ہے۔ سیاہ دانے بھی صاف کرتی ہے۔ مڈ ماسک کے استعمال کے بعد جلد صاف ستھری اور کندن کی طرح نکھری نکھری نظر آتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شروع میں مڈ ماسک کے استعمال کے بعد آپ کی جلد پر کچھ دھبے نظر آئیں۔ پریشان نہ ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ مڈ نے جلد کی گہرائی میں موجود کثافت کو باہر نکال لیا۔ اس لیے اس کا باقاعدہ استعمال اہم ہے اس سے جلد کے عضلات مستحکم ہوتے ہیں۔ یہ ادھیڑ عمر جلد کے لیے زیادہ موثر اور مفید ہے کیوں کہ عمر بڑھنے کے ساتھ جلد کی رونق ختم ہونے لگتی ہے وہ اس مڈ ماسک سے بحال ہو جاتی ہے۔

### کھیرے کا ماسک

کھیرا چہرے کے لیے بہترین ہے۔ کھیرے کا ماسک لگانے کے لیے کھیرے کے پتلے پتلے گول تیلے کاٹ کر پورے چہرے پر لگائیں۔ چہرے پر کھیرا لگانے سے قبل ان پر تھوڑا سا بے بی آئل لگائیں۔

### اسٹریپیری کا ماسک

اسٹریپیری اگرچہ ہمارے ملک میں بہت کم ملتی ہے لیکن جہاں ملتی ہے وہاں کی خواتین کے لیے یہ

چہرے کی خوب صورتی اور تازگی کو تادیر برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا بھرپور خیال رکھا جائے، وقتاً فوقتاً چہرے کی کلیئرنگ کرتے رہنا چاہیے۔ آج ہم آپ کو چند آزمودہ گھریلو ماسک بنانا بتا رہے ہیں جن کے استعمال سے آپ کی جلد فریش اور تازگی سے بھرپور ہو جائے گی۔ ماسک کے ہفتے پندرہ دن کے استعمال سے چہرے پر ملائمت اور چمک پیدا ہوتی ہے۔

چہرے کو گتھتہ کرنے کا ماسک، مڈ ماسک، کھیرے کا ماسک، اسٹریپیری کا ماسک، اناس کا ماسک، انڈے کی سفیدی کا ماسک، وہی اور بیسن کا ماسک۔

### مختلف اقسام کے ماسک

#### چہرے کو گتھتہ کرنے کا ماسک

چہرہ اچھی طرح دھو کر بھاپ دیں پھر نرم توپے سے پونچھ کر سکھائیے پھر اس پر تھوڑا سا چغندر کارس ملیے اور دن منٹ تک کے لیے سوکھنے دیجیے بعد ازاں اس پر لیموں کارس روئی سے لگائیے اور اسے بھی دن منٹ سوکھنے دیں۔ پھر چہرے پر تازہ بالائی کا مساج کریں اس سے بھی اپنا چہرہ صاف کریں اور خوب سیل کی بتیاں مل مل کر اتارے۔ اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھو ڈالے اس سے آپ کی جلد حد درجہ صاف اور چمکدار ہو جائے گی۔ بس اب اس پر ہلکا سا میک اپ کرنے کی ضرورت

چینی، سرخ مرچ پاؤڈر، گرم مصالحہ پاؤڈر، خربوزے کے بیج اور نمک شامل کر کے دھبی آج پر پکا میں، چینی کا پانی خشک ہو جائے تو سرکہ شامل کر کے پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں اور چھچھلائی رہیں جب چینی گاڑھی ہو جائے تو چولہا بند کر دیں۔ چینی ٹھنڈی کر کے صاف ستھرے مرجان میں محفوظ کر لیں۔ سب کی مزیدار چینی مختلف کھانوں کے ساتھ کھائیں۔

### کسٹرز فلڈ کریم پھینسن

اجزاء:

- نصف پیسٹری کا آٹا : ایک پاؤ
- کسٹرز کیسٹر پاؤڈر : آدھی پیالی
- تازہ دودھ : آدھا گلو + ایک پیالی
- چینی : آدھی پیالی
- تازہ کریم : ایک پیالی
- بادام، پستے (باریک) : آدھی پیالی

ترکیب: آٹے کو بلیس اور اسے کون کے سائے پر پھینس۔ اس عمل کو دہراتے ہوئے 6 کوئین تیار کریں۔ انہیں بیکنگ ٹرے میں رکھیں اور پہلے سے گرم اودن میں 180 سینٹی گریڈ پر 15 منٹ پکا کر نکال لیں۔ تھوڑا ٹھنڈا ہو جائے تو کون کو سانچے سے علیحدہ کر لیں۔ ایک پیالی دودھ میں کسٹرز پاؤڈر گھولیں۔ باقی دودھ دھبی میں ڈال کر لہائیں، اس میں چینی شامل کریں، چینی حل ہو جائے تو چھچھلاتے ہوئے تھوڑا تھوڑا کسٹرز پیسٹ ملائیں، آمیزہ گاڑھا ہونے لگے تو کریم ملا کر پھینس، پھر ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ کسٹرز کے آمیزے کو تھچے کی مدد سے کونوں میں بھریں اور بادام اور پستے چھڑک کر پیش کریں۔

☆.....

پودینہ، ہرا دھنیا اور انار دانہ نمک تمام اشیاء ملا کر بلینڈر میں ڈال کر بلینڈ کر لیں یا سل میں پھینس لیں۔ چینی پینے کے بعد نمک، مرچ پکھ لیں اگر کچھ کی لگے تو حسب خواہش شامل کر لیں۔ لیجے پودینے کی مزیدار چینی تیار ہے۔ اسے آپ ششے کے صاف اور خشک جار میں محفوظ کر لیں۔ اسے بیسنی روٹی، آلو بھرے پرائٹھے اور وال بھرے پرائٹھے کے ساتھ کھائیں، خوب مزہ دے گی۔ اس کے علاوہ وال، چاول، بریانی اور پلاؤ کے ساتھ کھانے کا بھی اپنا مزہ ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اسے وہی میں ڈال کر رائی بنا کر بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ ہر صورت میں مزہ دے گی اور ہاضمہ درست رکھنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ ساتھ ہی آپ کے دسترخوان کی شان بھی بڑھائے گی۔

### سیب کی چٹنی

ضروری اشیاء:

- کچے سیب : آدھا گلو
- پیاز : چار عدد
- لہسن، ادراک پیسٹ : ایک چائے کا چمچ
- چینی : ایک کپ
- سرخ مرچ پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ
- گرم مصالحہ : ایک چائے کا چمچ
- سرکہ : دو چائے کے تھچے
- خربوزے کے بیج : ڈیڑھ کھانے کا چمچ (چھلے ہوئے)

نمک : حسب ذائقہ

ترکیب: سب سے پہلے سیب دھو کر چھیل لیں اور کدو کش کر لیں یا بالیک کاٹ لیں۔ پیاز بھی بالیک کاٹ لیں، ایک دھبھی میں سیب، پیاز اور ادراک، لہسن ڈال کر پکائیں۔ ساتھ ہی اتنا پانی ڈالیں کہ تمام اشیاء اچھی طرح گل جائیں۔ پانی خشک ہو جائے تو

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## پہلے پاکستان سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریویو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، ہارل کوالٹی، کمپیوٹر کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کماتے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں، ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں [www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

[fb.com/paksociety](http://fb.com/paksociety)

[twitter.com/paksociety](http://twitter.com/paksociety)

کے چہرے پر لگانے سے چہرے کی رنگت نکھر جاتی ہے۔

میدہ اور دودھ کا ماسک

میدہ اور دودھ کا ماسک روزانہ چہرے پر لگانے سے چہرے کی میل اور کثافت دور ہو جاتی ہے اور رنگت صاف اور خوب صورت ہو جاتی ہے۔

کیلے کا ماسک

کیلے کے گودے کو اچھی طرح غسل کر اس میں تھوڑا سا دودھ یا بالائی ملا کر چہرے پر لگانے سے سائٹوں کی رنگت صاف اور نکھر جاتی ہے۔

جلد کو تروتازہ رکھنے کا طریقہ

☆ ان طریقوں پر عمل کرنے سے ہر قسم کی جلد تروتازہ رہتی ہے۔

☆ صبح سویرے خالی پیٹ ایک گلاس پانی میں ایک چمچ شہد ڈال کر پیئیں۔

☆ صابن بالکل استعمال نہ کریں۔

☆ سب سے پہلے اپنے چہرے پر نیم گرم پانی اور فیس واش کے کچرے سے مساج کریں پھر ٹھنڈے پانی سے دھو لیں۔

☆ بیسن یا کریم اپنی جلد کے مطابق استعمال کریں۔

☆ اپنا تولیہ الگ رکھیں کسی اور کا استعمال نہ کریں۔

☆ دن میں دو دفعہ چہرہ دھو لیں۔

☆ میک اپ اتارنے کے بعد کلینزنگ کریں۔

☆ ایسا کاسمیٹک استعمال نہ کریں جو آپ کی جلد خراب کرتا ہو۔

نیو وکی ڈیجیٹل لائبریری اینڈ فریمنگ پوائنٹ

سازندہ سسٹم اور جلد سازی کی سہولت موجود۔

ڈیجیٹل لائبریری کی خرید و فروخت کی جگہ

خوش خبری ہے کہ اسٹریبری کا ماسک کھیرے اور ہر قسم کے کاسمیٹکس ماسک سے زیادہ مفید ہوتا ہے۔

اسٹریبری کا ماسک لگانے کے لیے اس کا گودا پورے چہرے پر لگایا جاتا ہے۔

انٹاس کا ماسک

انٹاس کھانے ہی میں خوش ذائقہ نہیں ہوتا، اس کے اور بھی بے شمار فوائد ہیں۔ ان میں سے ایک اہم

فائدہ جس کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اس کا رس تھکی ہوئی پڑ مردہ جلد کو شاداب و تازگی بخشنے میں جادوئی اثر رکھتا ہے۔ انٹاس کا رس ماسک

کے طور پر چہرے پر لگائیں اور پھر کمال دیکھیں۔

انڈے کی سفیدی کا ماسک

گھر میں انڈے ہر وقت موجود رہتے ہیں ناشتے کے لیے آلیٹ بناتے ہوئے تھوڑی سی سفیدی انڈوں میں سے الگ نکال کر رکھ دیجیے اور

فرصت ملتے ہی اس سفیدی کو پھینٹ کر چہرے پر لگائیں اور دس منٹ بعد ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھو لیں۔ آپ خود دیکھیں گی کہ آپ کا چہرہ نکھر گیا ہے۔

دہی اور بیسن کا ماسک

دہی اور بیسن ہر گھر کے بادرچی خانے میں ہر وقت موجود ہوتا ہے تھوڑا سا دہی لے کر اس میں

ایک کھانے کا چمچ بیسن ملا لیں۔ اس میں چاہیں تو لیموں کا رس بھی شامل کر سکتی ہیں۔ اب اس

آمیڑے کو دس منٹ تک منہ پر لگائیں اور پھر چہرہ ٹھنڈے پانی سے دھو لیں اگر جلد بد رنگ ہو جائے تو

لیموں اور زیتون کا تیل ملا کر صبح و شام اس سے چہرے کا مساج کریں۔ یہ عمل بھی جلد کے لیے بہتر

ہے۔

ٹماٹر کا ماسک

ٹماٹر کے گودے کو لیموں کے رس میں شامل کر